رتّی گلی

(وادیٔ کاغان اور آزاد کشمیر)

مستنصر حسین تارڑ

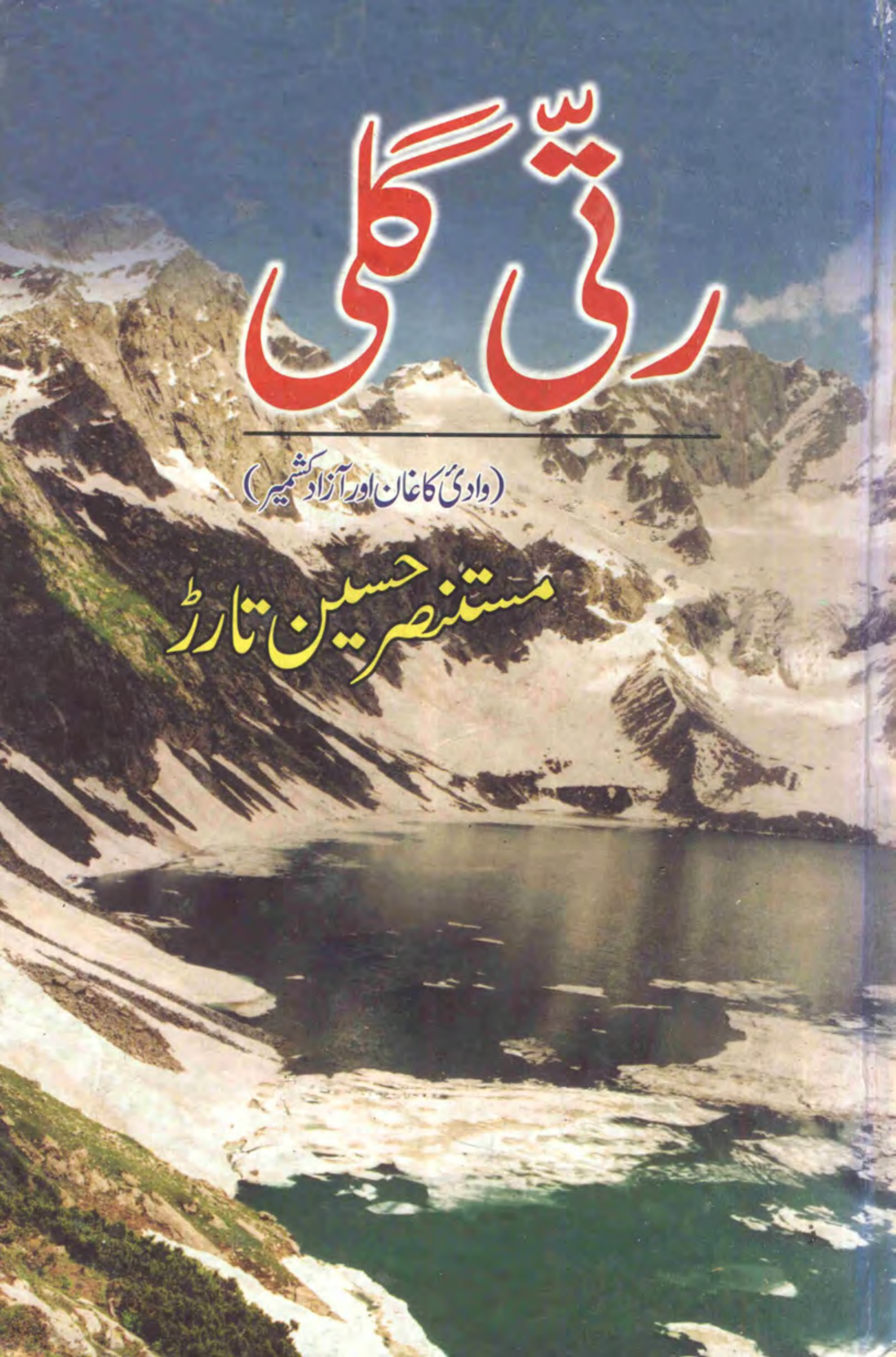

فہرست

رتّی گلی 1956ء

-1	''وادیٔ کشن گنگا مُہم ۔ گورنمنٹ کالج لاہور''	7
-2	''ناران... اتنا ہرا، اتنا خاموش، اتنا پوشیدہ''	20
-3	''ڈاک بنگلہ بوڑاوائی.. گورا لوگ کی ڈائری 1920ء''	25
-4	''میری کوہ نوردی کا سب سے پہلا قدم اور ایک وادیٔ نامعلوم میں پہلی رات''	29
-5	''ہم ایک جنت گم گشتہ میں اُترتے ہیں ایک روسٹ دُنبے کے لیے''	39
-6	''رتی گلی گلیشیر پر معلق پتھریلے جھونپڑے میں رات اور برف کے بھیڑیئے''	48
-7	''رتی گلی چوٹی ہپ ہپ ہُرے اور اس کے پار جھیل میں تیرتا برفانی راج ہنس''	52

رتّی گلی 2003ء

-8	''سینتالیس برس بعد... رتّی گلی کی جانب پھر سے جاتا ہوں''	61

شاران کاغان 1963ء

-9	''جب دل ہی ٹوٹ گیا اور قصور کی بسنت''	68
-10	''شاران ۔ شاران.. چمنِ صدرنگ''	71
-11	''کہیں بلند پہاڑوں کی رات میں ایک سرد موت کی قربت''	78

رتّی گلی 2003ء

-12	''گلوں میں رنگ بھرتی کُنہار کنارے ناران کی رات میں''	88
-13	''جھیل سیف الملوک... جسے تماش بینوں نے طوائف بنا دیا ہے''	96
-14	''سوچ کی سِلور ٹراؤٹ ۔ بے رُوح باٹا کنڈی اور بوڑاوائی کا ریسٹ ہاؤس''	101
-15	''عجیب سی بستی، بیسل.. جہاں ابھی برف پگھلی نہ تھی''	111

-16 ''جھیل لُولُوسر..جس پر سورج کی زردی بجھی رہ گئی اور پھر رات چاندنی'' 114
-17 ''جھیل کی سویر میں ہمارے خیمے بادلوں میں تیرتے پھرتے تھے'' 123
-18 ''بیسل سے ڈانلڈ ڈک تک...دریا تو آئیں گے'' 128
-19 ''قافلہ ہائے رنگ و بو..گھوڑوں کی وادی میں'' 139
-20 ''جھیل دُودی پَت..جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی'' 145
-21 ''تارڑ صاحب ایک بُری خبر ہے..اور فُل بے دید لوگ'' 151
-22 ''ابدیت کے شعلے کے سامنے فنا کا ٹمٹماتا چراغ..میں تھا'' 159
-23 ''اور کون ہے آئینوں میں..بس تو ہی تو ہے'' 162
-24 ''قافلۂ اسپ سواراں در کوہستانِ کاغان'' 164
-25 ''چھ گھوڑے۔ایک ٹٹو چار کوہ نورد اور درّہ سرال کی چڑھائی'' 173
-26 ''سرال ٹاپ پر آنسو جھیل..ہم آنسو بہاتے ہیں'' 182
-27 ''جھیل سرال..گنبد افلاک تلے ایک پگھلا ہوا نیلم'' 184
-28 ''جھیل سرال کے پانی اُمڈ کر..میرے گھوڑے کے قدموں میں آ گئے'' 193
-29 ''سرال کنارے گروچو مارکس سے ملاقات'' 196
-30 ''جھیل کی سٹیج پر ''سوان لیک'' بیلے پرفارم ہوتا ہے'' 200
-31 ''خدا حافظ سرال اور ڈارلنگ گروچو'' 204
-32 ''پہاڑوں کے جام میں سرال کی نیلی شراب'' 209
-33 ''درّہ نوری ناڑ ٹاپ پر سے میں اور میرا گھوڑا لڑھکتے ہیں'' 214
-34 ''تارڑ جھوٹ بہت بولتا ہے...سَر'' 218
-35 ''جل کھڈ روڈ پر..کافر تتلیاں پکڑتا ہے اور مسلمان جنت کماتا ہے'' 223
-36 ''درّہ دواریاں کے دامن میں اِک شہرِ زرد'' 227
-37 ''رتّی گلی کا منظر کُھلا..اور خان گھوڑا قبر'' 230
-38 ''رتّی گلی جھیل نظر آنے پر میں چیختا ہوں ''میں سچ کہتا تھا'' 235
-39 ''رتّی گلی گمشدہ'' 241
-40 ''یہاں سے گھوڑا گرے گا..'' 249

وادیٔ کشن گنگا مہم۔ گورنمنٹ کالج لاہور

میں نے پچھلی شب رتّی گلی کو خواب میں دیکھا..

رتّی گلی جھیل میں تیرتے راج ہنسوں کو خواب میں دیکھا..

سفید راج ہنس خواب در خواب تیرتے چلے جاتے تھے..اور میری نیند بھری آنکھیں کشتیوں کی مانند اُن کے پیچھے تیرتی چلی جاتی تھیں..

بلند درّے کی گھنی دُھند میں برفوں میں دھنسے ٹھٹھرتے کانپتے..سردی سے ٹھٹھرتے اور لذت سے کانپتے نوجوان بدن تھے..کانوں پر مفلر لپیٹے اُونچی بوٹوں اور سویٹروں میں، کوئی ہیٹ اوڑھے، کوئی پی کیپ جمائے، کوئی ننگے سر..کبھی دُھند میں سے دکھائی دینے لگتے اور کبھی اُس میں مدھم ہو جاتے..ایک آئس ایکس پر کُہنیاں جمائے..مسکراتے اور ہنستے ہوئے نوجوان بدن تیرہ ہزار چھ سو فٹ بلند رتّی گلی کے درّے پر آج سے سینتالیس برس پیشتر ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر اُترواتے تھے..اور ان میں سے میں وہ تھا جو گھٹنوں بل برف پر بیٹھا آئس ایکس پر کُہنیاں جمائے کیمرے کی جانب تکتا تھا۔

آج سے سینتالیس برس پیشتر...

ہاں میں نے پچھلی شب شاہ گوری کو بھی خواب میں دیکھا تھا..

لیکن شاہ گوری کے خنک بوسوں کو میں نے اپنے لبوں پر تب محسوس کیا تھا جب وقت نے میرے لب پژمردہ کر دیئے تھے۔ نوجوانی کا ہلکا ہلکا بخار اور بے وجہ اداسی بہت پیچھے رہ گئے تھے، میرے بال سفید ہو رہے تھے اور زمانے نے مجھے آ لیا تھا۔ تب میں نے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا..

لیکن رتّی گلی کو تو میں پچھلے سینتالیس برس سے خواب میں دیکھ رہا تھا۔

اتنے بے شمار برس گذرنے سے وہ ماضی کے دھندلکوں میں دھیرے دھیرے مدھم ہو چکی تھی اور یادداشت کا ایک وہم، ایک گمان ہوگئی تھی.. بھری دوپہر میں ننگے پاؤں کوٹھے پر آنے والی ایک لڑکی کی طرح.. میں اب وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جھیل میں تیرتے برفیلے راج ہنس اور لڑکی کے ننگے پاؤں دراصل وجود میں تھے بھی یا نہیں.. شاید یہ میرے قصے بُننے والے ذہن کی کارستانی ہیں۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا..

رتّی گلی درّے کے پار اُترتے، سُرخ پھولوں سے اٹا اور اُلجھا ہوا.. میرے بوٹوں تلے قالین ہوتا.. ایسا قالین ہوتا جس پر سرخ کے سوا زرد پھولوں کی سجاوٹیں تھیں اور ہری کچور گھاس کی بناوٹیں تھیں اور اُس رنگ رنگ کے شوخ وشنگ نرم قالین کے درمیان پگھلی ہوئی چاندی کی جو ایک ندی دُودھ کی مانند گھنے سبزے کی گہرائی میں اُترتی تھی تو کیا ان سب کا وجود تھا یا انہیں محض نصف صدی کے قریب گذر گئے مہ وسال میں میرے ذہن کے خبطی انتشار نے تخلیق کر لیا تھا..

ہاں یہ ممکن ہے کہ پھولوں کی سجاوٹیں اور ہری گھاس کی بناوٹیں اور اُن میں اُترتی پگھلی ہوئی چاندی میرے ذہنی فتور کا کرشمہ نہ ہوں اُن کا وجود ہو لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں کہ رتّی گلی کے پار اُترتے ہوئے وادی کے پار نیلی چٹانوں کی جو بلند دیواریں کھڑی تھیں اور ان کے اور میرے درمیان ایک پرندے کی پرواز کا کئی کلومیٹر فاصلہ حائل تھا تو اس چٹانی آغوش جو ایک جھیل نظر آرہی تھی جس پر دُھند چھائی ہوئی تھی اور اُس کے نیلگوں فریب کے پانیوں میں برف کے تودے تیرتے تھے اور اُن میں سے ایک تودہ تو برف سے تراشا ہوا ایک راج ہنس دکھائی دیتا تھا.. اور جب وہ آہستگی اور سستی سے تیرتا چٹانوں میں سے جھیل کے پانیوں پر گرتی ایک آبشار کی دھار تلے آ جاتا تھا تو گرتے پانیوں کے زور سے ڈولتا ذرا دور نکل جاتا تھا.. تو کم از کم یہ منظر تو ممکن نہیں اسے تو میں نے ہی اپنی قصے گھڑنے کی عادت سے مجبور خود ہی تخلیق کر لیا ہوگا.. کہ ایسے منظر تو کسی آنکھ نے نہیں دیکھے.. تو میں نے کیسے دیکھ لیے.. نہیں دیکھے ناں.. خود ہی گھڑ لئے ہیں.. ان سینتالیس برسوں میں مجھ پہ جو گذری تھی، غم روزگار اور محبتوں اور اذیتوں کے دکھ اور سکھ میں سے گذرتے ہوئے تو میں نے ان کو پار کرنے کے لیے اسی ذہنی اختراع کی کشتی کا سہارا لیا تھا..

اگرچہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جائے.. کسی حتمی نتیجے پر بہرصورت پہنچا جائے۔ یہ طے کیا جائے کہ کیا موجود تھا اور کیا ناموجود.. لیکن موجود اور ناموجود کی

یہی ازلی خلش ہی تو ہے جو انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ جاننا چاہتا ہے.. وہ ایک غیر جانبدار حالت میں نہیں رہ سکتا.. وہ غور کر کے کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں ہے۔

بے شک وہ مہاتما بدھ کی مانند گیا کے جنگلوں میں گیان دھیان میں گم ناموجود کو دریافت کرتا ہے یا میرے بابا کی طرح غار حرا میں پوشیدہ وہ اس بھید کو پالیتا ہے کہ وہ موجود ہے..

اس خلش کو مٹانے کے لیے.. اس چِتا کا اپائے کرنے کے لیے.. یہ جو کُھد بُد ہے..

بے یقینی ہے اسے مٹانے کے لیے کہ وہ منظر موجود میں تھے یا نہیں بندہ کیا کرے؟..

بس وہی کرے جو میں نے کیا..

یہی کرے کہ سینتالیس برس بعد پھر سے اپنا رُک سیک اور خیمہ اُٹھائے.. لیکن اس عمر میں اور اتنے عرصے کے بعد کب یہ مجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے تو کسی پورٹر سے اٹھوائے اور رتّی گلی کو جائے اور ذرا چیک کرے کہ.. یہ محض ایک اختراع تھی۔ تخیل کی کرشمہ سازی تھی یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے.. ذرا پتہ تو کرے.. کہ اس میں قصہ کتنا ہے اور حقیقت کا کیا تناسب ہے..

موجود ہے یا ناموجود۔

چنانچہ میں نے اپنے بوسیدہ رُک سیک میں جو شاہ گوری، نانگا پربت اور سنولیک کے موسموں کو سہہ چکا تھا، برسوں کا آزمودہ اور نرم پروں والا سلیپنگ بیگ پیک کیا اور اب رتّی گلی کی جانب جاتا تھا۔

دوبارہ جاتا تھا..

سینتالیس برس بعد پھر جاتا تھا..

یہ بھی اُنہی دنوں کا قصہ ہے جب ہر درخت سرسبز دکھائی دیتا ہے..

اور جب ہر بطخ پر راج ہنس کا گمان ہوتا ہے..

یہ اُنہی دنوں کی داستان ہے..

آج اور اُس کل کے درمیان جو برس حائل ہیں اُن میں سے کچھ باتیں ہیں جو بھولتی جاتی ہیں، کچھ بھول گئی ہیں اور کچھ یقین اور واہموں کے درمیان جو خلا ہے اُس میں آسیب زدہ روحوں کی مانند بھٹکتی پھرتی ہیں۔ میرے بہت سے سفرناموں میں کہیں نہ کہیں رتّی گلی کی جھیلیں

نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ پانی کے وہ طلسمی جزیرے جن پر دُھند اترتی رہتی تھی اور جن میں راج ہنس تیرتے تھے جنہیں میں نے رتّی گلی کے پار اُترتے ہوئے دیکھا تھا.. کہیں نہ کہیں میری سفری تحریروں میں اُن کی یاد کی مٹی تصویر ظاہر ہوتی رہتی ہے لیکن میں نے کبھی بھی اپنی کوہ نوردی کے اس پہلے بخار کو، پہلے سانحے یا تجربے کو بیان نہیں کیا۔

جیسے میں نے اپنے پہلے بوسے کو کبھی بیان نہیں کیا۔

اور اب اس لحہ موجود میں جب کہ میں ساٹھویں برس کی سیڑھی سے دو چار ہاتھ اوپر جا چکا ہوں اور لبِ بام بھی بس دو چار ہاتھ ہی رہ گیا ہے اور کون جانے کہ کس لمحے وہ بام آ جائے جب انسان سیڑھی سے واپس نہیں آتا بلکہ اوپر چلا جاتا ہے تو میں اس لحہ موجود میں اپنی آوارگی کی ابتداء، اس کی پیدائش کے اولین تجربے کو محض اس لیے بیان کرنا چاہ رہا ہوں کہ میں ابھی کچھ روز پیشتر پھر اُنہی راستوں پر چلا تھا.. میری حیات کی بے آب و گیاہ وسعت میں جن پانی کے جزیروں کے خواب سراب ہوتے تھے اُن تک پہنچنے کی سعی کی تھی۔

صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہ موجود ہیں یا نا موجود..

تو میں گردشِ ایام کو صرف سینتالیس برس پیچھے لوٹاتا ہوں۔

آپ بھی میرے ہمراہ لوٹ چلیے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے برآمدے میں..

اور یہ 1956ء کا برس ہے..

کالج کے اکلوتے نوٹس بورڈ پر.. جس کے آگے ایک آہنی تار سے بُنی ہوئی جالی ہے تاکہ طلباء خوش ہو کر یا طیش میں آ کر کسی نوٹس کو پھاڑ نہ دیں اُس پر آج کے پیمانوں کے مطابق ایک نہایت دقیانوسی ٹائپ رائٹر کے بجھے بجھے شکستہ آزردہ ٹائپ میں ایک مختصر سا نوٹس.. آویزاں ہے.. اور یاد رہے کہ ہم ابھی ابھی صفدر میر زینو کی انگریزی کلاس کو بھگت کر آئے ہیں۔ وہی میر صاحب جن کی گمبھیر آواز تقریباً نو برس بعد جنگِ ستمبر کے موقع پر اپنی نظم "چلو واہگے کی سرحد پر" میں ہر سُو گونجی تھی اُسی آواز میں میر صاحب شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کو ہمیں پڑھاتے ہوئے اتنے کھو گئے تھے، اپنے آپ کو فراموش کر کے کسی کردار میں اتنے غرق ہو گئے تھے، ان کی رنگت متغیر ہو گئی

تھی اور بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور اُس کردار کے مکالمے بہ آوازِ بلند پکارتے ایک بے خودی کی حالت میں کلاس رُوم چھوڑ کر برآمدے میں نکل گئے تھے اور پھر پوری کلاس بڑی مشکل سے اُنہیں گھیر گھار کر واپس کلاس روم میں لائی تھی تو اس تگ و دو کے فوراً بعد جب ہم نوٹس بورڈ کے قریب سے گذرے اور حسبِ عادت ایک اُچٹتی ہوئی نظر اُس پر ڈالی کیونکہ اُس نوٹس بورڈ پر جن نالائق طلباء کو جرمانے ہوتے تھے، اُن کی رقم درج ہوتی تھی.. جو کسی امتحان میں فیل ہوتے تھے، اُن کے نام لکھے ہوتے تھے اور کبھی مجھ ایسوں کو یہ رِفعت نصیب ہوتی تھی کہ سرزنش کرنے کی خاطر پرنسپل صاحب کے دفتر میں حاضری کے حکم میں جن طلباء کے نام ہوتے تھے.. اُن میں میرا نام بھی ہوتا تھا تو وہیں ایک آج کے معیار کے مطابق دقیانوسی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ شدہ.. بجھے بجھے ٹائپ میں ایک مختصر سا نوٹس آویزاں تھا..

"وادی کشن گنگا مُہم"

"گورنمنٹ کالج کی ہائکنگ اور مونٹینیرنگ کلب کشمیر کی وادی کشن گنگا جانے کے لیے ایک مُہم ترتیب دے رہی ہے جو ایبٹ آباد اور وادی کاغان کے راستے رتّی گلی چوٹی کو تسخیر کر کے کشن گنگا کی وادی میں اُترے گی... ایسے رضا کار درخواست دے سکتے ہیں جو جسمانی طور پر سو فیصد فِٹ ہوں، خطرات سے نہ گھبراتے ہوں اور جن کے اندر مُہم جوئی کا مادہ ہو.. براہ کرم جمنیزیم میں فزیکل انسٹرکٹر خواجہ صاحب سے رابطہ کیجیے۔"

مندرجہ بالا نوٹس میں خطرات سے نہ گھبرانے والی شرط غیر ضروری تھی کیونکہ جن خواجہ صاحب سے رابطہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا، اُن سے صرف وہی لوگ رابطہ کرنے کی جرأت کر سکتے تھے جو خطرات سے نہ گھبراتے ہوں.. اب یہ جو خواجہ صاحب تھے، نہایت تنومند اور کم از کم اُس عمر میں ہمیں نہایت وسیع و عریض دکھائی دیتے تھے۔ چونکہ ہم نے ابھی حال ہی میں سولہویں سال سے سترہویں میں قدم رکھا تھا، اس لیے وہ چالیس برس کے ہونے کے باعث ہمیں نہایت عمر رسیدہ اور قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے لگتے تھے.. گورنمنٹ کالج میں یہ اصول تھا کہ جہاں کہیں خواجہ صاحب نظر آ جائیں تو فوری طور پر غائب ہو جاؤ.. اُن کے راستے سے اِدھر اُدھر ہو کر روپوش ہو جاؤ،

اُنہیں دکھائی نہ دو کیونکہ جو کوئی بھی معصوم طالب علم اُن کے ہتھے چڑھ جاتا تھا وہ اُس کی باڈی بلڈنگ کے لیے اس سے ڈنڈ بیٹھکیں لگواتے تھے اور پھر اوول گراؤنڈ کے چکر لگواتے تھے اور لگواتے ہی چلے جاتے تھے.....

ان تمام خطرات کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اگلے روز خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا.. اگرچہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ وادیٔ کشن گنگا کس کائنات میں واقع ہے اور یہ رتی گلی کیا بلا ہے لیکن میرے اندر وہ جرثومہ کلبلانے لگا جو تب سے اب تک یعنی سینتالیس برس گذرنے کے باوجود کلبلاتا ہی چلا جاتا ہے اور مجھے بے اختیار کرتا ہے کہ جو نہیں جانتے اُسے جانو.. جہاں جانے کا کچھ جواز نہ ہو بس وہیں جاؤ.. پتہ تو کرو کہ وہاں کیا ہے..

وہ جو کلاسیک فقرہ ہے پہاڑوں کے بارے میں کہ آپ پہاڑوں پر کیوں جاتے ہیں اور جواب آتا ہے کہ.. کیونکہ وہ وہاں ہیں.. تو یہی میرا جواز تھا کہ یہ جو وادیٔ کشن گنگا ہے اور رتی گلی ہے جہاں بھی ہے.. اگر وہاں ہے تو وہاں جانا ہے..

اور میں تنہا رضا کار نہ تھا جو جمنیزیم میں خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ کچھ اور بھولے بھالے سرپھرے بھی تھے جو نہیں جانتے تھے کہ وہ کس اوکھلی میں سر دینے جا رہے ہیں، ان میں سے بیشتر مجھ سے سینئر تھے اور اُنہیں بھی ہر درخت سرسبز نظر آ رہا تھا اور ہر بطخ راج ہنس دکھائی دے رہی تھی اور وہ جوانی کے اسی اندھے پن میں گرفتار چلے آئے تھے۔

خواجہ صاحب نے ہم سب کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا اور پھر ایک نہایت بے شرمی کی بات کی ''لڑکو اپنے کپڑے اُتار دو۔''

اب وہ معصوم قسم کے زمانے تھے اور اُن دنوں اس قسم کی مخرب الاخلاق ''سٹرپ ٹیز'' کا چنداں رواج نہ تھا۔ چنانچہ ہم سب نے اپنی اپنی شلواروں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ مبادا خواجہ صاحب زبردستی پر اُتر آئیں.. اور جب اُنہوں نے گرج کر پھر حکم دیا کہ کپڑے اُتار دو تو صرف اُن دو لڑکوں نے جھجکتے ہوئے تعمیل کی جو مکھن زین کی پتلونیں پہنے ہوئے تھے اور اُن کے نیچے انڈرویئر پہنے ہوئے تھے جب کہ ہم تو نیچے کچھ بھی نہ پہنے ہوئے تھے.. خواجہ صاحب نے کرم کیا اور ہم شلوار والوں کو یہ رعایت دے دی کہ ہم صرف قمیصیں اُتار دیں اور اپنی شلواریں اُڑس کر گھٹنوں سے اوپر کر لیں جیسے سندھی کشتی لاکھڑی میں پہلوان حضرات کرتے ہیں..

پھر ہماری شناخت پریڈ ہوئی. خواجہ صاحب یہ جاننے کے آرزومند تھے کہ ہم میں سے کون کون کوہ نوردی کی صعوبتیں برداشت کرنے کا اہل ہے.. اُنہوں نے ہمیں خوب ٹھونک بجا کر چیک کیا اور ایسے نازک مقامات پر چیک کیا کہ ہم شرم کے مارے سُرخ ہو گئے۔ اس تفصیلی ٹھونکا ٹھنکائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ صاحب نے تمام رضا کاروں کو اس مُہم کے لیے اہل قرار دے دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُنہیں بالکل اُمید نہ تھی کہ گورنمنٹ کالج میں اتنے بیوقوف واقعی مہیا ہو جائیں گے جتنے کہ ہو گئے۔

مُہم کے لیے جسمانی تیاری کے لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ روزانہ اوول گراؤنڈ کے دس چکر لگاؤ، پھر فی الفور لارنس گارڈن جو اب مسلمان ہو کر باغ جناح کہلاتا ہے، وہاں پہنچو اور اُس کی پہاڑیوں پر کوہ پیمائی کی پریکٹس کرو.. چونکہ خواجہ صاحب اوول گراؤنڈ میں ہی رہ جاتے تھے ہمارے ساتھ لارنس گارڈن نہ جاتے تھے۔ اس لیے ہم وہاں پہنچ کر یا تو کسی شجر سایہ دار تلے استراحت فرمانے لگتے تھے اور اگر کسی کی جیب میں چار آٹھ آنے ہوتے تھے تو وہ خوش نصیب آئس کریم کھانے لگتے تھے..

ایک ہفتے کی ان شدید جسمانی آزمائشوں کے بعد خواجہ صاحب نے ہمیں ایک ٹائپ شدہ فہرست تھما دی جو اُن ''آلات'' کی تھی جو اس مُہم کے دوران درکار تھے.. اور یہ تمام کے تمام ''آلات'' ہمارے لیے تو یونانی زبان میں لکھے ہوئے تھے کہ ہم نے اس سے پیشتر اُن کے نام بھی نہ سن رکھے تھے۔ عجیب و غریب آلات تھے..

مثلاً.. ایک رُک سیک.. بھئی یہ کیا بلا ہے.. کس قسم کا سیک یعنی تھیلا ہے جو رُکتا ہے..

اور یہ آئس ایکس.. یہ کیا ہوتا ہے جناب.. ہم نے تو اپنے محلے میں برف فروخت کرنے والے کو دیکھا تھا جو ایک سُوئے سے برف کے ٹکڑے کر کے پاؤ پاؤ بیچتا ہے تو اس برف کو توڑنے کے لیے ایک کلہاڑا کیوں درکار ہے.. اور پھر ٹخنوں تک آنے والے فوجی بوٹ۔ موٹی اونی جرابیں۔ آرمی سویٹر۔ برساتی۔ گورکھا ہیٹ۔ دو کمبل۔ دستانے، مفلر، اونی بنیانیں۔ بُھنے ہوئے چنے اور ریوڑیاں۔ ایک لوٹا.. اور جانے کیا کیا۔

اور یہ الا بلا اور نا قابل فہم سامان کوہ نوردی کہاں سے دستیاب ہو گا؟

''لنڈا بازار سے..'' ہمیں بتایا گیا۔

میں اس لنڈا بازار سے کسی حد تک واقف تھا..

میری سب سے چھوٹی خالہ جان..اور مجھ سے عمر میں بس سات آٹھ برس بڑی ان زمانوں کے لحاظ سے نہایت فیشن ایبل اور اپ ٹو ڈیٹ تھیں.. یعنی اپنے اکلوتے بھائی سے چوری چھپے ہر جمعرات کو ریڈیو پر فلمی گانے سنتی تھیں اور اندرون شہر واقع اپنے سکول میں جو ڈرامے سٹیج کیے جاتے تھے، اُنہیں بھی چورے چھپے نہایت شوق سے دیکھتی تھیں..وہ اُن زمانوں میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھیں اور مجھے یاد ہے کہ وہ ایک بار مجھے بھی ساتھ لے گئیں اور جب میں نے اُن کی عزیز ترین سہیلی حسن آرا کو مونچھیں لگائے سٹیج پر ایک جنٹل مین کی اداکاری کرتے دیکھا تو اتنا خوش ہوا کہ کلکاریاں مارنے لگا کہ یہ میری خالہ حسن آرا ہیں۔ مونچھوں والی..اور میری خالص خالہ جان نے مجھے ڈانٹ کر چپ کرایا کہ آرام سے بیٹھو ورنہ آئندہ ساتھ لے کر نہیں آؤں گی اور وہ تھوڑی سی خوفزدہ بھی تھیں کہ کہیں یہ بچہ گھر پہنچ کر بھاجی سے میری رپورٹ نہ کردے..شاید یہ وہی زمانے تھے جب میرے اندر بھی اداکاری کرنے کا فتور بھرا گیا..

میں آج جو کچھ بھی ہوں شاید اس میں میری خالاؤں کا ہی عمل دخل ہے..چھوٹی خالہ جان مجھے اپنے سکول کے سٹیج پر چھٹی جماعت کی طالبات کے پیش کردہ ڈرامے دکھانے لے گئیں۔

اور بڑی خالہ جان کی قصہ گوئی ایسی تھی کہ میں مبہوت ہو کر انہیں سنتا رہتا۔

معاف کیجئے گا میں اپنی مرحوم خالہ جانوں کے تذکرے میں بہت دور نکل گیا تو واپس آتا ہوں۔

تو یہ جو چھوٹی خالہ جان تھیں وہ اکثر مجھے اپنے ہمراہ لنڈا بازار لے جایا کرتی تھیں۔

ابھی دوسری جنگ عظیم کے اختتام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا..

اور اس لنڈا بازار میں ''کلیاں'' فروخت ہوا کرتی تھیں۔

''کلیاں'' برطانوی پیراٹروپرز کے وہ پیراشوٹ ہوتے تھے جو جنگ کے خاتمے کے باعث بیکار ہو چکے تھے اور جنگ عظیم میں استعمال ہونے والے بوٹوں..وردیوں..ترپالوں اور جرابوں وغیرہ کی طرح متروک ہو کر اب لاہور کے لنڈا بازار میں فروخت ہوتے تھے..

''کلیاں'' اُن زمانوں میں لاہور کی فیشن ایبل خواتین میں ایک سٹیٹس سمبل اس لیے تھیں کہ یہ خالص ریشم کی ہوتی تھیں اور لاہورنیں ان کے دھاگے اُدھیڑ کر شلوار قمیض سُوٹ بناتی

تھیں یا بنواتی تھیں۔

اگرچہ ان دنوں چھٹی جماعت میں پڑھنے والی بچیوں سے شروع ہو کر میٹرک تک کی سب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں مکمل طور پر برقعہ پوش ہوا کرتی تھیں لیکن..سیاہ برقعوں میں سے اگر کلیوں سے تیار کردہ ایک پائنچہ بھی جھلک دکھلا جاتا تھا تو دیگر خواتین حسد کی آگ میں جل بُھن کر خاک ہو جاتی تھیں۔

یوں جان لیجئے کہ تب لنڈا بازار کسی ورساچی یا کرسچن دیور سے کم نہ تھا۔

چنانچہ میں نہایت آسانی سے لنڈا بازار گیا اور وہاں سے وہ کچھ خرید کیا جو خواجہ صاحب کی فہرست میں شامل تھا۔

کسی برطانوی فوجی کا وہ رُک سیک جو اُس نے برما کے محاذ پر استعمال کیا تھا۔

شاید وہ کسی مردہ ہو چکے گورے کے بوٹ..بلکہ مردہ ہو چکے دو گوروں کے الگ الگ بوٹ کہ یہاں مجھ سے ایک کوتاہی ہو گئی تھی کہ بوٹوں کا جوڑا جو میں نے خرید کیا اُن کے سائز ذرا جدا جدا تھے..یعنی بائیں پاؤں والا بوٹ تو میرے سائز کا..نو نمبر کا تھا۔ جب کہ دائیں پاؤں والا گیارہ نمبر کا تھا۔ اور اس کوتاہی کا احساس تب جا کر ہوا جب ہم پہلے روز پیدل چلے..اور میں یوں چلا جیسے کبھی لارڈ بائرن لنگڑاتے ہوئے چلا کرتے تھے۔

اور ہاں میں نے یونہی سرسری طور پر اپنی امی جان سے تذکرہ کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج کی ایک ٹیم کے ساتھ میں کشمیر اور کاغان کے پہاڑوں میں جا رہا ہوں تو اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا..فکرمند اور خوفزدہ ایک ماں کے چہرے کا رنگ..

''پہاڑی علاقہ ہے؟'' اُنہوں نے ہراساں ہو کر دریافت کیا۔

''جی امی..''

''تو وہاں جنگل بھی ہوں گے؟''

''پتہ نہیں امی جی..شاید ہوں۔''

''جنگلوں میں تو شیر ہوتے ہیں بیٹا۔''

''نہیں امی شیر نہیں ہوتے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ شاید ریچھ ہوں۔''

اس اطلاع پر امی جان..مجھے ٹھیک طرح سے تو یاد نہیں لیکن شاید رونے لگیں کہ ریچھ تو

میرے بچے کو اُٹھا کر لے جائے گا۔

اس پر ابا جی نے اُنہیں تسلی دی کہ نواب بیگم کیوں ہلکان ہوتی ہو.. فکر نہ کرو۔ مستنصر کے ہمراہ پروفیسر جائیں گے درجن بھر کالج فیلو جائیں گے تو ریچھ کی یہ جرأت نہیں کہ وہ ہمارے ہی برخوردار کو اُٹھا کر لے جائے۔ لیکن امی جی کی تشفی نہ ہوئی.. البتہ ابا جی میری سائڈ پر تھے.. کشمیر اُن کی کمزوری تھا.. قیام پاکستان کو نو برس بیت چکے تھے اور اُنہیں بھی کشمیر دیکھے ہوئے نو برس کا عرصہ گذر چکا تھا اور وہ اُسے بری طرح مِس کرتے تھے.. سرینگر میں ہمارا ایک سیڈ فارم تھا جہاں ڈہلیا کے گوبھی کے پھولوں جتنے بڑے پھول کئی ایکڑوں میں کھلے ہوئے نظر آتے تھے.. ابا جی اُس سیڈ فارم کو اور جھیل ڈل کو بُری طرح مِس کرتے تھے..

لڑکوں نے اگرچہ رضا کارانہ طور پر کشن گنگا مُہم پر جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش تو کر دیا لیکن اُن کے دل میں خدشات تھے اور وہ خواجہ صاحب سے ڈرتے ڈرتے پوچھتے رہتے.. ''سر یہ وادیٔ کشن گنگا ہے کہاں جہاں ہم نے جانا ہے..''

''بوائز.. یہ کہیں کشمیر وغیرہ میں ہے۔''

''سر.. اگر آپ کو بھی اس کے حدود اربعہ کے بارے میں علم نہیں تو سر ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟''

''ہمارے پاس تفصیلی نقشے ہیں بوائز.. اور ایک ایسا باورچی ہمارے ہمراہ ہوگا جو اُن علاقوں میں جا چکا ہے۔''

''لیکن سر اس وادی کا نام کچھ ہندوانہ سا ہے تو کہیں یہ انڈیا میں نہ ہو تو ہمارے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہیں۔''

''باورچی نے مجھے یقین دہانی کروائی ہے کہ یہ کہیں آزاد کشمیر میں ہے.. ہم رتّی گلی کی چوٹی عبور کر کے اس وادی میں داخل ہوں گے۔''

''یہ رتّی گلی بہت اُونچی چوٹی ہے سر۔''

''ہاں شاید.. چوٹی ہے تو اونچی ہی ہوگی بیوقوف..''

''ایورسٹ سے تو اونچی نہیں ہوگی سر..''

''بالکل نہیں بیوقوف۔''

''وہاں چوٹی پر برف ہوگی سر؟''

''چوٹی پر برف تو ہوتی ہے بوائز..''

''سر ہم برف پر کیسے چلیں گے.. ہم تو پھسل کر لڑھک جائیں گے۔''

''ہمارے پاس آئیس ایکس ہوں گے جن کی مدد سے ہم برف میں راستے بنائیں گے۔''

''سر ایک اور سوال.. وہاں ٹائلٹ تو نہیں ہوں گے تو ہم پاٹی کہاں کریں گے؟''

''شٹ اپ.. اپنا سامان اُٹھاؤ اور اوول گراؤنڈ کے دس چکر لگاؤ۔''

ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے سوالوں سے خواجہ صاحب بھی تھوڑے سے فکر مند ہو گئے کہ میں اتنے سارے بچوں کو اگر لے کر جا رہا ہوں تو کہاں جا رہا ہوں۔

بالآخر کُوچ کا دن آن پہنچا اور بوائز صبح سویرے لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچنے لگے۔ کوئی تانگے پر.. کوئی اپنے ملازم کے سر پر رُک سیک اُٹھوائے ہوئے پیدل۔ کوئی اپنے ابا جی کی سائیکل کے آگے بیٹھا ہوا اور کیریئر پر ایک بستر بند بندھا ہوا جس کے بوجھ سے سائیکل ابا جی کے کنٹرول سے باہر ہوتی جاتی ہے.. ایک بوائے اپنے ذاتی ریڑھے پر نہایت تزک و احتشام سے وارد ہوا۔ صرف شفیق تھا جو ایک سیاہ اوپل ریکارڈ میں سوار آیا.. اور یقین کیجئے کہ وہ اوپل ریکارڈ اُس روز تو کیا اگلے چند روز میں بھی لاہور ریلوے سٹیشن کے برآمدے میں آ کر کھڑی ہونے والی واحد کار تھی.. اور سامنے جو تانگہ سٹینڈ تھا اُس میں پارک شدہ تانگوں کے گھوڑے اُسے دیکھ کر بِدک گئے تھے کہ اُنہوں نے ایسا عجیب جانور کم ہی دیکھا تھا..

بوائز.. رُک سیک کے علاوہ دیگر سامان سفر بھی احتیاطاً ساتھ لے آئے تھے.. مثلاً رضائیاں، اوورکوٹ، ٹفن کیریئر، تھرموس بوتلیں، بوٹ پالش، مدھو بالا اور کامنی کوشل کی تصویریں.. ایک گھڑا بھی ٹھنڈے پانی سے چھلکتا ہوا۔ اور ہاں راستے کے لیے پھل فروٹ بھی جن میں گنے اور گاجریں سرفہرست تھے۔

ہم ٹرین پر سوار ہو کر حویلیاں تک گئے کہ ریلوے لائن بس وہیں تک جاتی تھی اور پھر وہاں سے مقامی بسوں پر لد کر ایبٹ آباد جا پہنچے جہاں کسی سکول کی بوسیدہ عمارت میں ہم نے شب بسر کی۔

ویسے اُن دنوں..جب ہم نے پہلی بار ایبٹ آباد کو دیکھا تو یہ ہمیں انگریزوں کا شہر لگا کہ یہ اتنا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا تھا اس لیے اجنبی سا لگا..ہم اس میں بیوقوف بُوتھیاں اُٹھائے ڈرتے ہوئے چلتے تھے کہ کہیں کوئی ہمیں یہ نہ پوچھ لے کہ اوئے تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو اور کہیں انگریزی میں ہی نہ پوچھ لے۔

اگلی سویر مانسہرہ اور گڑھی حبیب اللہ کے راستے..اور یہ راستہ ہمارے حساب سے بہت ہی دشوار اور خطرناک تھا..ہم بالآخر ایک پہاڑوں سے ماتھا لگائے ایک چھوٹے سے گاؤں بالاکوٹ میں پہنچ گئے۔

بالاکوٹ اُن دنوں ایک انتہائی پس ماندہ، غربت کا مارا، چند پتھریلے گھروں اور جھونپڑوں کا ایک ایسا قصبہ تھا جہاں سے ایک ماچس بھی دستیاب نہ ہو سکتی تھی کہ وہاں کوئی دکان ہوتی تو ماچس ملتی..چنگھاڑتے ہوئے شور مچاتے دریائے کنہار کے کناروں پر اس بستی کی واحد وجۂ شہرت سید احمد شہید کا مزار تھا جہاں ہم سب نے حاضری دی اور دعا کی کہ یا اللہ ہم کافروں کی کسی وادی کو جا رہے ہیں، ہمیں خیر خیریت سے واپس اپنے گھروں تک پہنچا دینا۔

پچھلے پہر ہم سب نے اجتماعی طور پر جاوید اثر کی قیادت میں دریائے کنہار میں اشنان کیا اور اُس کے پانی ہمارے کومل میدانی بدنوں کے لیے اتنے سردیلے اور برف بھرے تھے کہ یہ بدن نیلے ہو گئے اور ہم اگلی صبح تک کپکپاتے رہے..ہم اُسی عالم کپکپاہٹ میں تھے جب ہم چند پرانی جیپوں پر سوار ہو کر وادئ کاغان کے کھلے منہ میں داخل ہو کر گویا موت کے ایک ایسے کنویں میں داخل ہو گئے جس میں ایک کچے رستے پر دریائے کنہار کے اوپر معلق جیپیں شرابیوں کی مانند لڑکھڑاتی تھیں اور گھومتی تھیں اور ہم بمشکل اُن کے راڈ تھامے اپنے آپ کو کھائی میں گرنے سے بچاتے تھے اور تب پہلی بار ہم بوائز میں سے اُس ایک بوائے شفیق نے..جو لاہور ریلوے سٹیشن کے برآمدے میں ایک سیاہ اوپل ریکارڈ پر وارد ہوا تھا، ضبط کی آخری حدوں کو پار کر کے یکدم ''ہائے امی جی'' کا نعرہ لگایا۔

یہ نعرہ دراصل ہم سب کے دلوں کی آواز تھا..بعد میں یہ نعرہ ہماری مُہم کا غیر سرکاری نعرہ بن گیا لیکن اُس لمحے ہم دانت بھینچے..دریائے کنہار کے اوپر ڈولتی، ڈگمگاتی دوسری جنگ عظیم میں متروک شدہ جیپوں میں دل پر جبر کیے اگرچہ چپ رہے لیکن اسی دل کے اندر ہم سب اپنی اپنی

امی جانوں کو یاد کرتے رہے..جو یقیناً اُس لمحے ہمیں بھی لاہور میں یاد کر رہی تھیں کہ پتہ نہیں میرا جگر گوشہ اس وقت کہاں ہے..کسی ریچھ کی آغوش میں ہے، کہاں ہے..

اور براہ کرم اس سفری روئداد کو پڑھتے ہوئے یاد رکھیے کہ اُن گئے زمانوں میں وادئ کاغان کے وجود کے بارے میں بھی کم ہی لوگ آگاہ تھے۔اور جو نام سے آگاہ تھے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ لداخ میں ہے..کشمیر میں ہے یا اِدھر کہیں پاکستان میں ہے..

یہ عرض کر دینے میں کوئی قباحت نہیں کہ اس صبح سے شروع ہو کر شام تک کے پہاڑی سفر کے دوران ہم تنہا تھے جو موت کے اس کنویں میں گھومتے تھے..نہ ہمیں کسی جیپ نے اوورٹیک کیا اور نہ ہی سامنے سے کوئی سواری آئی اور ہمارے قریب سے گذر کر پیچھے رہ گئی بالاکوٹ کی جانب اُتری..

ہم ناران میں اُترے تو ہمیں قرار آ گیا..ہم جو جیپوں کے گھومنے سے خود بھی گھوم گئے تھے..چکرا گئے تھے۔جب ناران کی نسبتاً ہموار وادی میں داخل ہوئے تو اطمینان کا پہلا سانس لیا۔

''ناران..اتنا ہرا، اتنا خاموش، اتنا پوشیدہ''

ناران، پہاڑوں کی آغوش میں.. جنگلوں میں گھرا.. اتنا ہرا.. کہ کسی ساون کے اندھے کو بھی اتنا ہرا کہاں سُوجھتا ہوگا..اتنا ہرا..اور اتنا خاموش کہ اُس پر گونگا ہونے کا شبہ ہوتا تھا..اور اتنا پوشیدہ کہ اُس پر کسی مفرور مجرم کا گمان ہوتا تھا..اور یہ بس ایک نام تھا..ایک مقام تھا..جہاں کوئی نہ تھا..

کنہار کے کنارے گوجروں کے چند جھونپڑے تھے..

ایک یا شاید دو تنوری ہوٹل تھے جہاں آلو شوربے اور کچی پکی روٹیوں کے سوا کوئی ڈش میسر نہ تھی اور وہ بھی شام ڈھلنے سے پہلے پہلے..

کنہار کے کنارے انگریزوں کے زمانے کا ایک بوسیدہ سا ڈاک بنگلہ تھا..

اور ناران میں داخل ہوتے ہوئے دائیں جانب جو بلندی تھی..گلیشیئر کے پار ہو کر دائیں ہاتھ پر ایک گھنے جنگل کے کنارے اونچائی پر..وہاں ایک نوتعمیر شدہ یوتھ ہوسٹل تھا جس میں شاید ہم اولین مکین تھے..اور ہم وہ پائینیئر تھے جن کی جیبوں میں یوتھ ہوسٹل ایسوسی ایشن آف پاکستان کے پہلے پہلے کارڈ تھے..

ناران، یقیناً بہت ہی سرسبز، سرد اور دل کو ایک دور افتادہ اور یکتا احساس سے بھر دینے والا، نامعلوم کی آغوش میں پنہاں ایک مقام تھا لیکن ہم مال روڈ پر مٹرگشت کرنے والے راوین اور لاہوریوں کے لیے یہ ایک کالا پانی تھا..

لاہور سے جانے کس سمت میں کہاں واقع، پہاڑوں کی برفیلی تنہائی میں کہیں..اداس بھی اور تنہا بھی..ایک کالا پانی تھا۔جہاں شام اُترتی نہ تھی..یکدم گر جاتی تھی۔

پلک جھپکتے ہی..ابھی کچھ روشنی ہوتی..اور ابھی ہر سُو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور وہ اندھیرا اپنے دامن میں سردی کے برفیلے ہاتھ لے کر آتا جو ہمارے بدنوں کے گرد لپٹ جاتے..ہماری مجبوری تھی کہ ہمیں یوتھ ہوسٹل سے اُتر کر وادی میں آلو شوربے کی ضیافت کے لیے جانا پڑتا تھا اور جب ہم اپنے معدے میں آلو کلبلاتے شام کے بعد اندھیرے میں گم ہوتے یوتھ ہوسٹل کو لوٹتے تو ایک دوسرے کے ہاتھ تھامتے ہوئے لوٹتے اور گرتے پڑتے لوٹتے..

اس پر ایک اور آفت نازل ہوئی..

یوتھ ہوسٹل کے چوکیدار نے..جو جانے کب سے اس ویران ہوسٹل کی چوکیداری کیے چلا جا رہا تھا..اُس نے ہمیں خبردار کیا کہ غروبِ آفتاب کے بعد آس پاس کے بلند پہاڑوں سے خاص قسم کے ریچھ اُترتے ہیں، اور اکثر اُترتے ہیں اور وہ بھوکے ہوتے ہیں اور ہر اُس شے کو نہایت اشتیاق سے کھا جاتے ہیں جو اُن کے راستے میں آ جاتی ہے اور وہ چونکہ خاص قسم کے ریچھ ہوتے ہیں اس لیے وہ خاص طور پر اجنبیوں اور بچوں کو نہایت رغبت سے کھاتے ہیں۔

اس خوش کن نوید نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

ہم نے اس خبرداری پر مکمل طور پر اعتبار کر لیا۔

یقیناً آج کی ہوش مند اور باخبر نسل اس خبرداری پر ذرہ برابر اعتبار نہ کرتی اور اسے ہنسی میں اُڑا دیتی۔لیکن..میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ یہ سینتالیس برس پیشتر کا قصہ ہے۔

جب ہم بہت معصوم اور بے خبر تھے..لاہور میں تو تھے ہی لیکن کسی نامعلوم کاغان وادی میں گھرے ناران سے کہیں بڑھ کر معصوم اور بے خبر تھے اور نوجوانی کے اوائل میں تھے جب ہم مکمل طور پر برقعہ پوش لڑکی کا ایک ٹخنہ نظر آنے پر اُس پر عاشق ہو جاتے تھے اور خودکشی پر مائل ہو جاتے تھے۔چنانچہ ناران یوتھ ہوسٹل کے چوکیدار کی خبرداری پر ہم نے اگر اعتبار کر لیا تو یہ اُن زمانوں کی مجبوری تھی اور وہ چوکیدار کچھ زیادہ جھوٹ بھی نہ بولتا تھا کہ ان زمانوں میں بہرحال وہاں ریچھوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

چوکیدار کی خبرداری کے بعد اُس رات..ناران میں ہماری جو پہلی رات تھی..

یوتھ ہوسٹل کے نوخیز لکڑی کے بنے ہوئے فرش پر اپنے کمبلوں اور سلیپنگ بیگوں میں لیٹے ہوئے ہمارے چھریرے بدن صرف سردی سے ہی نہیں بلکہ گھر سے دور، اس ویران..

پہاڑوں کی تنہائی میں، ریچھوں کے ہمیں ثابت نگل جانے کے خوف سے بھی لرزتے تھے۔

اور ہم میں سے بیشتر اُس رات شفیق کے ہم نوا ہو چکے تھے اور با آواز بلند اپنی اپنی امی جانوں کو پکارتے تھے۔

صرف خواجہ صاحب تھے جو نہایت آسودگی میں سوتے تھے اور کبھی کبھار بڑبڑاتے تھے کہ بوائز فکر نہ کرو.. ہم بہت سے ہیں اور اس وادی میں اتنے بہت سارے ریچھ نہیں ہو سکتے جو ہم سب کو کھا جائیں.. بڑبڑاتے تھے اور خراٹے لینے لگتے تھے۔

ہمیں یقین تھا کہ خواجہ صاحب بھی دل ہی دل میں اپنی مرحومہ امی صاحبہ کو یاد کرتے ہوں گے..

اُس رات باہر ذرا سی آہٹ ہوتی، سرسراہٹ سنائی دیتی، تیز ہوا کا شور ہوتا تو ہمارے دل سینے میں سے نکل کر ہمارے سلیپنگ بیگز پر آ جاتے اور بہت دیر تک وہاں ہائے امی جی پکارتے اُچھلتے رہتے..

لیکن ناران مکمل طور پر اتنا ڈراؤنا اور خوفناک بھی نہ تھا کہ اس میں دریائے کنہار کے کنارے برطانوی راج کے موسموں میں ابھی تک سانس لیتا ڈاک بنگلے کا وہ قدیم ڈائننگ روم بھی تھا جہاں ہم نے ایک شب ''ڈنر'' کیا تھا۔

موم بتیوں کی رومانوی جھلملاہٹ میں.. ہمارے نوخیز اُمیدوں بھرے ہیجان خیز چہرے دمکتے تھے۔ باہر جو سرد رات تھی اُس میں تاریک جنگلوں سے اُترتی ہوئی سرسراہٹیں دریائے کنہار کے شور سے ہم آغوش ہو کر ڈائننگ رُوم کی کھڑکیوں سے سر پٹختی پسپا ہوتی تھیں۔ با قاعدہ کرسیوں پر بیٹھ کر کہ اُن دنوں کم از کم میں تو اُس چنگیر کے گرد جس میں امی جان کے توے سے گرم گرم روٹیاں اُترتی تھیں، پیڑھی پر براجمان ہو کر ہی ڈنر کرتا تھا.. میز پوش سے ڈھکی پرانی میز کے گرد بیٹھ کر.. کیسا ناقابل فراموش ڈنر کیا۔ جہاں ہم نے شاید زندگی میں پہلی بار سُوپ نام کی کوئی شے سُڑکی اور پی.. اور پھر بوائز کے سامنے سجی مِڈ ونٹر سٹریفورڈ شائر کے ڈنر سیٹ کی پلیٹوں میں تازہ.. تلی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی، آلو کے قتلوں اور اُبلی ہوئی سبزیوں کے ساتھ اُتری..

اُن دنوں ناران کے درمیان میں بہتے کنہار میں اتنی ٹراؤٹ تھی کہ بس یوں جان لیجیے کہ پانی کم ہوتا تھا اور اُس میں اُچھلتی ٹراؤٹ زیادہ.. اور مقامی لوگ پانی میں ہاتھ ڈال کر اُسے

دبوچ سکتے تھے.. جب کہ اِن دنوں اگر کوئی سیاح اس دریا میں سے.. دو چار روز کی جُھل خواری کے بعد اگر اتفاق سے کوئی دو انچ کی ٹراؤٹ بھی پکڑ لیتا ہے تو پورے ناران میں دھوم مچ جاتی ہے اور لوگ دور دور سے اُس خوش بخت سیاح کو اور ٹراؤٹ کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

اور اُس شبِ یکتا میں.. جس میں ہم نے زندگی کا پہلا سُوپ پیا اور پہلی ٹراؤٹ کھائی اور موم بتیوں کی مدھم روشنی میں کھائی سب سے یادگار وہ خانسامہ یا ویٹر تھا جو ہمیں سرو کر رہا تھا.. ایک طُرّے دار پگڑی، اچکن اور چوڑی بیلٹ میں ملبوس یہ خانسامہ.. شاید ابھی تک لاعلم تھا کہ انگریز سرکار کو رخصت ہوئے نو برس ہو چکے ہیں اور وہ صرف انگریزی بولتا تھا اور ہم سب کو ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا. سرو کرتے ہوئے جھکتا تھا اور پھر ''تھینک یو سر'' کہہ کر سیدھا ہوتا تھا..

ہم اگلے روز ایک ایسی جھیل پر گئے جو ہمارے لیے سراسر اجنبی تھی.. نہ ہم نے کبھی اُس کا کہیں ذکر سنا تھا اور نہ آگاہ تھے کہ ناران سے پرے چار گھنٹے کی پیدل مسافت پر کوئی جھیل تھی.. ہم تو ناران سے بھی کہاں آگاہ تھے.. وہاں پہنچ کر ہمیں بتایا گیا کہ اسے سیف الملوک کہا جاتا ہے..

یہ بتانے کی چنداں حاجت نہیں کہ صرف اُس روز ہی نہیں۔ اُس برس بھی ہم وہ واحد اجنبی تھے جو اُس کے کناروں تک گئے تھے اور پہاڑوں کی اس ملکہ کا پہلی بار درشن کر رہے تھے..

سیف الملوک ابھی تک کنواری اَن چھوئی تھی۔

اور ہم بھی تو کنوارے اور اَن چھوئے تھے.. ہمیں کسی بھی غیر رشتہ دار نسوانی ہاتھ نے چُھوا نہ تھا..

تو ہم.. اور یہ جھیل کنوارگی اور معصومیت کے موسموں میں اکٹھے سانس لیتے تھے..

کہیں میری کسی بوسیدہ البم میں.. جسے باندھنے والے دھاگے بھی بھر بھرے ہو کر اس کے اوراق کو بکھر جانے کی اجازت دینے کو ہیں. سینتالیس برس پیشتر کے زمانوں کی ایک تصویر ہے.. بلیک اینڈ وہائٹ.. جس کا وہائٹ بھی بُھورا ہونے لگا ہے.. میرے پہلے کیمرے، ایک کوڈک بے بی براؤنی کیمرے سے کھینچی ہوئی. جس میں ایک سترہ برس کا، کچی اور کومل عمر کا چھریرے بدن کا.. مجھے شاید دس بارہ دنوں کے بعد شیو بنانے کی حاجت ہوتی تھی.. ایک لڑکا کھڑا ہے جھیل سیف الملوک کے کنارے.. پس منظر میں دور تک پانیوں پر کروٹیں ساکت ہیں.. فوجی

بوٹوں میں، آرمی سویٹر میں ڈھیلی براؤن پتلون میں، ایک گورکھا ہیٹ لاپروائی سے کاندھوں پر لٹکائے، چوڑے ماتھے پر مروّجہ فیشن کی پیروی میں گھنگھریالے بالوں کی لٹ ڈالے..کہیں دور افق کے پار تکتا ہوا..کہ یہ بھی مروّجہ فیشن تھا کہ تصویر اُترواتے ہوئے کھوسے جاؤ اور اداسی سے افق کے پار تکتے جاؤ..اور اُس لمحے اُس لڑکے کو کیا علم کہ مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے..کہ وہ بقیہ لڑکوں کی مانند کبھی بھی ایک کامیاب زندگی نہیں گذارے گا..کسی بڑے عہدے پر نہیں پہنچے گا۔ایک بے مقصد آوارگی اور کوہ نوردی اُس کا مقدر ہوگی..اُفق کے پار جو کچھ کاتب تقدیر نے لکھا تھا وہ اُسے پڑھ نہ سکتا تھا..اگر پڑھ سکتا تو وہیں توبہ تائب ہو کر ذی ہوش اور نارمل ہو جاتا..پر نہ ہوا۔

ہمارے لیے تو ناران بھی ویرانی اور پہاڑوں کی تنہائی کی دنیا کا آخری سرا تھا..لیکن ناران سے آگے گئے تو گویا یہ دنیا بھی اختتام کو پہنچی اور ایک اور کائنات شروع ہوگئی جس کے اندر ہماری جیپیں بھی جھجکتی ہوئی داخل ہوتی تھیں..اپنے گھروں اور اپنے رشتوں کے جس ناڑو میں بندھے ہوئے ناران تک آئے تھے وہ بھی کٹ گیا اور ہم ایک خلاء میں چلے گئے جہاں عجیب اجنبی جہان تھے..

لیکن بلندیوں سے اُترنے والے خانہ بدوشوں کے قافلے جیپوں کی راہ میں حائل ہوتے اور وہ اپنے مویشیوں، گھوڑوں اور کتوں کی مانند خوفزدہ ہو کر چٹانوں سے چمٹ جاتے..

کچے راستے پر کچھ گلیشیئر تھے جن کی برفیں ہمارا راستہ روکتی تھیں..

ایک مقام باٹا کنڈی نام کا آیا اور ہم آگے چلے گئے..اور پھر سرشام پہاڑوں کی تنہائی میں سے برآمد ہو کر ہم نسبتاً ایک ہموار علاقے میں داخل ہوگئے..جہاں دریائے کنہار سکون سے اس کی ہمواری میں لیٹا ہوا تھا..اور ایک بے نام پہاڑی ندی دائیں جانب کے برف پوش پہاڑوں میں سے اُترتی اس میں شامل ہو رہی تھی۔

ہم بوڑاوائی پہنچ چکے تھے۔

''ڈاک بنگلہ بُوڑاوائی..گورالوگ کی ڈائری 1920ء''

بوڑاوائی کی کائنات ایک اور ڈرا دینے والی تنہائی اور خاموشی تھی..

ہماری جیپوں کے انجن خاموش ہوئے تو گویا اس کائنات کی نبضیں بھی رُک گئیں..ہم جیپوں سے اُترتے ہوئے جھجکتے تھے کہ کہیں نیچے زمین نہ ہو خلاء ہو اور یہ ہم کہاں آگئے ہیں..

اس وسیع لینڈ سکیپ میں..چار چفیرے پہاڑ تھے اور اُن کے درمیان جو ایک مختصر میدانی علاقہ تھا، ویران تھا، سوائے ایک مسمار ہوتے ہوئے..برطانوی راج کی یادگار..ایک ڈاک بنگلے کے سوا جو ناران سے یہاں تک ایک تنہا رہائش گاہ تھی..

آس پاس، دور دور تک اور کچھ نہ تھا..

اور اس ڈاک بنگلے کا بھی بس ایک کمرہ تھا جس کی چھت سلامت تھی اور ایک برآمدہ تھا اور ہاں ایک چوکیدار بھی تھا..

یہ چوکیدار ناران کے ڈاک بنگلے کے خانسامے کا کوئی بھائی بند تھا جس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہمارے گورا صاحب ہمیں یوں بے آسرا چھوڑ کر کیوں اور کہاں چلے گئے ہیں..اگر چلے گئے ہیں تو..

وہ ایک مفلوک الحال کردار تھا جسے شاید برسوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی، نہ ہی اُسے نوکری سے معطلی کا کوئی پروانہ ملا تھا۔ چنانچہ وہ ڈیوٹی پر حاضر تھا اور راتوں کو لالٹین سے ڈاک بنگلے کے آس پاس گشت کرتا تھا اور بڑبڑاتا رہتا تھا۔اُس نے ہمارے ٹولے کو وارد ہوتے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا حالانکہ کئی برسوں کے بعد ہم پہلے مسافر تھے..اُس نے نہایت سرکاری انداز میں ایک بوسیدہ رجسٹر ہمارے سامنے کھول دیا کہ صاحب اس پر اپنا نام لکھو..رینک لکھو اور یہ لکھو کہ کہاں

سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے..

یہ ایک عجیب اور انوکھا سا رجسٹر تھا.. جیسے میری البم کے اوراق آج بوسیدہ ہو کر اُکھڑتے ہیں، ایسا وہ رجسٹر تب تھا۔

رات ہوئی تو ہم سب ڈاک بنگلے کے واحد کمرے کے فرش پر اپنے کمبل اور سلیپنگ بیگ بچھا کر لیٹ گئے۔

ہم میں سے بیشتر.. یہیں سے لوٹ جانا چاہتے تھے..

فرار ہو جانا چاہتے تھے..

کہ ابھی تو باقاعدہ کوہ نوردی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا اور ہم اتنی بڑی تنہائی میں آ گئے تھے.. جس میں کہیں بلند پہاڑوں میں گھرا بوڑاوائی کا ڈاک بنگلہ تھا..

تو آگے کیا ہوگا..

لیکن ہم فرار ہو کر جا بھی کہاں سکتے تھے..

ہوائیں جو اس رات میں بلند پہاڑوں میں سے اُترتی تھیں اور اپنے سامنے ایک ایسا مختصر میدان پاتی ہیں جہاں صرف ایک ہی عمارت ابھرتی تھی تو اُن کی تمام تر تندی اور وحشت اس پر حملہ آور ہو جاتی تھی جیسے اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہوں.. رات بھر طالع بیدار نے یعنی ان ہواؤں نے مجھے سونے نہ دیا اور میں اپنے کمبل میں سے نکل کر بوڑاوائی ڈاک بنگلے کے برآمدے میں آ گیا جہاں ایک لالٹین روشن تھی اور وہ رجسٹر دھرا تھا جس میں ہمارے نام درج تھے..

میں نے رجسٹر کھولا.. 1956ء میں کھولا.. مجھے نہیں معلوم کہ آج 2003ء میں وہ موجود ہے یا نہیں اور اس کے بوسیدہ اوراق گواہ تھے کہ یہاں گئے زمانوں میں کچھ گورا لوگ آتے تھے.. اور انہوں نے برطانوی راج کی شان و شوکت سے بہت دور اس نامعلوم ویرانے میں ایک رات بسر کی تھی..

ظاہر ہے مجھے اُس رجسٹر پر درج شدہ نام اور عبارتیں آج یاد تو نہیں لیکن اُن کا متن کچھ یوں تھا..

برسوں کی دُھند کے پار میں کیسے جا سکتا ہوں اور اُس رجسٹر پر درج عبارتوں کو جُوں کا تُوں کیسے بیان کر سکتا ہوں..

صرف دُھندلاتی یادداشت میں اُتر کر جو کچھ سجھائی دیتا ہے اُسے بیان کرتا ہوں جو کچھ یوں تھا..

کوئی گورا.. جان وہائٹ یا جان سمتھ بوڑاوائی ڈاک بنگلے کے رجسٹر میں.. 1914ء میں.. اپنے تاثرات درج کرتا ہے..

''میرا خچر یہاں تک آتے آتے مر گیا ہے.. پُونا میں بیٹھے ہوئے میں کیسے تصور میں اس مقام کو لا سکتا تھا جہاں میں آج رات گذارنے والا ہوں.. یہ برٹش ایمپائر کی آخری آؤٹ پوسٹ ہی ہوگی.. پتہ نہیں یہاں سے مجھے ایک اور خچر دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں.. میں کیسے گلگت پہنچوں گا جہاں شیلا میرا انتظار کر رہی ہے۔''

ایک اور مجھ سے چالیس برس پیشتر یہاں تک پہنچ جانے والا گورا لکھتا ہے۔

''مجھے یہاں کے چوکیدار سے ڈر آتا ہے جو ہمہ وقت میرے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے اور مسکراتا رہتا ہے.. پتہ نہیں اُس کی نیّت کیا ہے حالانکہ میں نے اُسے اطلاع کر دی ہے کہ میں برٹش آرمی میں سارجنٹ کے عہدے پر فائز ہوں اور ڈیرہ دُون میں تعینات ہوں، پھر بھی مجھے اس ہندوستانی سے بہت خوف آتا ہے۔''

موجودہ چوکیدار بھی شاید برٹش سارجنٹ کے زمانے کے چوکیدار کی ایک رُوح تھی کہ یہ بھی منڈلاتا رہتا تھا۔

''اس گاڈ فارسیکن مقام پر صرف ڈاک بنگلے کا چوکیدار ہے جو بے حد معاون ثابت ہو رہا ہے.. یہ کہتا ہے کہ یہاں سے ایک دن کی گھوڑا مسافت پر ایک جھیل لُولُوسر نام کی ہے جس کے پار چلاس کا گاؤں ہے جہاں کے لوگ بہت جنگلی ہیں اور گوروں کو کھا جاتے ہیں اور وہاں سے آگے گلگت کا گاؤں ہے''..

''میں یہاں سے پشاور واپس چلا جاؤں یا آگے جانے کا خطرہ مول لوں..''

ایک اور مسافر لکھتا ہے..

''مجھے ایبٹ آباد میں ہی ٹھہر جانا چاہیے تھا.. جہاں برٹش آرمی کے بہترین میس ہیں اور بہترین شراب ہے.. جان اور ٹونی وہیں ٹھہر گئے تھے اور میں نے یہاں تک آنے کی حماقت کی ہے.. لیکن اُنہوں نے بوڑاوائی کی چاندنی رات نہیں دیکھی اور میں دیکھ رہا ہوں۔''

یہ 1914ء یا 1920ء کا بوڑاوائی ہے..

جہاں میں 1956ء میں موجود ہوں۔

تو کیا یہ بوڑاوائی اب بھی موجود ہے۔سینتالیس برس کے بعد 2003ء میں یقیناً وہ ایک کمرہ اور برآمدہ بھی کھنڈر ہو چکا ہوگا اور وہ رجسٹر بھی اُس میں دفن ہو چکا ہوگا..

''میری کوہ نوردی کا سب سے پہلا قدم اور ایک وادیٔ نامعلوم میں پہلی رات''

اگلی سویر..وہ سویر جب میں نے اپنی کوہ نورد زندگی کا پہلا قدم اُٹھایا۔

ہماری آزمائشوں کا آغاز ہوا..ہم پیدل ہو گئے۔

ہم نے ناران سے یہاں بوڑاوائی تک آتی کچی روڈ کو ترک کیا..یہ کچی روڈ جو جھیل لُولُوسر اور چلاس کو جاتی تھی..درّہ بابوسر کو عبور کر کے چلاس اور گلگت کو جاتی تھی، اُسے ترک کیا..رُک سیک کاندھوں پر بوجھ کیے اور دائیں جانب کچے راستے سے ہٹ کر ایک اور انجان وادی میں داخل ہو گئے جس کے آخر میں برفیلی بلندیاں تھیں اور کہیں رتی گلی تھی جس کے پار کشن گنگا نام کی ایک وادی تھی۔

اور یوں اپنی حیات میں پہلی بار ہم کومل بدنوں اور نازک انداموں نے بوجھ اُٹھائے اور راستوں اور پگڈنڈیوں سے جدا ہو کر ایک انجانی وادی میں داخل ہو گئے۔ہمیں اس سے پیشتر کوئی وسوسہ نہ تھا کہ ہم اپنا سامان خود اُٹھائیں گے..اور جب خواجہ صاحب نے مقامی طور پر چند گدھوں اور خچروں کا بندوبست کیا تو ہمیں کامل یقین تھا کہ ہم ان پر سوار ہو کر کوہ پیمائی کریں گے..لیکن جب خواجہ صاحب نے حکم دیا کہ بوائز اپنا اپنا سامان اُٹھاؤ اور چلنا شروع کر دو تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''سر یہ گدھے اور خچر کس لیے ہیں..'' کسی نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

''ان پر ہماری مُہم کا راشن۔ترپالیں۔گھی اور آٹے کے کنستر..فالتو کمبل اور میرا سامان

لدا جائے گا کیونکہ میں لیڈر ہوں۔'' جواب ملا۔

''سر ٹھیک ہے، ہم پیدل چل لیں گے لیکن یہ رُک سیک تو زیادہ وزنی نہیں، انہیں تو گدھوں پر رکھ دیں۔''

''زیادہ وزنی نہیں تو خود اُٹھا کر چلو۔'' خواجہ صاحب یکدم پُرشفقت ہو گئے۔ ''دیکھو بوائز کوہ پیما ہمیشہ اپنا سامان خود اُٹھاتا ہے۔ تم بہادر بچے ہو۔ جوان جہان ہو ایڈونچر کرو، اپنی جان پر کھیل جاؤ اور.. اپنا سامان خود اٹھاؤ۔''

''سر جی۔'' شفیق نے دہائی دی۔ ''میں اپنا بستر بند سر پر کیسے اُٹھاؤں۔''

''چلو اس کو گدھے پر رکھ دو۔''

چنانچہ شفیق آزاد ہو گیا..

اور تب ہمیں احساس ہوا کہ ناران کے یُوتھ ہوسٹل کی رات میں جب ہم اپنی امی جانوں کے لیے آبدیدہ ہوتے تھے تو بے وجہ ہوتے تھے.. یہ تو پیدل مسافت کا کاندھے پر رُک سیک اٹھانے کا آج کا دن تھا جب ہمیں زاروقطار گریہ کرنا زیب دیتا تھا کہ ہم ناز و نعم میں پلے ہوئے لاڈلے اپنے کندھوں پر بیس بیس کلو وزنی رُک سیک اُٹھائے ناتواں کشمیری ہاتوؤں کی مانند کبڑے ہو کر لرزتے گرتے پڑتے چلتے تھے.. چلتے کیا تھے، اپنی جان کو روتے، اُس دن کو روتے جب ہم نے نوٹس بورڈ پر وادیٔ کشن گنگا مُہم کا نوٹس پڑھا تھا، ٹھوکریں کھاتے، بدحواس شُترمرغوں کی مانند بار بار مُنہ کے بل گرنے کو آتے تھے..

ہم لاہور کے دیسی کاؤبوائز جو مال روڈ پر پتلونوں کی ہپ پاکٹس میں ہتھیلیاں ٹھونسے منہ ٹیڑھی کر کے انگریزی بولتے تھے، شیزان ریسٹوران میں چائے کے ساتھ پیسٹریاں کھاتے تھے اور مارلن منرو اور ریٹا ہیورتھ کی فلمیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتے تھے..کہاں آ گئے تھے..

اپنے رُک سیک کے بوجھ تلے کُبڑے ہوتے، اور دُھند اُتر آئی تھی اور بارش برسنے لگی تھی تو اس بارش میں بھیگتے جس کی بوندیں برف کی بنی ہوئی تھیں.. چٹانوں کے سہارے چلنے کی کوشش میں اپنے کومل ہاتھ زخمی کرتے، لنگڑاتے زندگی میں پہلی بار بلند پہاڑوں میں چل رہے تھے.. پاؤں میں جو ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں دردناک نوعیت کی وہ ہمیں کیا پتہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے بلبلے اٹھتے ہیں جنہیں عرف عام میں چھالے کہا جاتا ہے اور یہ وہی ہیں جو ایک دردبھرے گیت میں

سنائی دیتے ہیں کہ او دُنیا کے رکھوالے سُن درد بھرے مرے نالے اور پاؤں میں پڑ گئے چھالے وغیرہ..اور یہ وہی چھالے ہیں..

اور تب ہم نے اُس کو دیکھا..

پہاڑوں کی تنہائی میں ایک تنہا مسافر تھا..

''جواں خون بوڑھے پہاڑوں کے ڈھلوان راستوں پر چل رہا تھا..

اس خون کی گرمی بھی بتدریج زائل ہونا تھی..لیکن ابھی نہیں..ابھی یہ سولہ برس کا تھا، گورنمنٹ کالج لاہور کی کوہ پیما جماعت کا ایک رکن تھا، جوان تھا، بدن صرف حدّت تھا اور اس یقین کا اسیر تھا کہ وادیٔ کاغان سے پرے بوڑاوائی اور باٹا کنڈی کے قریب رتّی گلی کی برف پوش چوٹی کی طرف بڑھتے ہوئے ان بلندیوں اور ڈھلوانوں پر سرسراتی گھاس اور چہرے پر پھیلتی سرد لبوں کے بوسے ہوا اور دریائے کُنہار کے پانیوں کی پُرشور موجودگی اور آسمان اور زمین اور اس کے درمیان ہر شے، ہر درخت، ہر پودا، ہر پرندہ اور یہ زندگی اور یہ زندگی صرف اُس کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ رہے گا، چاہے یہ سب کچھ بوڑھا ہو کر مسمار ہو جائے لیکن وہ رہے گا کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نہ رہے اور یہ سب کچھ جو صرف اُس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے باقی رہے..بس اسی یقین کا اسیر..

سورج سے لشکتی چٹانوں کے..سائے میں سے ایک سایہ علیحدہ ہو کر ایک پُرخطر پگڈنڈی پر رینگنے لگا۔

کون ہے؟

کیا ہے؟

اِن پُرہول ویرانوں میں ہم دس نوجوانوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے اور ہم تو رتّی گلی کی چوٹی کو یہ بتانے جا رہے ہیں کہ تم اگر برفوں سے ڈھکی ہوئی ہو، سولہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہو تو بھی ہمارے پاؤں تمہارے سینے پر ہوں گے، ہم تمہیں فتح کر لیں گے لیکن یہ کون ہے؟ کیا ہے؟.. اور کہاں جا رہا ہے؟

''میرے خیال میں شیر ہے۔'' جاوید اشرف ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

''شیر؟'' میں نے اپنا رُک سیک زمین پر رکھ دیا۔ ''آؤ اسے پتھر ماریں۔''

''سر یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟'' شفیق نے پروفیسر سعید سے دریافت کیا جو دُور بین آنکھوں پر جمائے اُدھر دیکھ رہے تھے۔ مُہم کے اراکین نے آرام کے اس وقفے کو غنیمت جانا اور جو جہاں تھا وہیں اپنے رُک سیک کے سہارے لیٹ گیا۔ ہمارے ساز و سامان سے لدے پانچ خچر بھی اس عارضی قیام کی خوشی میں خُرخُر سانس لمبے لینے لگے۔

''آدمی ہے.. تنہا ہے.. شہر کا لگتا ہے۔'' پروفیسر سعید نے دُور بین آنکھوں سے ہٹا کر چٹانوں پر آرام کرتی لمبی پڑی مخلوق کو اطلاع کی۔

آدمی اور ان ویرانوں میں؟.. اگر ہم سچ مچ شیر دیکھ لیتے تو بھی اتنی حیرت نہ ہوتی.. یہاں انسانی آبادی سے کوسوں دُور، دشوار گزار پہاڑی راستوں پر، ہم دس نوجوان، پروفیسر سعید، خواجہ صاحب ایک خانسامے اور پانچ خچروں کی رفاقت میں بھی کچھ سہمے سہمے سے چلتے تھے.. تو پھر یہ حضرت تن تنہا یہاں کیسے گھوم رہے ہیں۔

''ہو ہو.. ہیلو.. او بھائی او بھائی صاحب.. اوئے اوئے۔'' سب لڑکے شور مچاتے اس راستے کی جانب بھاگنے لگے جس پر وہ دھیرے دھیرے چلتا جا رہا تھا۔

ہماری ہنگامہ آرائی اُس کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی قدرے ٹھٹکا، پیچھے مڑ کر ہمیں ایک نظر دیکھا اور اپنا سامان کمر سے اُتار کر اطمینان سے لیٹ گیا.. ہم اُس کے قریب ہوئے، سانسیں چڑھی ہوئیں، ہونکتے ہانپتے ماتھے پر پسینے کی دھاریں.. ہاں وہ سچ مچ ایک آدمی تھا، ایک نوجوان ہم سے ایک دو برس بڑا.. اُس نے ہمیں ایک سرد نظر سے دیکھا جیسے ہم مخل ہوئے ہوں اور پھر بیزاری سے بولا ''ان پہاڑوں میں شور مچانا منع ہے''.. اس کی سرد مہری سے ہم بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور معذرت کی تصویر بنے اس کے چاروں طرف مؤدب کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھ جاؤ'' اس نے اشارہ کیا جیسے ہم اُس کے گھر آئے ہوں۔

ہم ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بیٹھ گئے اور بیک آواز اُسے بتانے لگے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں اور ہم نے راستے میں کن کن خطرات کا سامنا کیا اور یہ کہ ہم نے کئی دنوں سے کسی ہم جنس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے اثر لیٹا رہا اور سرد نظر سے دیکھتا رہا۔

''اور آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''اُدھر۔'' اُس نے درّہ بابوسر کے پُر خطر راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''بالکل اکیلے؟''

''نہیں۔'' اُس نے جیکٹ کی جیب پر ہتھیلی رکھی۔ ''یہ میرے ساتھ ہے۔''

پتہ نہیں وہ ''یہ'' کیا تھا۔ ہم چپ ہو گئے اور وہ جیکٹ کی جیب کو تھپکتا رہا۔

''اُدھر کِدھر!'' جاوید اثر نے ہمت کر کے پوچھا۔

''اُدھر.. درّہ بابوسر کے پار گلگت کی طرف.. اور وہاں سے ہنزہ..''

''ہنزہ؟'' سب کے منہ کھل گئے۔ ہم نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا۔

''ہاں ہُنزہ.. جہاں یہ رہتی ہے۔'' اس نے پھر جیکٹ کی جیب کو تھپکا۔

ہم پھر چپ ہو گئے۔

''جہاں کون رہتی ہے بھائی صاحب؟'' بالآخر میں نے زبان ہلائی۔

اس نے وہیں لیٹے لیٹے ہم سب کے چہروں کو باری باری دیکھا۔ جیسے یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ کیا ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور پھر جیکٹ کی زِپ کھول کر اُس میں سے ''نیشنل جیوگرافک میگزین'' کا ایک شمارہ نکالا اُسے اس طرح کھولا جیسے فال نکالنے کو ہو اور پھر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم سب اس پر جھک گئے.. تجربہ جہاں انسان کو شعور دیتا ہے، پختگی دیتا ہے وہاں اس کی بنیادی حسیّات کو بھی کُند کر دیتا ہے.. پتہ نہیں شعوری پختگی کے اِن دنوں میں اگر میں اُس تصویر کو دیکھوں تو وہ مجھے صرف ایک عام سی لڑکی دکھائی دے.. لیکن اُن دنوں اُس ویران پہاڑی سلسلے کے درمیان جہاں ڈھلوانوں پر سرد لبوں کے بوسے ہوا تھی.. کاغذ پر چھپی اُس رنگین تصویر نے ہم سب کو قید کر لیا، ہمارے دلوں کو کھینچا کہ آؤ میرے پاس آؤ، میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں، کیا تم نے مجھ ایسی کوئی دیکھی.. اور ہم سب اُسے دیکھ کر قدرے ابنارمل ہو گئے اور ہماری شریانوں میں دوڑتا تمام تر خون ہمارے چہروں میں سے پھوٹنے لگا۔ ہمارے ہونٹ کپکپائے، حلق خشک ہوئے اور شاید ہمیں بخار بھی ہو گیا۔

''میں صرف اس لڑکی کو دیکھنے ہنزہ جا رہا ہوں۔'' اس نے تصویر پر جھکے ہمارے سَروں کو پرے کیا اور میگزین اُٹھا کر پھر سے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اپنا مختصر سامان اُٹھایا اور بغیر سلام دعا کے درّہ بابوسر کی جانب اُٹھتے ہوئے راستے پر چل دیا۔

ہم اُسے دیکھتے رہے۔ایک شدید حسد کے جذبے کے ساتھ کہ یہ جا رہا ہے..اور اُسے دیکھے گا۔

"پاغل ای اوئے۔" موچی دروازے کے ایک لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔

"یہ مرجائے گا یقیناً.." جاوید اثر کہنے لگا۔

"لیکن یہ ہنزہ ہے کہاں؟"

"ہنزہ؟"

"ہنزہ؟"

"پتہ نہیں۔"

اقتباس "ہنزہ داستان"

وہ ہنزہ جا رہا تھا..

اور ہم تو بالاکوٹ، ناران اور سیف الملوک سے بھی آگاہ نہ تھے تو اس ہنزہ کے بارے میں ہمیں کیا پتہ کہ کہاں ہے..ہے بھی یا نہیں..

ہُنزہ کے اس تنہا مسافر نے کچھ دیر کے لیے ہمیں رنج والم سے آزاد کر دیا اور اُس کے جاتے ہی ہمارے دوبارہ چلتے ہی رنج والم کے پہاڑ ہم پر پھر سے ٹوٹ گرے..

وہی چھالے تھے اور وہی درد بھرے نالے..اور ہمارے ان نالوں کے جواب میں ایک سچ مچ کا تیز رفتار انتہائی شدومد سے بہتا ہوا پہاڑی نالہ ہمارے راستے میں آ گیا..اور اس کے جھاگ اُڑاتے پانیوں میں جہاں کہیں کوئی گیلا پتھر نمودار ہوتا، ہم اُس پر بُوٹ جما کر پار اُترنے کی کوشش میں تھے جب شفیق..جی ہاں وہی شفیق جو لاہور ریلوے سٹیشن کے برآمدے میں ایک سیاہ اوپلی ریکارڈ میں سے اُترا تھا جب اس نالے میں اُترا ایک پتھر پر پاؤں رکھا تو فی الفور پھسلا اور خلاء کا مسافر ہوا اور پانیوں میں گر گیا۔لڑھک کر بے اختیار ہاتھ پاؤں مارتا اُن میں بہنے گا اور ہم سب دس کے دس بلکہ وہ دسواں تھا تو باقی رہ گئے نو..تو ہم نو کے نو نالے کے کنارں پر اُس کے برابر میں بھاگتے شور مچاتے اُسے ہمت دلاتے کہ فکر نہ کرو، فکر نہ کرو..اور وہ غریب فکر تو کیا کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔بس لکڑی کے ایک بے جان شہتیر کی مانند پانی میں بہتا جا رہا تھا

تا آنکہ ایک بڑے پتھر کی رکاوٹ نے اُسے روک لیا اور ہم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اُسے باہر گھسیٹ لیا..اُس کا سرخ وسفید چہرہ نیلا پڑ چکا تھا، ہونٹ سیاہ ہو رہے تھے اور شیرے میں پھنسی تتلیوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے اور اُن میں سے ایک آواز آتی تھی "ہائے امی جی میں مر گیا۔"

اُس کا پورا بدن خون آلود خراشوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا..چنانچہ اُسے ایک ٹٹو پر لاد دیا گیا اور ہم سب نے فوراً حساب کیا کہ باقی کتنے ٹٹو یا گدھے ہیں..کیا ایک اور ناگہانی حادثے کی صورت میں ہمارے حصے میں بھی کوئی ٹٹو آ جائے گا..

نہیں..ٹٹو اور گدھے کم تھے اور ہم زیادہ تھے۔

بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی..

نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی پگڈنڈی..جدھر جدھر خواجہ صاحب اور گدھے چلتے تھے ہم سر جھکائے اُدھر اُدھر چلتے جاتے تھے..

اس عظیم الشان کوہستانی مُہم کی منصوبہ بندی میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اول تو جہاں کہیں ڈاک بنگلے موجود ہوں گے ہم اُن میں شب بسر کریں گے اور اگر ویرانوں میں کوئی رات آئے گی تو ہم کسی دوستی بھرے گاؤں میں ٹھہر جائیں گے اور سادہ منش گاؤں والوں کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں گے۔اسی لیے گدھوں وغیرہ پر صرف سامانِ خوردونوش لدا تھا، کسی خیمے یا ٹینٹ وغیرہ کا کوئی تردّد نہ تھا..یوں بھی اُن زمانوں میں کوہ نوردی کی راتیں بسر کرنے کے لیے ایسے ٹینٹ ایجاد نہ ہوئے تھے۔اگر ہوئے تھے تو وہیں کہیں یورپ وغیرہ میں ہوئے تھے، پاکستان میں تو ٹینٹوں کی جو واحد قسم مارکیٹ میں میسر تھی، اُنہیں شامیانے کہا جاتا تھا جو شادی بیاہ یا فوتیدگی کے موقعوں پر ایستادہ کیے جاتے تھے..اور اُنہیں قابل فہم طور پر پہاڑوں میں نہیں لگایا جا سکتا تھا..

اُس پہلے دن کی کوہ نوردی کے دوران ہمارے راستے میں جو دو ایک دیہات آئے یعنی دو چار کوٹھڑیوں پر مشتمل دیہات..اُن کے مکین کچھ زیادہ فرینڈلی نہیں تھے..وہ ہمیں دیکھتے ہی اُس گاؤں کی کُل آبادی یعنی دس بارہ افراد ہمیں دیکھتے ہی شور مچانے لگتے اور اپنے گھروں سے فرار ہو کر پہاڑیوں میں روپوش ہو جاتے..ہمیں بے حد دُکھ ہوتا کہ یہ کیسی مسلم اُمّہ ہے جو ہمارے دُکھ درد میں شریک ہونے کی بجائے ہمیں پناہ دینے کی بجائے قلانچیں بھرتی پہاڑوں میں غائب ہو جاتی ہے..

پھر ہمارے ان علاقوں کے شناسا باورچی نے یہ عُقدہ حل کیا۔

یاد رہے کہ ہم سب آدمی بوٹس اور سویٹروں میں ملبوس تھے.. خاکی پتلونیں پہنے ہوئے تھے اور ہمارے ہمراہ ٹٹو تھے، سامان سے لدے ہوئے تو وہ ہمیں فوج سمجھتے تھے.. وہ اپنے جھونپڑے ترک کر کے اس لیے غائب ہو جاتے تھے کہ یہ علاقہ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی سرحد کی قربت میں تھا اور پاک فوج ادھر اکثر گشت کرتی آنکلتی تھی اور اس دوران محب الوطنی اور وطن کے دفاع کے نام پر ان نادار دیہاتیوں کی مرغیاں اور انڈے اور کبھی کبھار بھیڑیں اور بکریاں اُن کی ''رضامندی'' سے معمولی قیمت پر خرید لیتی تھی۔

اس لین دین میں کوئی قباحت تو نہ تھی۔

بنیادی مسئلہ صرف یہ تھا کہ تہذیب اور شہری آبادیوں اور جس سرزمین کو وطن کہا جاتا ہے، یہ لوگ اُس سے بہت اور الگ تھلگ سینکڑوں برسوں سے ایک پس ماندہ محض خوراک اور ایک چھت کی تگ و دو میں زندگی گزارتے چلے آئے تھے کہ جہاں برسوں کے بعد یہ خبر پہنچتی تھی، اب اُدھر مغل بادشاہ ہیں... اب گورا لوگ کا حکم چلتا ہے اور اب ہم آزاد ہو گئے ہیں اور گورا کی بجائے کالا صاحب حکمران ہے.. تو ان لوگوں کی کل کائنات چند بکریاں اور مرغیاں تھیں کہ سنگلاخ زمین اُن کے لیے بانجھ تھی، خوراک پیدا کرنے سے قاصر تھی۔ وہ اگر محب الوطنی اور مسلمانی کے نام پر انہیں مناسب قیمت پر فروخت بھی کر دیں تو وہ کرنسی نوٹوں کو جیب میں سنبھال کر اُن کا کریں گے کیا..

اُن میں سے بیشتر اس وادی سے باہر نہیں گئے تھے..

جو بہت جہاں دیدہ تھے وہ ناران کے ڈاک بنگلے کے قصے بیان کرتے تھے اور اُن میں سے کسی ایک نے کبھی جیپ پر سواری کی تھی اور اس کائنات کے آخری سرے پر واقع کسی بالاکوٹ کی کہانیاں سناتا تھا۔ وہ کیسے جان سکتے تھے کہ تقریباً نصف صدی کے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اُن کے کھیتوں کی پیداوار کراچی، پشاور اور لاہور کی سبزی منڈیوں میں موتیوں کے بھاؤ فروخت ہو گی اور اُن میں سے کچھ کے ہاں ذاتی جیپیں ہوں گی..

جب شام ہوئی..

اور ہم بے آسرا کوئی آسرا تلاش کرتے تھے تو چند کوٹھڑیوں پر مشتمل پہاڑوں میں دبکا ایک گاؤں نظر آیا تو ہم اُس میں بے دریغ داخل نہ ہوئے..

باہر ہی رُک گئے..

اپنے آپ کو۔ گدھوں اور خچروں کو روک لیا.. اور جب اندھیرا چھا گیا تو ہم دبے پاؤں چوروں کی مانند اُس میں داخل ہوئے تا کہ کسی بھی گاؤں والے کو فرار ہو جانے کا موقع نہ ملے۔ لیکن جونہی اُنہوں نے ہمیں تاریکی میں سے نمودار ہوتے، اپنے پتھریلے جھونپڑوں پر اُترتے دیکھا تو اُنہوں نے بگٹٹ بھاگ نکلنے کی کوشش کی اور ہم نے اُنہیں دبوچ لیا.. یقین دلایا کہ ہم ہرگز فوجی نہیں ہیں.. مسافر ہیں اور گاؤں کے چار جھونپڑوں سے ذرا پرے ندی کنارے جو ایک پتھریلی کوٹھڑی ہے جو کہ ایک مسجد ہے۔ بس اُس میں ایک رات گزارنا چاہتے ہیں کہ ہم تو بہت ہی بے چارے اور بے سہارے ہیں.. سردی بہت ہے تو رات گزاریں گے اور کل سویرے یہاں سے دفع ہو جائیں گے۔

اگرچہ ہم فوجی نہیں تھے تو کیا تھے.. یہ اُن کی سمجھ میں کیسے آ سکتا تھا.. اور نہ آیا اور وہ پُرتشویش رہے..

''ہم کوہ نورد ہیں.. ہائکر ہیں۔'' شفیق جو اپنی خراشیں سہلاتا ابھی تک ٹٹو پر پڑا تھا سینے پر مکا مار کر بولا۔ ''لاہور سے آئے ہیں.. آپ کا علاقہ دیکھنے آئے ہیں۔ رتی گلی جائیں گے۔''

اُن سب کے چہرے بے یقین تھے کہ یہ لاہور اگر کہیں ہے تو یہ وہاں سے یہاں آئے کیوں ہیں؟

بہرحال اُن سادہ رُوحوں نے ہمیں واقعی اپنی من مرضی سے دو مرغیاں تحفے کے طور پر پیش کیں جنہیں ہمارے باکمال باورچی نے دیگچے میں اس ہنر سے پکایا کہ اُن کی اور جلیٹی برقرار رہی.. گوشت ٹس سے مس نہ ہوا.. جوں کا توں کچی حالت میں رہا اور اس کے باوجود ہم نے اُنہیں نہایت رغبت سے کھایا۔

اور وہ جو پہاڑوں میں پہلی رات تھی۔

اُس پتھریلی کوٹھڑی کے کچے فرش پر بچھی خشک گھاس پر.. اور اُس میں اتنی بلاخیز مہیب اور ہولناک سردی تھی کہ ہم بے دریغ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر کچھ گرمی حاصل کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرتے تھے.. اور بار بار اپنے کمبل یا سلیپنگ بیگ میں سے نکل کر سرد ترین دُھند آلود رات میں کوٹھڑی سے باہر آ کر بار بار جا بیٹھتے تھے کہ ہم سب کے معدے باغی ہو چکے تھے، جانے

کیا کھایا تھا کہ اندر فتور برپا ہو چکا تھا اور بس میں نہ تھا..

اگر مسجد کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو ہم کاہے کو اتنا تردّد کرتے.. بے جھجک وہیں کوٹھڑی کے اندر ہی فراغت حاصل کر لیتے۔

تو شب بھر یہی آنا جانا لگا رہا..

اور نزدیکی ندی کے پانیوں سے فراغت کے بعد ہم جو طہارت حاصل کرتے تھے تو ہمارے زیریں حصے ٹھنڈے ٹھار اور برف بار ہو جاتے تھے..

اگر کسی لمحے نیند مہربان ہونے کو ہوتی تو اُسی لمحے کوئی ایک لڑکا اپنے کمبل میں سے اُچھل کر پیٹ پر ہاتھ رکھے ہاؤ ہو کرتا بگٹٹ بھاگتا باہر کی رات میں روپوش ہو جاتا۔

چنانچہ شب بھر رہا چر چاترا..

''ہم ایک جنّتِ گُم گشتہ میں اُترتے ہیں ایک روسٹ دُنبے کے لیے''

اور پھر ایک سویرا آ گئی....

اگلی سویر..

ذرا تاریکی مدھم ہوئی تو اُس کے برابر کی مدھم روشنی پھیلی۔ ہم اُس پناہ گاہ میں سے ٹھٹھرتے کانپتے گرتے پڑتے باہر آئے کہ ہم شب بھر کی دھما چوکڑی سے قدرے لاغر ہو چکے تھے.. باہر آئے تو دُھند میں داخل ہو گئے..ڈھلوان پر جو چند پتھریلی آماجگاہوں پر مشتمل گاؤں تھا وہ دُھند میں ڈوبا ہوا تھا.. کبھی یوں ڈوبتا کہ روپوش ہو جاتا اور کبھی دُھند کی ایک باریک تہہ اُس کے چہرے سے سرکتی تو وہ دکھائی دینے لگتا..مویشی جو سرسبز ڈھلوانوں پر چرتے تھے، بہت آہستگی سے حرکت کرتے تھے جیسے ایک خواب میں ہوں..گاؤں کے باسی روزمرہ کے کاموں میں جُتے ہوئے قدیم داستانوں کے پُرفسوں کرداروں کی مانند دُھند کی گھنی سفیدی میں سے کبھی دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگتے اور کبھی اُس میں گم ہو جاتے اور اُس گاؤں سے پرے جو سرسبز وادی تھی اُس کے آخر میں ایک چوٹی نظر آ رہی تھی، ازلی برفوں سے ڈھکی جو... رتّی گلی تھی..

اس منظر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہم سے قوتِ گویائی چھین لی اور ہم گونگے ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ ہم نے اپنی ''طویل'' سترہ سالہ زندگی میں اتنی ڈھیر ساری برف نہ دیکھی تھی یا تو انگریزی شاعری اور ناولوں میں اس کا تذکرہ پڑھا تھا اور یا پھر بیڈن روڈ پر برف دیکھی تھی۔ یہ نہیں کہ اُن زمانوں میں لاہور کی بیڈن روڈ پر خاص طور پر برف پڑا کرتی تھی بلکہ وہاں

فیروز قصائی کے برابر میں ہمارا برف والا بیٹھتا تھا اور اُس کے سامنے برف کے بلاک ہوتے تھے، جنہیں وہ ایک سُوئے کی مدد سے سیر یا آدھ سیر کے ٹکڑوں میں توڑ کر ہمارے دسترخوان یا کپڑے میں لپیٹ کر دیتا تھا اور ہم پگھلتی ہوئی برف تھامے بھاگتے ہوئے گھر جاتے تھے اور اُس نایاب ٹکڑے کو ایک ٹاٹ میں لپیٹ کر محفوظ کر لیتے تھے..

تو جن آنکھوں نے برف کے ایک دو بلاک ہی دیکھ رکھے ہوں، اُن کے سامنے اگر برف کی ایک بلڈنگ آ جائے تو وہ گُنگ نہ ہوں گے تو اور کیا ہوں گے۔

رتّی گلی کی چوٹی پر تو برفوں کے انبار تھے۔

چوٹی کے پہلو میں سے اُٹھتی ہوئی ایک سُرخ رنگ کی ننگی چٹان تھی۔ اُس پر برف کا ایک ذرّہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ چوٹی سے بھی بلند تھی..

اسی سرخ رنگ کی چٹان نے اس چوٹی اور اس وادی کو رتّی گلی یعنی سُرخ گلی کا نام دیا تھا.. ہمارے ہاں جو ٹھیٹھ پنجابی بولتے ہیں وہ سُرخ رنگ کے لیے سُوہا یا رتّا کا لفظ استعمال میں لاتے ہیں۔ رتّا بھی رَت یا خون کے حوالے سے سُرخ..

اس دل کو قابو کر لینے والے بڑی شان والے منظر کی اُبلتی ہوئی مسرت میں البتہ دُکھ کا ایک سندیسہ تھا.. یعنی شفیق جو برفانی نالے میں گر گیا تھا اور جس کا بدن خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ٹٹو پر سوار ہو کر یہاں تک پہنچ تو گیا تھا لیکن پوری رات تیز بخار میں پھنکتا ہذیانی کیفیت میں مبتلا رہا تھا۔ آج سویر اُس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ ہمارا ساتھ دے سکے، اُسے طبّی امداد کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اُسے ایک ٹٹو پر لاد کر ایک پورٹر کے ہمراہ واپس ناران روانہ کر دیا گیا۔

ظاہر ہے ہم سب بُجھ گئے..

اُس کی روانگی نے ہم پر بہت اثر کیا۔

اور سب سے زیادہ ہمارے سینئر ممبر جاوید اثر پر بہت اثر کیا جس نے ٹیم کے ہر ممبر کے کان میں سرگوشی کی کہ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا.. ایک ایک کر کے سبھی واپس جائیں گے اور جو آخر میں جائیں گے وہ پیدل جائیں گے کیونکہ ٹٹو ختم ہو جائیں گے۔

اُس دُھند آلود گاؤں سے نکلتے ہی شفیق کی روانگی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے مُہم کے تمام اراکین نے بغاوت کر دی.. اور خواجہ صاحب کو مطلع کر دیا کہ ہم اس پوزیشن میں ہی

نہیں کہ اپنا سامان خود اٹھا سکیں اور چل سکیں.. یہاں تک کہ ہم اپنے رُک سیک اور آئس ایکس بھی نہیں اٹھائیں گے۔ آپ اگر گورنمنٹ کالج لاہور میں فزیکل انسٹرکٹر ہیں تو ہوں گے.. یہ لاہور تو نہیں.. پتہ نہیں کیا ہے.. خواجہ صاحب جانے کیوں فوراً موم ہو گئے اور ہمارا بوجھ بھی خچروں پر بوجھ کر دیا گیا..

اگرچہ ہم بوجھ سے فارغ ہو گئے.. ہلکے پھلکے ہو گئے لیکن پاؤں کے اُن چھالوں کا کیا کرتے جن پر بہار آ چکی تھی، وہ پک گئے تھے اور اُن میں سے ایسی درد آمیز ٹیسیں اُٹھتی تھیں کہ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے اور نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے، نبردِ عشق میں ہم یوں زخمی ہو گئے.. میرے نصیب میں ان چھالوں کے سوا ایک اور اذیت بھی تھی.. کہ میرے ایک پاؤں میں تو نو نمبر کا فوجی بوٹ تھا اور دوسرے پاؤں میں گیارہ نمبر کا بُوٹ فِٹ تھا اور میں ایک ایسے کنگرو کی مانند اُچھلتا اور لنگڑاتا چلتا تھا جو لارڈ بائرن کی چال سے متاثر شدہ تھا..

ہم اک حالتِ تباہی میں گرتے پڑتے چلتے گئے اور چلتے ہی گئے۔

مجھے یاد نہیں کہ اُس وادی کا آس پاس کیا تھا۔ کہاں سے اور کس مقام سے گذرے کہ ہم تو بس جیسے اس جہاں سے گذرتے تھے..

اور جب شام ہوتی ہے اور ہماری ہڈیوں کے گودے میں اُس کی کافر سردی سرایت کرتی ہے اور سامنے رتّی گلی کی چوٹی سورج کی آخری کرنوں میں نمایاں ہوتی ہے اور پھر یکدم سیاہ ہونے لگتی ہے.. اور ہمارے خچر بھی ہمت ہارتے ہیں.. سُست ہوتے ہیں.. یہاں تک کہ خواجہ صاحب بھی گرتے پڑتے ہیں.. تب ہم ایک عجیب انہونے.. یقین کی حدوں سے پار.. ایک سحر طراز منظر میں اُترتے ہیں..

سرِ شام ہم ایک ایسی وادی میں اُترے جو ایک جنّت گم گشتہ تھی۔

ایک پیراڈائز لاسٹ تھی..

ہم ایک ایسے سامری سحر طراز منظر میں اُترے..

ایک ہرا بھرا.. گھاس سے بھرا.. ہرا کچور وادی میں گھرا ایک میدان تھا.. جس میں ہم اترے..

اور ایک بلند وادی کی آغوش میں پھیلے اس نکھرتی سبز گھاس والے میدان میں کہیں کہیں چٹانیں رکھی ہوئی تھیں جن کا حجم مختصر تھا..

چٹانیں نہ سہی بڑے بڑے پتھر تھے رکھے ہوئے..

یوں جیسے ایک جاپانی یا چینی باغ کی سجاوٹ کے لیے اُنہیں ایک خاص بے ترتیبی سے جا بجا سجایا گیا ہو۔

کیا قدرتی زیبائش تھی..

جیسے کسی چینی کیلنڈر میں سے زندہ ہو جانے والا ایک غیر حقیقی منظر۔

یہ منظر یونہی بے دھیانی میں وجود میں نہیں آ گیا تھا۔

جیسے اس ترتیب میں سب سے پہلے تو پورے میدان میں گھنی سبز باس کی ہری بھری گھاس بچھا دی گئی ہو اور پھر کہیں کہیں اُس پر یہ مختصر چٹانیں رکھ دی گئی ہوں تا کہ یہ قالین تیز سرد ہواؤں سے اُڑ نہ جائے..

میدان محض گھاس اور چٹانیں نہ تھا.. بے جان نہ تھا..ان آرائشی اور مختصر زیبائش والی چٹانوں کے آس پاس گوجروں کے بکریوں کی اُون سے بنے ہوئے سیاہ خیمے گھاس کی ہریاول پر سیاہ پرندوں کی مانند آرام کرتے تھے..اور ان خیموں کے گرد بکھرے ہوئے مال مویشی تھے.. بھیڑیں۔ بکریاں اور دُنبے گھاس میں تھوتھنیاں جمائے جبڑے چلاتے تھے..

اور صرف سیاہ خیمے نہ تھے..محض جانور نہ تھے جو اس منظر میں زندگی بھرتے تھے بلکہ..

جگہ جگہ الاؤ جلتے تھے..

سرِ شام جب ہم اس دنیا کے کسی بھی نقشے پر ناموجود ایک گمشدہ فردوس برروئے زمیں میں اُترے تو اس منظر کی سب سے تابناک یاد وہ تین چار الاؤ ہیں جو چٹانوں کی اوٹ میں بھڑکتے تھے، روشنی بکھیرتے تھے.. یوں جلتے تھے کہ اُن کی حدّت سے آس پاس پھیلی ہلکی سردیلی دُھند پگھلتی تھی..

گوجر خانہ بدوشوں نے جب ہمیں..یعنی بابو لوگوں کو..شہر کے باسیوں کو جو فوجی بھی ہو سکتے تھے ایک ڈھلوان پر سے سرِ شام گرتے پڑتے اپنی پرائیویٹ جنت میں اُترتے دیکھا تو وہ بھی ہراساں ہو کر اپنے سیاہ خیموں میں روپوش ہو گئے..وہ خوفزدہ ہونے والے لوگ نہ تھے محض

احتیاط کر رہے تھے اور ایک مختصر پردہ پوشی کے بعد اُن کا اشتیاق غالب آ گیا کہ دیکھیں تو سہی کہ یہ سر پھرے اجنبی کون ہیں اور ادھر کیسے آ نکلے ہیں..اور وہ خیموں کے پردوں میں سے جھانکنے لگے اور جب اُنہیں احساس ہوا کہ یہ لوگ یہاں سے گذر کر آگے جانے والے نہیں، رُک جانے والے ہیں کیونکہ یہ تو ٹھہر گئے ہیں اور گدھوں اور خچروں کی پُشت پر سے اپنا سامان اُتار کر گھاس پر ڈھیر کرتے ہیں، جانے والے نہیں..تو وہ کچھ ڈرے ڈرے سے..اور اپنے تئیں قدرے خونخوار شکلیں بنائے خیموں سے باہر آ گئے..

شاید یہ ہماری بے چارگی اور خستگی تھی.. چہروں پر جو یتیموں ایسی بے بسی اور بدن کی ٹوٹ پھوٹ تھی جو اُنہوں نے جان لیا کہ ان سے کوئی خدشہ نہیں..یہ بے ضرر اشیاء ہیں۔ چنانچہ ہم پر ترس کھا کر وہ فوراً نہایت مددگار اور دوست ہو گئے..خشونت اور غصے کو اپنے چہروں سے رخصت کیا اور ہمدرد ہو گئے..

ویسے بھی اُنہوں نے مشاہدہ کیا کہ ہم خچروں سے سامان اُتارنے کے بعد جہاں کہیں تھے، کھڑے نہیں رہے..گر گئے..بے سُدھ ہو گئے۔

اُنہوں نے فوری طور پر بکری کے دودھ سے لبریز ایک بالٹی ہماری خدمت میں پیش کی جس میں ہم نے اپنے تام چینی کے مگ ڈبو کر اُنہیں بھرا اور پھر پیا..اور کیسے پیا یہ تو ہمارا ربّ جانتا ہے..بے شک ہم پیاسے بھی تھے اور بھوک سے نڈھال بھی تھے لیکن بکری کے دودھ کا ذائقہ صرف وہی جانتا ہے جس نے کبھی بکری کا دودھ پیا ہو..اور بکری بھی ایسی جو متعدد بکروں سے میل جول کے باوجود کبھی نہائی نہ ہو..

وہ ہمارے مسمار شدہ بدنوں کے اردگرد کمبل اوڑھے بیٹھ گئے۔

''صاحب کہاں سے آیا ہے؟''

''لاہور سے آیا ہے..'' خواجہ صاحب ہمارے واحد ترجمان تھے۔

''لاہور؟'' وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے..شاید وہ اس شہر سے آگاہ نہ تھے۔

''اُدھر ناران سے آگے ایک شہر ہے۔''

''ہاں لاہور..'' اُن میں سے ایک نوجوان گوجر کا چہرہ دہک اٹھا۔ ''میرا ایک دوست اُدھر بکری لے کر گیا تھا..وہ کہتا تھا کہ اُدھر گندم کا روٹی ہوتا ہے..ڈبے میں گھی ہوتا ہے اور بجلی ہوتا

ہے..ہوتا ہے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر اُس کو چھوڑ کر اِدھر کیوں آ گیا ہے؟''

اب یہ سوال.. کہ لاہور کو چھوڑ کر اِدھر کیوں آ گیا ہے.. قدرے پیچیدہ تھا..

ہم ایک دو روز میں ہی بے حد سیانے ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ اگر ہم نے حقیقت بیان کر دی.. سچ کہہ دیا کہ ہم تو کوہ نورد ہیں.. ہماری یہاں آمد کا کوئی مقصد نہیں سوائے پہاڑوں میں ذلیل و خوار ہونے کے.. تو یہ یقین کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں.. اُن کے نہایت وحشی اور بے مُہار تصوّر میں بھی یہ نہیں آ سکتا کہ ہم لاہور کی گندم کی روٹی.. ڈبّوں میں بند گھی اور بجلی جیسی نعمتوں اور لذتوں سے کنارہ کش ہو کر جان بوجھ کر ان پہاڑوں میں محض سیر سپاٹے کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ اس.. اِدھر کیوں آ گیا ہے.. کہ سوال کے بعد ہر سُو ایک اَیسی خاموشی چھا گئی جس میں الاؤ میں تڑختی شرارے اُڑاتی لکڑیوں کی آواز کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا..

ایسی خاموشی تھی جس میں نالے بہت بلندی تک جا سکتے تھے..

تب اپنے خواجہ صاحب جو دیگر اراکین کے ہمراہ گھاس پر دراز تھے، وہ بمشکل اٹھے اور اس خاموشی میں اُن کی پاٹ دار آواز نے پردہ چاک کیا۔ ''برادران.. ہم بھی آپ کی طرح نہایت راسخ العقیدہ مسلمان لوگ ہیں.. ہم اچھے بھلے لاہور میں رہتے تھے اور پھر کسی کامل درویش نے ہمیں بتایا کہ اگر آپ وادی کاغان سے آگے بوڑاوائی کے مقام سے دائیں جانب پہاڑوں کے اندر سفر کریں تو وہاں رتّی گلی کی برفوں کے سائے میں ایک پیر کامل دفن ہیں۔ اُن کا مزار ہے.. زیارت ہے.. چنانچہ ہم تو اتنی دور سے چل کر.. جان پر کھیلتے.. صعوبتیں برداشت کرتے صرف اس لیے یہاں تک آئے ہیں کہ اُس زیارت پر حاضری دے کر پیر صاحب کو سلام پیش کریں.. ہمارے اس طویل سفر کا بس یہی پاکیزہ اور پُرنور مقصد ہے ورنہ لاہور چھوڑ کر یہاں کون آتا ہے..''

ہم سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے..

کیونکہ ہم تو اس پاکیزہ اور پُرنور مقصد سے آگاہ نہ تھے۔

کونسی زیارت.. کیسے پیر صاحب..

پھر خواجہ صاحب نے ہم سب کو باری باری گھورا کہ جانتے نہیں کونسی زیارت اور

کونسے پیر صاحب.. اور ہم جان گئے کہ یہ خواجہ صاحب کی کرامات تھیں.. اُنہوں نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ رتّی گلی کے دامن میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ کسی پیر بابا کے معتقد ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سمیت ہم سب کو اس پیر غائب کے مُرید ڈیکلیئر کر دیا تھا..

ہم نہایت روحانی انداز میں سر ہلاتے رہے..

گوجر حضرات تو یہ ڈیکلریشن سُن کر ایک وجد آور سناٹے میں آ گئے کہ یہ موٹے سے بزرگ اور ان کے ہمراہ جو درجن بھر چھریرے سے مُنڈے ہیں لاہور سے صرف اس لیے چل کر آئے ہیں کہ ہمارے پیر کے آستانے پر حاضری دیں یعنی یہ تو ہمارے پیر بھائی ہیں تو اس اطلاع کے بعد اُن معصوم روحوں نے صرف ہمارے قدموں کو نہیں چُھوا اس کے سوا عقیدت کے اظہار کا کوئی اور طریقہ ایسا نہ تھا جو اُنہوں نے ہم پر برتا نہ ہو.. بس ہمیں بھی چھوٹے چھوٹے پیر مان لیا..

ہمیں الاؤ کے سامنے بہترین جگہ پر بٹھایا گیا تا کہ ہم اپنے ٹھٹھرے ہوئے اجسام کو ہوش میں لائیں۔ ہم سے گذارش کی کہ وہ ہمارے تھکے ہوئے بدنوں کو دبا کر.. اُن کی مٹھی چاپی کر کے ہمیں آرام اور فرحت سے روشناس کروانا چاہتے ہیں اور اُنہوں نے اتنا بھی انتظار نہ کیا کہ ہم مغل اعظم کے انداز میں ہاتھ لہرا کر ''اجازت ہے'' ارشاد کرتے اور تقریباً زبردستی ہمارے اکڑے ہوئے بدنوں کو دبانے لگے۔ اس دوران کچھ لڑکے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے کہ انہیں گدگدی ہوتی تھی اور ایک دو لڑکے گوجروں کی نیّت پر شبہ کرتے کچھ کچھ غیر محفوظ بھی محسوس کرتے تھے..

اور صرف یہی نہیں..

نہایت احترام سے.. ایسے کہ ہمیں خبر نہ ہوا گرچہ ہم کن اکھیوں سے سب خبر رکھتے تھے، اُنہوں نے وادیٔ کاغان کا سب سے فربہ اور پلا ہوا دُنبہ ہمارے اعزاز میں ذبح کیا اور اب وہ ایک الاؤ پر بھونا جا رہا تھا..

ذرا تصوّر تو کیجیے کہیں بلند پہاڑوں میں گھرے دُور دراز کے ایک سبز گھاس اور مختصر چٹانوں والے میدان میں رتّی گلی کی برفوں کے دامن میں.. ہم مزے سے گھاس پر استراحت فرماتے تھے جب کہ ہمارے بدن تھائی لینڈ کی حسینائیں نہ سہی نیم وحشی گوجر حضرات دباتے تھے اور عقیدت سے دوہرے ہوئے جاتے تھے اور شام کے بعد رات ہو چکی تھی اور ہم اپنے اوپر پھیلے نزدیک ہو چکے آسمان کو تکتے تھے جس میں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس گھاس بھرے میدان میں گرتے تھے

اور ہمارے نتھنوں میں الاؤ پر روسٹ کیے جانے والے دُنبے کی سلگتی چربی کی خوشبو دُھومیں مچاتی تھی اور ہوائیں سرد تھیں.. یہ کچھ تو ایک جنت ارضی میں ہی ممکن تھا اور ہم وہاں پہنچ گئے تھے..

آج سینتالیس برس بیت چکے ہیں..

اور آج بھی میں اس منظر کی کیفیت کی کیسٹ اپنی یادداشت پر چلاتا ہوں تو میرے نتھنوں میں سرد ہوا محسوس ہوتی ہے اور اُس دُنبے کے روسٹ ہونے کی مہک تیرنے لگتی ہے۔

اُس شب ہم خانہ بدوشوں کے سیاہ خیموں میں ایسے مدہوش اور بے جان سوئے جیسے لکڑی کے شہتیر ہوں کہ روسٹ دنبے کے گوشت کی گرمی نے ہمیں بے سُدھ کر دیا تھا..

اور سیاہ خیموں کے گرد الاؤ جلتے تھے..

اور اگلی سویر..

اور حیرت در حیرت جب اگلی سویر ہم بیدار ہو کر خیموں سے باہر آئے تو اُس گھاس بھرے چٹانوں سے آراستہ میدان کی سحر انگیزی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی بلکہ اُس میں دُھند کے اضافے نے اُسے مزید پُرفسوں کر دیا تھا۔ سوائے اس کے کہ الاؤ راکھ ہو چکے تھے..

سیاہ خیمے، چٹانیں، ہمارے گدھے اور ہم دُھند کے شہر میں تھے جس کی سفید ٹھنڈک ہمارے رخساروں پر اپنے سرد لب رکھتی تھی..

گوجر مہمان نوازوں نے بہت اصرار کیا کہ ہم کم از کم ایک اور شب تو ٹھہر جائیں.. اُنہیں ایک اور شب کے لیے شرف میزبانی بخش دیں لیکن ہم نے بھی بہت اصرار کیا کہ نہیں ہم پیر صاحب کو سلام کرنے کے لیے اتنے بے چین اور مضطرب ہیں کہ اب صبر کا یارا نہیں.. اب جدائی سہی نہیں جاتی..

پہلے تو اُن کا پورا قبیلہ ہی کمر بستہ ہو گیا کہ صاحب ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلیں گے کیونکہ ہمیں بھی زیارت کیے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے.. لیکن اُن کی یہ کمر بستگی ہمارے لیے تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھی.. ایک تو یہ کہ پیر صاحب کی ابدی آرامگاہ کسی اور سمت میں بتائی جاتی تھی اور ہم نے کسی اور ہی سمت جانا تھا. علاوہ ازیں اگر ہم اُن کی میزبانی کے تشکر میں اُن سب کی رفاقت قبول

بھی کر لیتے تو پیر صاحب کی زیارت کے بعد وہ ہمیں رتّی گلی چوٹی تک تو نہ جانے دیتے.. واپس اپنے ساتھ یہیں لے آتے اور ایک اور دُنبہ روسٹ کر لیتے۔

چنانچہ یہاں بھی خواجہ صاحب کام آئے اور انہوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنا کر اُنہیں اجتماعی طور پر ہمارا ساتھ دینے سے باز رکھا اور پھر بھی انہوں نے ایک نوجوان گوجر کو بطور گائیڈ ہمارے ساتھ نتھی کر دیا..

اور اُس نوجوان عقیدت سے لبریز گائیڈ کو اُس کی خانہ بدوشی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا تب لگا جب ہم نے اُس جادوئی چراگاہ سے اتنے فاصلے پر جا کر.. جہاں ہمیں یقین تھا کہ گوجروں کا پورا قبیلہ بھی اگر ہمارے تعاقب میں نکل پڑا تو ہمیں پکڑ نہیں سکتا، ہم نے اُس مہربان گائیڈ کو تھوڑا سے ڈرایا، تھوڑا سا دھمکایا کہ بھائی میاں اب چلتے پھرتے نظر آؤ.. یعنی غائب ہو جاؤ..

"صاحب زیارت پر نہیں جائے گا؟" اُس نے پریشان ہو کر پوچھا..

"جائے گا لیکن خود ہی جائے گا۔"

"لیکن زیارت تو اُدھر ہے۔ آپ تو پتہ نہیں کدھر جاتا ہے۔"

"ہم کدھر ہی جائے گا. تم واپس جاؤ بھائی صاحب۔"

پہلی بار اُس کے ذہن میں شک کی کچھ کونپلیں پھوٹیں۔ "آپ زیارت کو تو نہیں جاتا۔"

"نہیں.." ہم بے دید اور بے فیض ہو گئے۔

اُس نے صرف ہماری عددی برتری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجبوراً پسپائی اختیار کی اور وہ جاتے ہوئے ہمیں مڑ مڑ کر دیکھتا تھا اور اُس کی آنکھوں میں قتل کے ارادوں کے سوا کچھ نہ تھا.. شاید پچھلی شب الاؤ پر بھونا جانے والا فربہ دُنبہ اُسی کے ریوڑ میں سے تھا..

”رتّی گلی گلیشیر پر معلق پتھریلے جھونپڑے میں رات اور برف کے بھیڑیئے“

بلند پہاڑوں کی پہلی مسافتوں کی اُس شام میں ہم رتّی گلی کے قریب ہوتے گئے..

اُس کے دامن کی قربت میں ہوتے گئے..

اور پھر رتّی گلی گلیشیئر دُھند میں سے یوں نمودار ہوا کہ ہم پر حاوی ہو گیا..

جیسے ہم ہانپتے ہوئے اپنے گدھوں کے نقش پا پر قدم رکھتے منہ اٹھائے اُسے تکتے تھے اور ڈرتے تھے کہ ابھی اس کی ازلی برفیں ہم پر آن گریں گی اور ہمیں دفن کر دیں گی..

اور جب ہم اُس کے دامن میں پہنچے جہاں سے اُس کی برف سلطنت کا آغاز ہوتا تھا اور ہمارا اگلا قدم زمین کی بجائے برف پر رکھا جانا تھا تو اُس لمحے ہم پر کھلا کہ یہ جو آئس ایکس یا برف کے کلہاڑے ہم یونہی اٹھائے پھرتے تھے، ان کا مصرف کیا ہے.. بیکار تو نہیں اٹھائے پھرتے تھے..

ان کلہاڑوں کی ضربوں سے ہم نے ابدی برف کے سینے میں شگاف ڈالے..اُن کے بدن بے دردی سے چاک کیے اور اُن پر قدم جما جما کر گلیشیئر پر چڑھنے لگے..ہمیں حیرت ہو رہی تھی کہ گدھوں اور خچروں کے پاس کوئی آئس ایکس نہ تھے اور وہ پھر بھی قدم جماتے ہماری نسبت کہیں زیادہ آسانی سے اوپر جا رہے تھے..

یاد رہے کہ شام ہو چکی تھی..

ہم اگر گوجروں کے تمام تر دُنبے روسٹ کر کے کھا چکے ہوتے تو بھی اب تک وہ ہضم ہو

چکے ہوتے کہ ہمارے تھکے ہوئے بدن اگرچہ پچھلی شب کے عقیدت سے دبائے ہوئے بدن اب فریاد کر رہے تھے کہ ہمیں کُچھ کھانے کو دو..رُک جاؤ کہ ہم میں مزید ایک قدم بھی اٹھانے کی سکت باقی نہیں ہے..

شام کا دھندلکا تاریکی میں ڈوب جانے کو تھا جب ہم نے گلیشیئر کے وسط میں رتّی گلی کی چوٹی کے عین نیچے..برفوں کے کناروں پر ایک پتھریلا جھونپڑا معلق دیکھا....

برفوں کی ڈھلوانوں پر پتھروں کی ایک کوٹھڑی اُس رات میں اُترتی شام میں ذرا بلندی پر دکھائی دی..

جیسے ڈوبنے والوں کو پانیوں کی کائنات ایک تنکے کے بجائے ایک جزیرہ دکھائی دے..

برفوں کی سفیدی میں نمودار ہوتی یہ پتھریلی کُٹیا بھی میرے ذہن پر نقش ہے..

خواجہ صاحب نے ہم سب تقریباً فوت ہونے کو ممبران کو مخاطب کر کے پوچھا ”ہائکرز آپ تھک تو نہیں گئے؟“

اور ہم نے ڈر کے مارے کورس میں الاپا ”نہیں سر..“

تو اُنہوں نے اقرار کیا ”میں تھک گیا ہوں...اگر ہم چوٹی پر پہنچ بھی گئے تو وہاں بہت سردی ہوگی، رات گذارنا محال ہوگا تو آپ کیا کہتے ہیں کہ ہم رات اُسی جھونپڑے میں نہ بسر کر لیں؟“

”جی سر..آپ کہتے ہیں تو کیوں نہ بسر کر لیں..ورنہ ہم تو تازہ دم ہیں، ابھی چل سکتے ہیں۔“

”تو پھر چلیں؟“ خواجہ صاحب خوب جانتے تھے کہ بے شک یہ خون جوان ہے..ابھی ٹین ایج میں ہمکتا ہے اور ہار نہیں ماننا چاہتا لیکن ابھی گرا چاہتا ہے..

”نہیں سر..“ ہم نے فریاد کی..”ہم تو یونہی بکواس کر رہے تھے..“

وہ جھونپڑا گویا رتّی گلی کا بیس کیمپ تھا..

وہ رات یقیناً قطب شمالی کی ایک رات تھی..سردی کی آخری اذّیت میں ٹھٹھرتی منجمد ایک رات تھی..برداشت سے باہر تھکاوٹ اور بدن کی عمارت کی ہر اینٹ ہلا دینے والی ایک رات تھی..

یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ ہم ایک پتھریلی کوٹھڑی کے اندر قیام پذیر ہیں۔یہی لگتا تھا کہ ہم ننگی برف پر..اپنے گھنے اونی لباسوں اور کمبلوں کے بغیر صرف اپنے اپنے انڈر ویئر میں ننگی برف پر لیٹے ہوئے ہیں..

اور جو انڈر ویئر نہیں پہنتے تھے اور بیشتر ہرگز نہیں پہنتے تھے اُن کی حالت زار کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں..

ہر سُو رات اور برف کی حکمرانی تھی..

وہ جھونپڑا ایک بوڑھے چرواہے کا تھا..جس نے ہم سب کو جب یلغار کرتے ہوئے دیکھا تو ایک کونے میں دبک گیا..

تھر تھر کانپنے لگا کہ یہ کیا مخلوق ہے جو ہاتھوں میں کلہاڑے تھامے..گدھوں اور خچروں کو آگے لگائے میرے جھونپڑے پر قابض ہو گئی ہے..

ہم اُن باباجی کی زبان نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں..

ایک کونے میں دبکے وہ کچھ بڑبڑاتے رہے۔

شاید وہ پنیر کا کاروبار کرتے تھے کیونکہ جھونپڑے کے کچے فرش پر مقامی مہک کے پنیر کے ڈھیلے شاید سوکھنے کے لیے بچھے ہوئے تھے اور ہم جو قابض فوج تھے، ہمارے کمبل اور سلیپنگ بیگ ان ڈھیلوں پر بچھے ہوئے تھے۔اُس پنیر کی بدبُو اتنی تیز اور متلی آور تھی اور میں پوری سرد رات میں اسے سونگھتا رہا تھا کہ آنے والے بے شمار برسوں میں بھی..بے شک وہ ہالینڈ یا ڈنمارک کا نایاب پنیر ہی کیوں نہ ہوا..میں اس سے صلح نہ کر سکا..

ایک عرصے تک پنیر کی بُو سے میں ایک حاملہ خاتون کی مانند ابکائیاں لینے لگتا۔لیکن اب اُس پنیر کا میں اتنا اسیر ہو چکا ہوں کہ میرا ناشتہ اس کے بغیر ادھورا رہتا ہے..

خوراک کے حوالے سے اُن دنوں کی ایک اور یاد بہت دلچسپ ہے..ہمارے سامان خوردونوش میں آٹے کا جو ذخیرہ تھا وہ کسی ایسی چکی سے حاصل کیا گیا تھا جو شاید ہکلاتی تھی رُک رُک کر رواں ہوتی تھی اور مٹھی بھر گندم پیسنے کے بعد چند دانوں کو ثابت ہی گذر جانے دیتی تھی..

چنانچہ جب ہم اس آٹے سے تیار کردہ روٹی کھاتے تھے تو ہر نوالے میں گندم کے ایک دو دانے ثابت آ جاتے جنہیں ہم منہ میں پول پول کر الگ کرتے اور پھر نوالہ نگلتے..

پنیر کی یاد کی طرح ایک عرصے تک روٹی کھاتے ہوئے میں احتیاط کرتا کہ ابھی گندم کا کوئی دانہ دانتوں تلے آ جائے گا..

آلو شوربہ..جس کے آلو آس پاس کی چٹانوں سے بھی سخت تھے اور روٹی جس میں گندم کے ثابت دانے..اور ہر دانے پر ہماری مُہر تھی..

رتّی گلی بیس کیمپ میں یہی ہمارا ڈنر تھا..

کھانے کے بعد ہم سب تو اپنے کمبلوں میں دُبکے پریشر کو برداشت کرتے رہے کہ ان کمبلوں میں سے نکل کر برفوں کی رات میں جا کر نجات حاصل کرنا قیامت سے کم نہ تھا لیکن جاوید اثر سے ضبط نہ ہو سکا...شاید یہ دُنبے کی چربی کا اثر تھا..بہت ہی مغلوب ہو کر وہ باہر گیا..فراغت حاصل کر کے واپس آیا تو بُڑبڑاتا پشت سہلاتا آیا کہ یارو باہر پانی تو نہ تھا..برف استعمال کر بیٹھا تو اب نچلے حصے مفلوج ہو چکے ہیں..

اُس شب..رتّی گلی کی چوٹی کے قریب اُس جھونپڑے کے باہر سرد ہوائیں نہ تھیں برف کے بھیڑیے تھے جو غراتے تھے اور ہمارے بدن سردی کی شدت سے یوں پھڑکتے تھے جیسے ایک فِش باؤل میں سے اُچھل کر فرش پر گر جانے والی مچھلی پھڑکتی ہے..

''رتّی گلی چوٹی ہِپ ہِپ ہُرّے اور جھیل میں تیرتا برفانی راج ہنس''

صبح کا انتظار نہ ہوا..

نیم تاریکی میں ٹارچوں کی روشنی میں ہم رتّی گلی گلیشیئر پر چڑھنے لگے..جس کی برفیں ابھی سخت تھیں اور ان پر چلا جا سکتا تھا..

تھوڑی ہی دیر میں ہم اُس آخری بلندی پر پہنچ گئے جو ہماری منزل تھی..

رتّی گلی کی چوٹی پر قدم رکھا..

وہ جو دُھند میں ملفوف تھی..

برف بھری تھی..

جہاں ازلی برفیں راج کرتی تھیں..

جو 13600 فٹ بلند تھی..

جب ہانکر حضرات گرتے پڑتے سب کے سب باری باری چوٹی پر پہنچ گئے تو خواجہ صاحب نے اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرنے کی خاطر دایاں ہاتھ بلند کر کے فلک شگاف نعرہ لگایا...ہپ ہپ۔

انگریز بہادر کو رخصت ہوئے صرف نو برس ہوئے تھے اس لیے ابھی یہی نعرہ شادمانی اور فتح کے اظہار کے لیے رائج تھا..

چنانچہ ہم سب نے گلے پھاڑ پھاڑ کر خواجہ صاحب کی ''ہپ ہپ'' کے جواب میں

''ہُرّے'' کہا..

اور ہم میں سے کوئی ایک تھا جو شاید اس نعرے سے ناواقف تھا اُس نے نہایت بلند آواز میں کہا ''پُھرّے..'' اس کا خیال تھا کہ یہ پُھرّے اُڑ جانے کے بارے میں کچھ ہے چنانچہ ''پھرّے..''

ہم تو میدانوں کے فرش سے آئے تھے اور یہ پہاڑوں کا عرش تھا، فرش مقیم جب بھی عرش پر پہنچتے ہیں تو اُن کا سانس رکتا ہے..ہمارا بھی رُکا..

اور ہاں خواجہ صاحب نے صرف ایک ''ہپ ہپ'' پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ مسلسل یہ نعرہ لگاتے ہی چلے جاتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک اُسی شدّومد سے جواب میں ''ہرّے'' الاپتے رہے اور کوئی ایک صاحب ''پھرّے'' ہی کہتے رہے۔ پھر ہم بھی گھگھیا گئے، گلے بیٹھ گئے تو چپ ہو گئے اور اس کے باوجود ہماری جانب سے جواب نہ آنے کے باوجود خواجہ صاحب اک عالم بے خودی میں ''ہپ ہپ'' کرتے رہے..اور بالآخر اُن کا گلا بھی جواب دے گیا اور وہ ایک ہچکی لے کر خاموش ہو گئے..یہ بلندی کی کرامت تھی..

یہیں پر..میرے سب سے پہلے کیمرے...بے بی براؤن کوڈک بوکس کیمرے سے کھینچی ہوئی ایک تصویر ہے....یہ بے بی مجھے اباجی نے مال روڈ کے زیدی فوٹوگرافر کی دوکان سے خرید کر دیا تھا، پورے بائیس روپے میں..

بہت دُھندلی تصویر ہے..کہ دُھند بھی تھی اور چھوٹا سا بوکس کیمرہ تھا، بے بی تھا اور اُس کے لینز میں اتنی سکت نہ تھی کہ ایسے نیم تاریک دُھند آلودہ مقام پر کوئی تصویر اُتار سکتا۔ لیکن پھر بھی اُسی نے ایک آؤٹ آف فوکس بلیک اینڈ وہائٹ تصویر ایسی اتاری جس میں سب لوگ پہچانے جا سکتے ہیں اُن کی مسرت دیکھی جا سکتی ہے اور اُن کی نوعمری ٹھاٹھیں مارتی ہے۔

خواجہ صاحب اپنا ہیٹ فضا میں بلند کرتے ''ہپ ہپ ہرے'' کا نعرہ لگاتے ہوئے..

بقیہ ہانکر نہایت سنجیدہ ٹھٹھرتے ہوئے..کچھ خواجہ صاحب کے پہلو بہ پہلو کھڑے..کچھ اُن کے آگے برف پر بیٹھے..اور میں..مفلر میں لپٹا آئس ایکس کی ٹیک لگائے دنیا جہان سے ناراض سا نوجوان..اور اب میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو سوائے جاوید اثر اور خواجہ صاحب کے اور کسی کی پہچان میرے ذہن میں نہیں تیرتی..جانے کون کون تھے..وہ جو کبھی کوہستانی دشواریوں کے

شب و روز میں ساتھی اور ہم راز تھے..دوست تھے اُنہیں آج میں پہچان بھی نہیں سکتا کہ وہ کون ہیں..
کون جانے وہ کون ہیں اور اُن میں سے کون اب نہیں ہے..برس بھی تو بہت ہیں ناں جو بیت گئے..

اس برفیلی بلندی کے دائیں جانب ذرا پرے کچھ ننگی چٹانیں تھیں..وہی سُرخ چٹانیں جن کی نسبت سے یہ رتی گلی تھی اور اُن پر برف نہیں ٹھہر سکتی تھی اس لیے وہ ننگی تھیں..جاوید اثر اپنے آپ کو فارغ کرنے کے لیے گروپ سے الگ ہو کر ذرا اوپر جا کر کچھ لمحوں کے لیے روپوش ہوا اور پھر واپس آ گیا..

اُس کی اس لحہ بھر کی رخصتی اور چند قدم اوپر جا کر روپوشی نے ایک لازوال تاریخی لمحے کو جنم دیا..

لاہور واپسی پر جب ہمارے اعزاز میں پورے گورنمنٹ کالج نے ہماری بے مثال جرأت و شجاعت کے اعتراف میں ایک تقریب کا انعقاد کیا جس میں پرنسپل پروفیسر سراج الدین نے ہم سب کو شاباش دی اور بعد میں گورنمنٹ کالج کا کوہ پیمائی کا کلر عطا کرنے کا اعلان کیا تو وہاں جاوید اثر یکدم اپنی نشست سے اُٹھا اور روسٹرم پر جا کر نہایت سنجیدگی سے دعویٰ کیا کہ خواتین و حضرات میں اپنی تعریف نہیں کر رہا، صرف ایک حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس پوری ٹیم میں، میں وہ واحد شخص ہوں جس نے رتی گلی چوٹی سے بھی اوپر ایک ناممکن بلندی پر قدم رکھا جب کہ میرے تمام ساتھی ہمت ہار چکے تھے..صرف میں تھا جس نے اس مُہم کے دوران بلند ترین مقام پر پہنچ کر گورنمنٹ کالج کا نام روشن کیا..

اور تکنیکی طور پر جاوید اثر درست کہتا تھا لیکن اُس پُر وقار تقریب میں ہم اُس کے دعوے کو یہ کہہ کر رد نہیں کر سکتے تھے کہ خواتین و حضرات یہ تو ہم سے دو چار قدم اونچائی پر محض پیشاب کرنے کے لیے گیا تھا..تاریخ بہرحال ایسے ہی مرتب ہوتی ہے..

ہمارے کُل سامان میں دو تھرموس بوتلیں تھیں جو اُن زمانوں میں نہایت نایاب عجوبہ تھیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان میں گرم چیز ڈالو تو وہ تا دیر گرم رہتی ہے اور برف ڈالو تو وہ دیر تک پگھلتی نہیں..اور ان تھرموس بوتلوں میں باورچی نے ہمارے لیے چائے محفوظ کر رکھی تھی..

رتی گلی ٹاپ پر ہم نے یہ چائے پی..اور پھر خواجہ صاحب نے کُوچ کا نقارہ بجا دیا..

''کم آلانگ بوائز..اور فار دے لاسٹ ٹائم، ہپ ہپ..''

''ہرّے..'' ہم نے کورس میں جواب دیا سوائے ایک ''پھرّے'' کے اور رتی گلی چوٹی کی دوسری جانب آزاد کشمیر میں اُترنے لگے..

ابھی کچھ دیر پہلے رتی گلی چوٹی پر پہنچنے کے لیے ہم سب گلیشیئر پر چڑھتے ہوئے ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے تھے..ذرا کوئی دُھند میں اوجھل ہوتا تھا تو نروس ہو جاتے تھے لیکن اب یہ عالم تھا کہ دوسری جانب اُترتے ہوئے سب کے سب آزاد اور بے پروا ہو گئے..شور مچاتے..چیخیں مارتے..ایک برفانی چوٹی کو اپنے تئیں فتح کرنے کے نشے میں سرشار ہم سب خوش و خرم خرگوشوں کی مانند اُچھلتے کُودتے دوسری جانب اُترنے لگے..

ابھی چند قدم اُترے ہیں تو دُھند چھٹ گئی، ہم دھوپ میں آ گئے..

رتی گلی کی ازلی برفیں پیچھے رہ گئیں۔ایک خواب ہو گئیں اور ہم اُس سرد خواب میں سے نکل کر دھوپ اور تیز روشنی میں آ گئے..

ایک گھاس بھری خوشنما اُترائی ایسی تھی جس پر ہم قلانچیں بھرتے اُترتے جاتے تھے اور تب مجھ سے وہ غلطی سرزد ہو گئی جس کا خمیازہ میں نے عمر بھر بھگتا..میں نے غلطی یہ کی کہ عین سامنے دیکھا..اپنے قدموں تلے آتی گھاس کی جو اُترائی تھی اُس سے نظر اُٹھا کر سامنے دیکھ لیا..

سامنے جو کچھ دیکھا اُسے بیان کرنے سے پیشتر قدموں کے نیچے جو ایک کھلی وادی نظر آتی تھی اُس کا احوال سن لیجیے..ایک ایسی وادی جو میرے لحہ موجود کے بوڑھے خون میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر سکتی لیکن اُن زمانوں کے کھولتے خون نے اسے کوہ قاف میں سے طلوع ہوتے دیکھا..یقیناً اُس میں پریوں کا بسیرا تھا..وہ ایسی دل نشین اور سحر طراز وادی تھی جو ہمارے نیچے بچھی تھی..مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ میرے نوجوان خون کا ایک کرشمہ تھی..جوانی کے دُھند آلود حماقت سے بھرے خوابوں کا ایک واہمہ تھی، چنانچہ اُسے بیان کرنا بیکار ہے..جیسے زندگی بھی تو بیکار ہے..

جونہی ہم رتی گلی کی چوٹی سے اُترے..دھوپ میں اُترے، ہمارے قدموں میں سبز گھاس سے آرائش شدہ ایک نرم اور جادوئی قالین بچھ گیا اور اس کے درمیان ایک دودھ سفید برفیلی ندی بہہ رہی تھی اور اُس کے کناروں پر..دور دور تک جہاں تک وہ ندی جاتی تھی اور جہاں تک اُس کے کنارے نظر آتے تھے..وہاں تک سرخ ہی سرخ پھول جھومتے تھے..ہزاروں نہیں..ورڈز ورتھ کے ورتھ لیس بے شمار ڈیفوڈلز نہیں..بلکہ لاکھوں گُل لالہ تا حدِ نظر جھومتے تھے..وجد میں

آئے ہوئے تھے..

اور ہم جو بے مُہار اونٹوں کی مانند اُترتے تھے بے شک ان سرخ چہروں کو اپنے فوجی بوٹوں تلے روندنا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے.. کیا کرتے..؟ ہمیں تو اُترنا تھا.. چلنا تھا اور چلتے تھے تو وہ راستے میں بچھے جاتے تھے..

تو اب ہم اس وادیٔ حیرت سے پرے دیکھتے ہیں..

وادی نشیب میں ہے..

یہ صدرنگ چمن اور اس کے درمیان میں بہتی سفید دھوپ میں آنکھیں چندھیاتی ندی سے اوپر.. اس کے پار اُدھر بھی تو دیکھنا ہے جہاں وہ جھیلیں تھیں..

سیانے کہتے ہیں کہ محبت کے چھ درجے یا مرحلے ہوتے ہیں..

۱۔ رُجحان

۲۔ میلان

۳۔ دلچسپی

۴۔ محبت

۵۔ عشق

۶۔ جنون..

لیکن میرے ساتھ یہ سانحہ ہوا کہ ان جھیلوں نے مجھ پر ایسا ظلم کیا کہ میں آنکھ جھپکتے ہی پہلے پانچ مرحلوں کو پھلانگ کر جنون میں جاداخل ہوا۔ آئندہ زندگی میں صرف ایک بار میرے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا جو ایک جھیل نے نہیں، ایک چہرے نے کیا۔ جہاں وادی کا اختتام تھا اُس کی سرحد پر نیلی چٹانوں کی ایک دیوار اُٹھتی تھی جو دُھند میں سے کیسے ظاہر ہوتی تھی اور کیسے حجاب کر جاتی تھی اور اُن نیلی چٹانوں میں.. نیلے ہیروں کی مانند دھوپ کے عکس کے نیلے لشکارے مارتی وہ جھیلیں تھیں..

دراصل جھیل ایک ہی تھی..

دوسری قدرے نشیب میں تھی.. بے شک دل کش تھی مگر سادہ طبیعت کی تھی.. دراصل ایک ہی جھیل تھی جس نے مجھے رجحان، میلان، دلچسپی، محبت اور عشق کے مرحلوں میں ٹھہرنے ہی نہ دیا، یکدم ایک ہی نظر میں جنون تک لے گئی..

بیشتر جھیلیں نشیب میں واقع ہوتی ہیں..

جہاں برفوں کے پگھلنے سے اُن کے پانی اُتر کر قیام کرتے ہیں۔

لیکن یہ جھیل عجب تھی کہ بلند چٹانوں کی دیواروں میں جگہ بنا کر آرام کرتی تھی.. اور اُن چٹانوں کی نیلاہٹ میں اپنی گہری نیلاہٹ یوں بھرتی تھی کہ اُسے تادیر دیکھنے سے تن من نیلو نیل ہوجاتا تھا..

لیکن اصل عجوبہ تو وہ راج ہنس تھے جو اُس کے پانیوں میں تیرتے تھے..

کناروں پر معلق جو چٹانیں تھیں اور اُن پر ٹھہرے ہوئے جو گلیشیئر تھے اُن سے جدا ہو کر جھیل میں ٹوٹ کر گرنے والے جو برف کے تودے تھے وہ سفید راج ہنسوں کی مانند اُس کے گہرے نیلے پانیوں پر تیرتے تھے..

یونہی بے پروا تو نہ تیرتے تھے..

چٹانوں میں سے ایک آبشار اُس جھیل میں گرتی تھی.. اتنے طویل فاصلے سے وہ ایک سفید سکوت کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ تو ایسا ہوتا کہ ایک برفانی راج ہنس اپنے آپ میں مگن.. تیرتا ہوا اُس آبشار کے پانیوں تلے آجاتا.. تو اُن کے زور سے.. اپنے سفید بدن پر گرتے تیز پانیوں کی شدّت سے ہولے ہولے پرے ہوجاتا..

میری نظروں کے سامنے متعدد بار یہ تماشا ہوا..

برف کا ایک تودہ جھیل میں تیرتا لاعلمی میں اُس آبشار کے پانیوں کے نیچے آجاتا اور اُن کے زور سے پھسلتا ہوا.. پرے ہوجاتا..

اور یاد رہے کہ میں جہاں تھا تو دھوپ میں تھا اور وہ نیلی جھیل جہاں تھی اُس پر دُھند اُترتی تھی..

راج ہنس دُھند میں سے کبھی کبھی ظاہر ہوتے تھے..

''سَر..'' میں نے اپنے برابر میں اترائی پر لڑھکتے ہوئے موٹے تازے خواجہ جی سے درخواست کی ''سَر.. کیا ہم اس جھیل تک نہیں جاسکتے.. آج کی شب وہاں نہیں گذار سکتے.. پلیز سَر..''

اور میں تنہا نہ تھا جو یہ آرزو کرتا تھا.. ٹیم کے دیگر ممبران نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔

''نہیں..'' خواجہ صاحب بے دید ہوگئے..

''کیوں سَر.. ذرا دیکھئے تو سہی کہ جھیل میں ہمارے وجود سے لاعلم کیسے کیسے برفانی

تو دے تیرتے ہیں۔ کیوں نہیں سَر؟''

تب خواجہ صاحب کی بصیرت اور بزرگی نے جواب دیا ''بوائز.. یہ ممکن نہیں..''

''کیوں نہیں سر..''

''دیکھو ہم اُس جھیل تک پہنچنے کا راستہ نہیں جانتے..اور وہ اتنی قریب بھی نہیں جتنی کہ دکھائی دے رہی ہے۔ ہم اُس تک پہنچنے کی کوشش میں گم بھی ہو سکتے ہیں..اور بوائز..کیا پتہ وہ جھیل وہاں ہے بھی یا نہیں..''

ظاہر ہے خواجہ صاحب کی یہ ہمارے نزدیک لایعنی سی منطق ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ یہ جو جھیل ہمارے سامنے نظر آتی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں، اس لیے کہ وہ ہے..تو وہ کیسے نہیں ہو سکتی..

لیکن بعد کی زندگی میں یہ کُھلا کہ نہیں..ایسا ہوتا رہتا ہے کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ نہیں ہوتا!

رتی گلی چوٹی سے اُتر کر ہم اُس وادیٔ پُرفسوں میں چلے..اپنے بوٹوں تلے سرخ پھولوں کو روندا، اُس جھیل کو جو اگر وہاں تھی تو دیکھا اور اگر نہیں تھی تو بھی دیکھا اور پھر اُس کوہ قاف میں سے اُترے ہیں تو گویا ایک دشتِ مرگ میں اُترے ہیں۔ ویرانوں، کھائیوں اور خطرناکیوں کے دیس میں آ گئے ہیں جہاں ایک اُسترے کی دھار سے بھی زیادہ مختصر پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے ہمارا ایک خچر نیچے کھائی میں گر گیا.. یہ کہنے کی کیا حاجت ہے وہ تو گر گیا لیکن اپنے ہمراہ ہمارا کچھ سامان بھی ملک عدم لے کر گیا..

اُس شب چیڑ کے جنگلوں میں روپوش ایک سرکاری ڈسپنسری میں ہم نے قیام کیا جہاں ہمارے برابر میں ایک خون آلود دیہاتی عورت پڑی تھی اور دل دوز چیخیں بلند کرتی تھی کہ ایک بڑے پتھر کے گرنے سے اُس کی ایک ٹانگ پاش پاش ہو چکی تھی اور ڈسپنسر کے پاس اُس کی ٹانگ کاٹ دینے کے لیے مناسب طبّی سامان نہ تھا..

اگلے روز ہم چلے تو ہمارے دو ساتھی چلتے گئے اور دریائے کشن گنگا پر معلق ایک مخدوش پُل پر چلتے گئے اور ہندوستانی کشمیر میں داخل ہو گئے۔ وہ ظاہر ہے گرفتار سے ہو گئے..

اور پھر ایک شاندار بُھوری مونچھوں والے..بُھورے رنگ کے گھوڑے پر سوار ایک میجر

شاہ نمودار ہوئے..ہم اگر آج کی طرح تجربہ کار ہوتے تو جان جاتے کہ وہ ہمہ وقت مخمور رہتے ہیں کہ اُن دنوں مخمور رہنے میں کچھ برائی نہ تھی.. جب تک آپ اپنے مشکی گھوڑے پر سوار رہتے ہیں اور گر نہیں جاتے تو اس میں کیا برائی ہے تو ان میجر شاہ نے ہمارے اُن دو ساتھیوں کی رہائی اور واپسی کا بندوبست صرف اس لیے آسانی سے کرلیا کہ وہ اس پُل کے پار جا کر ہر شام ایک سکھ میجر کے ہمراہ ہندوستانی وِہسکی کے گھونٹ بھرتے تھے..صرف اس لیے..

یہیں سے وادیٔ کشن گنگا کا آغاز ہوتا تھا..جسے ہم نے زبردستی مسلمان کر کے وادیٔ نیلم کا نام دے دیا ہے..

ہم دریا کے بلند کناروں پر ایک کچے راستے پر چلتے تھے..

رات ہوتی تو ہم اپنے آپ کو کسی متروک شدہ اجاڑ ریسٹ ہاؤس میں پاتے جس کے برآمدوں میں خودرو گھاس بلند ہوتی تھی..

اسی دریائے کشن گنگا کے اونچے کناروں پر چلتے ہوئے شام ہو رہی تھی اور میرے برابر میں چلتا مُہم کا باورچی زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں ایک وعظ کر رہا تھا تو ایک چٹان..ایک عام سائز کے کمرے جتنی بڑی چٹان اوپر کے پہاڑوں سے لڑھکتی ہوئی آئی اور چند ساعتوں کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے جو راستہ تھا وہ اوجھل ہو گیا.. وہ اُس راستے پر گری اور ایک بڑے فٹ بال کی مانند اُچھل کر دریائے کشن گنگا کے پانیوں میں جا گری اور گم ہو گئی..

اگر ہم دونوں دو چار قدم..دو چار لمحے آگے ہوتے تو اُس چٹان تلے سُرمہ ہو کر آج سے سینتالیس برس پیشتر فنا ہو چکے ہوتے..

ہم بالآخر دواریاں کے راستے مظفر آباد میں آ نکلے..

لیکن یہ سب قصّے یونہی سرسری اور بیکار ہیں۔

اصل قصّہ بس اتنا ہے کہ میں عمر بھر رتی گلی کی جھیلوں کے فریب میں اُلجھا رہا.. میں جہاں بھی گیا اُنہوں نے میرا پیچھا کیا.. یہاں تک کہ میرے وہم اور جوانی کے رومانوی تخیل میں وہ یوں گڈمڈ ہو گئیں کہ حقیقت اور تخیل میں کچھ فرق باقی نہ رہا..

کبھی مجھے قرار آ جاتا کہ نہیں وہ وہاں نہیں تھیں.. یہ محض میرا ذہنی فتور اور تخیل ہے جو نہیں

تخلیق کرتا ہے..

اور کبھی پرانی تصویروں کے ڈھیر میں سے کوڈک بے بی براؤن کیمرے کی کوئی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر نکل آتی جو گواہی دیتی کہ نہیں وہ ہیں..

اسی مخمصے میں اک عمر بیت گئی..

اور پھر ایک لمحہ مجھ پر ایسا اُترا جس میں میں اپنے آپ سے مخاطب ہوا ''تارڑ جی.. آپ پچھلے بیس بائیس برس سے شمال کے اُن زمانوں اور پہاڑوں میں جا رہے ہیں جہاں فرشتوں کے پَر بھی جلتے ہیں..سکت کم ہے پھر بھی ہر برس رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔شاہ گوری..نانگا پربت.. سنولیک اور لیلےٰ پیک کے چہرے دیکھ چکے ہیں تو کیا حرج ہے کہ اس بار ذرا چیک تو کر لیں کہ رتی گلی کے پار سفید راج ہنسوں والی جھیل کا وجود ہے بھی یا نہیں..''

''کوئی حرج نہیں..'' جواب آیا۔

''واقعی؟''

''ہاں..اس لیے کہ اب تمہارے پاس گنجائش باقی نہیں رہی..عمر بھی کچھ زیادہ باقی نہیں رہی تو چیک کر لینے میں کوئی حرج نہیں..''

''پہنچ پاؤ گے؟''

''ہاں..کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ یہ سینتالیس برس تمہارے بدن پر بھی تو گذر چکے ہیں..''

''خلش تو ختم ہو جائے گی ناں...بے شک اس جستجو میں خود ختم ہو جائیں..''

''اور اگر وہ جھیلیں وہاں موجود نہ ہوئیں تو کیا ہوگا؟''

''یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے..''

''اور اگر وہ وہاں واقعی موجود ہوئیں تو؟''

''تو پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ آج تک میرے تخیل میں جتنے بھی راج ہنس تیرے ہیں، اُن کا وجود ہے۔''

''تم بہت ہی ڈھیٹ شخص ہو..کبھی ہتھیار نہیں ڈالتے..آؤ چلیں۔''

''سینتالیس برس بعد..رتی گلی کی جانب پھر سے جاتا ہوں''

چنانچہ میں پھر رتی گلی کو جاتا تھا..

شاہ گوری، نانگا پربت اور سنولیک کے موسموں کو بھی سہہ جانے والے رُک سیک میں برسوں کا آزمودہ اور نرم پروں والا نیلا سلیپنگ بیگ پیک کیا اور اب رتی گلی کی جانب جاتا تھا..

سینتالیس برس بعد جاتا تھا..

وادئ کاغان ہمیشہ مجھے ایک نرم کومل ہری بھری جنگل بھری نسوانی سی بے ضرر وادی لگتی تھی کہ میں تو شاہراہ ریشم سے پرے جو شمال تھا اُس کی ہیبت، اونچائی، ویرانی اور دل پر ڈاکے ڈالنے والی اُن وادیوں کا اسیر تھا کہ جن کے اندر کوئی ایک بار گیا تو کبھی لوٹا نہیں..اُس کا فانی بدن بے شک لوٹا ہو پر اُس کی روح نے وہیں بسیرا کیا..جہاں اللہ تعالیٰ اپنے آسمانی تخت پر براجمان ہم کلام ہوتا ہے اور اُس تخت کے نیچے جو پہاڑوں کے جہان پر بچھا ہوتا ہے اُن پہاڑوں میں کہیں ایک ذرہ میں، اپنے ذرے ہونے کا احساس کرتے، اقرار کرتے اُس کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے..اور اُس رب کے تخت کے پائے بھی کیا خوب ہیں..نانگا پربت، راکاپوشی، شاہ گوری، مشابرم، گشابرم، براڈپیک، لیلےٰ پیک، چوغولیزا اور لاٹوک ایسے برفانی پائے ہیں جن پر اُس کا تخت بچھا تھا..

تو ان شاہانہ عظمتوں کے سامنے وادئ کاغان تو محض ایک ہرا بھرا جنگل بھرا کھلونا تھی.. خوش شکل سہی پر ایک کنیز تھی..

لیکن اسی کھلونے میں کہیں وہ برفانی راج ہنس تیرتا تھا..

اگر اُس کا وجود تھا تو!

یہ نہیں کہ میں نے وادیٔ کاغان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا.. نہیں.. میں متعدد بار وہاں گیا تھا..

ایک بار اور اُس بار کو بھی چالیس برس ہونے کو ہیں۔ میں اپنے عزیز دوستوں خاور اور طیب کو بہلا پھسلا کر ایک مختصر کوہستانی مُہم پر لے گیا تھا اور خود بھی ذلیل ہوا تھا اور اُنہیں بھی رُسوا کیا تھا.. رتی گلی کے بہانے میں اُس مہم کی داستان بھی آپ کو زبردستی سنا کر رہوں گا.. لیکن تب جب ہم پارس کے قریب سے گذریں گے تب..

لیکن ابھی میں آپ کو بھیتر کی بات بھی بتاتا ہوں۔

اندر کی بات سے پردہ اُٹھاتا ہوں..

مجھے اب آہستہ آہستہ اُس وحشی بلند شال سے خوف آنے لگا تھا کہ اُس کے اندر جانے اور پھر بلندیوں پر چڑھنے کی ہمت مجھ میں ہر روز کم ہوتی جاتی تھی اور میں آسان راستوں پر چلنے کا متمنی تھا..

اس دوران میرے سفرناموں کے فریب میں گرفتار ایک نوجوان بصیر جدون نے ایبٹ آباد سے مجھے ایک طویل خط لکھا اور اُس کے ہمراہ وادیٔ کاغان کی جھیلوں کا ایک نقشہ بھی منسلک کیا اور مجھ سے درخواست کی بلکہ ایک دھمکی آمیز مشورہ بھی دیا کہ تارڑ صاحب آپ وادیٔ کاغان سے کیوں رُوٹھے ہوئے ہیں، اسے کیوں حقیر جانتے ہیں۔ آپ نے اگر جھیل سرال نہیں دیکھی تو اپنی کوہ نوردی کی زندگی میں کیا دیکھا.. کچھ بھی نہیں.. اور اگر آپ ابھی تک جھیل لُولُوسر اور دُودی پت تک نہیں گئے تو.. کہیں نہیں گئے.. میں نے اس خط کو پڑھ کر اور نقشے پر ایک نظر ڈال کر حسب عادت ردّی کی ٹوکری میں تو نہیں پھینکا، فالتو کاغذوں اور پرانے مسودوں کے کسی ڈھیر میں رکھ کر بھول گیا۔

کچھ برس گذر گئے..

اور وہ دن آئے جب میں کسی آسان راستے کی تلاش میں تھا.. برفیں پگھل رہی تھیں اور میدانوں میں گرمی سے ہم پگھل رہے تھے اور میرے کوہ نوردی ساتھی بار بار فون کرتے تھے کہ تارڑ صاحب اس برس کدھر جانا ہے، کوئی فیصلہ کریں تاکہ ہم اپنی بیویوں کی تشفی کے لیے کچھ بہانے گھڑ لیں.. دفتروں اور عدالتوں میں چھٹی کی درخواست پیش کر دیں۔ کاروبار سے چند روزہ رخصت کی کوئی ترکیب سوچ لیں تو کوئی فیصلہ جلد کر لیں۔

تو اُنہی دنوں جب میں اپنی سٹڈی کی سالانہ صفائی کر رہا تھا.. وہ سینکڑوں بے مصرف کتابیں جن میں بیکار حرف ہوتے ہیں اور ان میں سے بیشتر شاعری کی کتابیں ہوتی ہیں، اپنے مختصر بک شیلف میں سے نکال کر کسی لائبریری کو عنایت کر رہا تھا.. اور فائلوں میں سے غیر ضروری کاغذات، خط، پوسٹ کارڈز، اخباری انٹرویو اور کتابوں پر تبصرے وغیرہ تلف کر رہا تھا تو اُن کے ڈھیر میں سے وہ نقشہ نکل آیا جس پر جھیل سرال کے راستے نقش تھے.. یہ راستے آسان لگتے تھے..

وادیٔ کاغان ایسی بھولی بھالی کومل وادی میں راستے کتنے مشکل ہو سکتے ہیں.. تو میں نے اعلان کر دیا کہ حضرات.. کیا خیال ہے کہ ہم اس مرتبہ اپنی جان داؤ پر لگانے کی بجائے اسے بنائیں.. کھائیں پئیں، مزے سے واک کریں، کاغان چلیں.. بلکہ کاغان میں کہیں کوئی جھیل سرال ہے وہاں تک نہ چلیں..

میرے کوہ نوردوں نے پہلا سوال یہ پوچھا کہ سر یہ ٹریک مشکل تو نہیں؟

تو میں نے کہا، اگرچہ بعد میں میں نے اپنے کہنے پر اپنے آپ کو لعنت ملامت کی لیکن تب میں نے کہا.. ہرگز نہیں.. ہم تو سبزہ زاروں، چراگاہوں، چمن زاروں اور گلستانوں میں سجے سجے محوِ خرام ہوں گے.. کچھ جھیلوں کے کنارے خیمے لگائیں گے.. غرض کہ مزے کریں گے..

اس پر ایک غیر متوقع ردعمل سامنے آیا.. عامر کے ٹو کے برادر خورد بابر نے جو میرے ہمراہ جانے کے لیے کمر کس چکا تھا، کمر کھول کر بولا "تارڑ صاحب میں نے تو امریکہ اور کینیڈا میں کوہ نوردی کی ہے اور مجھے تو اُمید تھی کہ آپ اس بار بھی کسی سنو لیک یا یاک سرائے کی جانب سفر کریں گے تو میں اتنے آسان ٹریک پر جا کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ماڈل ٹاؤن پارک میں دو کی بجائے تین چکر لگا لوں۔"

کچھ عادی اور بنیاد پرست کوہ نورد دوستوں نے بھی دبے لفظوں میں مجھے مطعون کیا کہ تارڑ صاحب آپ سے یہ اُمید تو نہ تھی کہ آپ کوہ ہراموش کو فراموش کر کے.. بتورہ گلیشیئر ٹریک سے نظریں چرا کر وادیٔ کاغان کو جا رہے ہیں۔ جہاں ان دنوں ہر کوئی جا رہا ہے.. اس سے تو بہتر ہے کہ لاہور میں شملہ پہاڑی پر یلغار کر دی جائے..

لیکن یہ سب منحرف اور مجھے مطعون کرنے والے لوگ نہیں جانتے تھے کہ اگر کوئی نقشہ یا قدیم سفرنامہ یہ بیان کر دے کہ فلاں علاقہ میں کوئی گمشدہ نامعلوم جھیل موجود ہے تو چاہے وہ

کاغان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جھیل میرے حواس پر چھا جاتی ہے۔ اُس کا نام تب تک میرے بدن پر دستک دیتا رہتا ہے جب تک کہ میں آمادگی کا، ملاقات کے وعدے کا ایک کواڑ کھول کر اُس کے آگے ہاتھ باندھ کر اقرار نہ کرلوں کہ بی بی آپ مجھ غریب کو مزید تنگ نہ کریں، ہراساں تو نہ کریں، میں آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ کے کناروں تک پہنچ کر دیدار کروں گا..

تو یہ جھیل سرال بھی ایک ایسی ہی حواس پر چھا جانے والی نوعیت کی جھیل تھی..اُس نے میرے ڈھلکے ہوئے نتھنوں میں باگیں ڈال کر اُنہیں اس شدت سے کھینچا تھا جیسے شکاری کنڈی میں پروئی گئی مچھلی کو کھینچتا ہے کہ اے عمر رسیدہ گھوڑے جب تو جوان تھا تو جو بھی جوہڑ نما جھیل دکھائی دیتی تھی، اُس پر فریفتہ ہو کر اُس کے کناروں پر ہنہناتا پھرتا تھا.تو اس بڑھاپے میں ایک عشق اور سہی، ذرا ادھر تو آ..پھر دیکھ کہ تیرا کیا حشر ہوتا ہے..ادھر جدھر ایک بلند درّے کو پار کرنے پر میں نظر آتی ہوں.. میرا وعدہ ہے کہ یہ تمہارا آخری اور حتمی عشق ہوگا..

جھیل کرومبر نے بھی مجھے اسی بے رحمی اور تشدد سے طلب کیا تھا..

پہلے میں نے آپ کو بھتیر کی بات بتائی تھی..

اور اب میں آپ کو بھتیر کے بھیتر میں جو بات ہے، وہ بتاتا ہوں۔

اندر کے اندر جو کچھ ہے، اُس میں آپ کو شریک کرتا ہوں۔

جھیل سرال بھی محض ایک دکھاوا تھی..ایک بہانہ تھی..

دراصل یہ سارے بہانے..یہ سارے دکھاوے اور دھوکے سفید راج ہنسوں کی جھیل کو دوبارہ دیکھنے وہاں تک پہنچنے کے بہلاوے تھے..

مجھے آزاد ہونا تھا..

یہ جاننا تھا کہ وہ وہاں ہے یا نہیں؟

راجہ مان سنگھ کا شہر...مان سہرہ...

مانسہرہ..

ویگن میں..ایک بنیاد پرست.. باریش ڈرائیور بابر کی قیادت میں جو میرے قیافے میں پانچ کی بجائے درجن بھر نمازیں ہر دو چار قدم پر ویگن روک کر پڑھتا تھا، میں اور میرے ساتھی

سفر کرتے تھے۔ جنہیں میں دھوکہ دے کر، اُن کے ساتھ فریب کر کے اپنے ساتھ لایا تھا کہ برادران چلو..اس بار ہم ایک آسان مرغزار میں ٹہلنے کو جاتے ہیں اور اس دوران کچھ جھیلیں راستے میں آئیں گی..اور وہ میرے دھوکے میں آ گئے تھے..

مہاراجہ اشوک کے زمانوں سے کندہ چٹانوں سے ذرا آگے ایک دوراہا تھا..

اگر آپ سیدھے چلے جاتے ہیں اور ہم تو ہمیشہ ہی سیدھے چلے جاتے تھے..تو بٹ گرام اور شنکیاری سے گزرتے سندھ سائیں کے کنارے بشام جا قیام کرتے ہیں..لیکن اس دوراہے سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ پر ایک راستہ لوہار بانڈا کی جانب بلند ہوتا ہے جس کی چوٹی پر ڈاکٹر سلطانہ شاہ کا مسکن ہے۔ جہاں وہ اپنے عمر رسیدہ کینیڈین خاوند، ایک بے آسرا افغان بچی اور اپنی اکلوتی بیٹی کے ہمراہ ایک نہایت انہونے گھر میں رہتی ہے..جہاں سے شمال کی برفیں نظر آتی ہیں اور اُن کے سامنے ایک بڑا کائی زدہ بارشوں میں بھیگا ہوا ایک پتھر ہے جس کے دامن میں وہ ہر شب دیئے جلاتی ہے جب اداس ہوتی ہے..اور وہ اپنے پٹھانی لہجے میں اُس پتھر کو ہمیشہ ”پھتر“ کہتی ہے جیسے وہ شرم آتی ہے کی بجائے شرم آتا ہے کہتی ہے..

لیکن وہ اب وہاں نہیں ہے..

اگر وہ وہاں ہوتی تو میں اتنی لاپروائی سے وہاں سے گزر نہ جاتا..

وہ وہاں نہیں تھی اس لیے ہم وہاں رُکے نہیں..اُس نئی نویلی شاہراہ پر گامزن ہوئے جو پرانے راستے گڑھی حبیب اللہ کے راستے کو فراموش کرتی بالآخر ہمیں بالاکوٹ لے گئی..

بالاکوٹ جو ذرا سا بلند و بالا ہے اور وادی کاغان کا دروازہ کہلاتا ہے..جہاں کاٹھ کباڑ، بوسیدہ ٹائروں، متروک انجنوں اور ڈھانچوں سے ایسی شاندار جیپیں تخلیق کی جاتی ہیں کہ چینی یا جاپانی بھی اُنہیں دیکھ کر غش کھا جائیں کہ وہ بھی اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسی شاہکار جیپیں تیار نہیں کر سکتے۔

بالاکوٹ میں وادیٔ کاغان کی تنگی سے تنگ آیا ہوا دریائے کنہار جب آزاد ہوتا ہے تو اُس کی مسرت قابل دید ہوتی ہے..

اُس کی جھاگ اُڑاتی تیز بہاؤ کی مسرت پر ایک نیا نکور اور محفوظ پُل تعمیر ہو چکا تھا..اور

اُس سے ذرا پرے بوسیدگی اور بے چارگی سے مسمار ہونے کے قریب وہ پرانا پُل بھی موجود تھا جس پر.. گذرے تھے ہم جہاں سے..

وہاں سے اب کوئی نہ گذرتا تھا.. جہاں سے ہم گذرے تھے..

اسی پُل کے نیچے ہم سب لڑکوں نے زندگی میں پہلی بار ایک برفانی دریا میں اشنان کیا تھا اور جاوید اثر اپنے ہمراہ ایک ڈونگا لے گیا تھا اور وہ دریا کے پانیوں کو اُس میں بھر بھر کر اپنے بدن پر اُنڈیلتا ایک تصویر کھنچواتا تھا.. بے شک ہم پوری رات کنہار کے برفیلے پانیوں میں شرابور رہے اور کپکپاتے رہے.. لیکن یہ تو تقریباً نصف صدی سے پہلے کا قصہ ہے۔

مگر اِن زمانوں میں.. لمحۂ موجود میں.. ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے سالخوردہ بدنوں کو دریائے کنہار کے سرد پانیوں میں ڈبو کر کیف حاصل کریں.. ہم تو اگر یہ حرکت کرتے تو صرف مغفرت حاصل کرتے..

بالاکوٹ سے آگے..

جہاں اُن زمانوں میں ایک نام کا کچا جیپ ٹریک تھا جس پر شاذ ہی کوئی جیپ وادی کے اندر جانے کی جرأت کرتی تھی.. اب وہاں ایک چوڑی اور بے خطر شاندار شاہراہ تھی جس پر کُل خدائی دھڑا دھڑ سفر کرتی تھی۔ ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی.. کاریں، ویگنیں، کوسٹر، جیپیں اور ٹریلر بے دھڑک وادی کو روندتے چلے جا رہے تھے..

صرف میں تھا جو ماضی میں سفر کر رہا تھا..

باقی حال میں تھے اور خوش حال تھے..

ہماری ویگن میں باریش ڈرائیور بابر کے سوا چھ درویش تھے..

ان میں سے چار تو گانٹھ کے پکے آزمودہ، تجربہ کار اور کمینے قسم کے پروفیشنل درویش تھے یعنی میاں فرزند.. بلکہ فرزند.. سلمان، جواب باقاعدہ شادی شدہ ہو چکا تھا لیکن اُس کے بھالوپن میں کمی کی بجائے اضافہ ہو چکا تھا.. خان سلیم، ہمہ وقت دانت نکالتا اپنے اوپر فقرے کستا، بے مثال حس مزاح کا مالک اور گمان نہ ہونے دیتا تھا کہ وہ ایک ملٹائی نیشنل کا ایگزیکٹو ہے.. لگتا یہی تھا کہ موصوف نے پوری عمر بازار حسن کے کسی تھڑے پر بیٹھ کر جگتیں کرنے میں گذاری ہے.. اور یہ خاکسار تمامتر برائیوں کی جڑ، بوڑھا کائیاں اور کمینگی میں سب سے بدتر جوان سب کو

یہاں لے آیا تھا..

ان چاروں کے سوا دو نئے رنگروٹ تھے..

قیصر تھا.. سگریٹ پھونکتا.. اگر کسی زرافے پر فریفتہ ہو تو آسانی سے اُس کا بوسہ لے سکے اتنا دراز قد.. سلمان کی جاپانی فرم میں اُس کا کولیگ تھا اور اُس کی ضمانت پر ہم نے اُسے قبول کیا تھا.. پہلی بار کوہ نوردی کے لیے کمربستہ ہوا تھا.. اگرچہ یہ بستہ کھل گیا..

اور بٹ صاحب..

خان سلیم نے اسلام آباد سے فون کیا کہ سر جی اگر آپ اجازت دیں تو میرا ایک دوست بہت منت سماجت کر رہا ہے کہ خان جی مجھے بھی ساتھ لے چلو..

میں نے پوچھا.. شہزادے.. وہ بندہ کیسا ہے؟

تو خان سلیم نے نہایت بردباری سے مطلع کیا کہ سر جی وہ بندہ تو نہیں بٹ ہے.. لے آؤں؟

تو خان سلیم کے بقول ہماری ٹیم میں پانچ بندے تھے اور ایک بٹ تھا.. اور یہ بٹ صاحب نہایت معتدل قسم کے بٹ تھے اور اُن کے جوہر بعد میں ایسے کھلے کہ کھلتے ہی چلے گئے اور اُنہیں بند کرنا مشکل ہو گیا۔

تو ہم ابھی بالاکوٹ سے نکل کر وادیٔ کاغان کی تنگی میں داخل ہو کر چند موڑ گھومے ہیں، نئی شاہراہ کے لطف سے آشنا ہی ہوئے ہیں اور ذرا کی ذرا بلند ہی ہوئے ہیں تو نیچے دریائے کنہار کے کنارے پارس کا قصبہ نظر آنے لگا..

اس پارس سے ہم کبھی چھوئے تھے..

اگر ہم سونا نہ بن سکے تو اس میں پارس کا کوئی قصور نہ تھا..

''جب دل ہی ٹوٹ گیا..اور قصور کی بسنت''

انگلستان سے واپسی پر..

اور یہ بھی کوئی چالیس برس پیشتر کا قصہ ہوگا، میں نے اپنے دو عزیز از جان دوستوں، خاور زمان اور طیب حسن کو ورغلایا کہ تم بے شک سول سروس کے امتحان کی تیاریوں میں ڈوبے ہوئے ہو لیکن ذرا اُبھرو..کچھ فراغت حاصل کرو..میں نے سنا ہے کہ وادیٔ کاغان میں ایک قصبہ پارس نام کا ہے اور وہاں سے ایک روز کی پہاڑی مسافت پر اوپر کوئی جنگل ہے جس کے درمیان شاران نامی کوئی جگہ اور ریسٹ ہاؤس ہے جس کے حسن کا کُل عالم میں چرچا ہے اور اُس کی شادابی اور تازگی کے قصے زبانِ زدِ عام ہیں..تو وہاں جاتے ہیں..کچھ دن ٹھہرتے ہیں اور پھر وہاں سے بالا ہی بالا..بالاکوٹ سے بھی بالا پہاڑوں میں سیر کرتے ہوئے کاغان کے قصبے تک پہنچ جائیں گے..

خاور تو فوراً ورغلایا گیا کہ وہ چھٹی جماعت سے میرا بیسٹ فرینڈ تھا لیکن طیب نے کچھ شکوک کا اظہار کیا۔''یہ جو پارس وغیرہ ہے تو وہاں سے یہ جو شادمان یا شاران وغیرہ ہے وہاں تک جیپ وغیرہ نہیں جاتی؟''

''نہیں..وہاں سے پیدل جانا ہوگا۔''

''تو پھر میں نہیں جا رہا..عوام الناس کی مانند پیدل چلنا معززین اور جنٹل مین کو زیب نہیں دیتا..میں تو نہیں جا رہا۔''

طیب اُن دنوں ہم سب کی طرح پی۔جی۔وُڈہاؤس کے ناولوں کا شیدائی تھا اور عوام الناس اور جنٹل مین کے درمیان ایک فاصلے پر یقین رکھتا تھا۔ویسے وہ اتنا جنٹل نہیں تھا..کہ ہر ویک اینڈ پر وہ ہمیں زبردستی فلاش کھلاتا اور ہمیشہ اپنی ٹائیوں اور جرابوں کا خرچہ ہم سے رقم جیت کر

پورا کرتا اور ہاں یہ وہی میاں طیب ہے جس کے والد محترم ہر بسنت کے موقع پر ہمیں قصور میں اپنی حویلی میں مدعو کرتے..ہم بچوں کی تعلیم و تربیت کا آغاز اس مشورے سے کرتے کہ بچو قصور جیسے شہر میں جہاں بڑے غلام علی خان اور نور جہاں نے جنم لیا، یہاں بسنت منانے کا قاعدہ یہ ہے کہ بسنت رات کو کسی کوٹھے پر جا کر گانا سنو.نوٹ نئے لے کر جانا اگر تمہارے پاس نہیں ہیں تو مجھ سے لے جاؤ..اور خاندانی وقار کے مطابق ان کو لٹانا.ٹریننگ بہت ضروری ہے..

بڑے میاں صاحب..اور سچی بات ہے اگر کسی غفلت کے لمحے میں میں طیب کی توقیر کرتا تھا تو صرف اُس کے والد صاحب کی وجہ سے..تو بڑے میاں صاحب ایک زمانے میں لاہور ہائیکورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔پھر کچھ خاندانی تنازعات کی وجہ سے اپنی صلح کن طبیعت اور درویشی کے باعث چپ چاپ بوریا بستر اُٹھا کر قصور میں جا ڈیرا جمایا اور دنوں میں کل قصور اُن کا مُرید ہو گیا اور بڑے غلام علی خان اور نور جہاں کے جتنے بھی لواحقین تھے، وہ اُن کا دم بھرنے لگے۔اُن کے سائل اور مداح ہو گئے..

بڑے میاں صاحب کا وطیرہ تھا کہ وہ کسی سے فیس طلب نہ کرتے کہ یہ اُن کے خاندانی آداب کے منافی تھا..چنانچہ اُن کی حویلی کے صحن میں بکریاں، مرغیاں اور کبھی کوئی بھینس منڈلاتی نظر آتی..جو اُن کے شکر گزار کلائنٹ رقم نہ ہونے کے باعث اُن کی نذر کر جاتے۔

وہ ایک ایسے یکتائے روزگار اور شاندار شخص تھے..اُن کی شانداری میں اگر کوئی فرق آتا تھا تو محض طیب کی وجہ سے آتا تھا کہ حیرت ہے یہ ان کا برخوردار ہے..بے شک بعد میں وہ سلطنت پاکستان کے چند بلند ترین عہدوں پر فائز رہا..

مجھے اب تک یاد ہے کہ کسی ایک بسنت کی سویر تھی اور ہم تینوں..ایک جہازی سائز کے پلنگ پر اونگھ رہے تھے یعنی خاور، طیب اور میں..جب بغیر کسی وارننگ کے طیب نے یکدم گلا پھاڑ کر سہگل کی مشہور زمانہ غزل ''جب دل ہی ٹوٹ گیا..ہم جی کے کیا کریں گے'' الاپنی شروع کر دی..

حویلی کے صحن میں جتنی بھی بکریاں اور مرغیاں تھیں اُنہوں نے خوفزدہ ہو کر ممیانا اور کڑکڑانا شروع کر دیا..

میں نے اور خاور نے اُسے بہت چپ کرانے کی کوشش کی..منت سماجت کی..پھر تنگ آ کر ایک تکیہ اُس کے منہ میں ٹھوس کر اُس کی بے سُری بے ڈھبی آواز دبانے کی کوشش کی لیکن وہ

ہمارے قابو میں نہ آیا اور ایک گھگھیائی ہوئی آواز میں گاتا رہا ''جب دل ہی ٹوٹ گیا..''

اس دوران بڑے میاں صاحب جو حویلی کے کسی اور گوشے میں محوِ خواب تھے، اپنے برخوردار کی سُریلی آواز سے بیزار ہو کر بیدار ہوئے اور ہمارے کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے لاڈلے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''طیب پُتر..اگر ہم میراثی ہوتے تو بُھوکے مر جاتے..'' یہ کہہ کر چلے گئے..

اگرچہ خواجہ خورشید جو اُس صدی کے بڑے موسیقاروں میں سے تھے، طیب کے سگے ماموں تھے لیکن سگے بھانجے پر اُن کی موسیقیت کا چنداں شائبہ نہ ہوتا تھا..اُس کی گھگھیائی ہوئی آواز ایسی تھی کہ وہ مُردے جو حضرت عیسیٰؑ کہ ''قُم'' یعنی اُٹھ جا کہنے پر بھی نہ اُٹھتے تھے وہ طیب کا گانا سن کر اپنا کفن پھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور ہاتھ باندھ کر عرض کرتے تھے کہ صاحب.. اب تو درگذر کر دیجئے..جانے بھی دیجئے..سونے بھی دیجئے..

خاور نے بس اتنا کہا، کوئی تنازع نہ کیا کہ اوئے کسان. تم کہتے ہو کہ شاران چلنا ہے.. تو کب چلنا ہے..لیکن یہ پارس ہے کہاں؟

''شاران۔شاران۔چمنِ صد رنگ''

بس یہی پارس تھا جو مجھے دریائے کُنہار کے کنارں پر نظر آرہا تھا..

گذرتا جاتا تھا..

جہاں تقریباً چالیس سال پیشتر ہم تینوں بالاکوٹ سے ایک بس میں بیٹھ کر آئے تھے اور چائے کے چند گھونٹ بھر کر اپنا سامان اُٹھائے بلندی کی جانب اُٹھتی اُس خشک پگڈنڈی پر..جو مجھے نظر آرہی تھی..چڑھنے لگے تھے..

دُھوپ اتنی تیز تھی کہ ہمارے بدن سے چمٹی ایک جونک کی مانند نمی کی آخری بوند بھی چُوستی تھی..

ہم تینوں نڈھال اور بے حال ہو گئے..

اور وہ دونوں مجھے کوسنے لگے..

طیب انگریزی میں اور خاور پنجابی میں..

دونوں آسائش میں پروردہ، ملوک سے نازک بچے تھے اور اُنہوں نے بوجھ اُٹھا کر بے وجہ کسی پہاڑ پر ایک کشمیری ہاتو کی طرح چڑھنے کا سوچا بھی نہ تھا..ویسے تو میں بھی برابر کی آسائش میں پلا بڑھا تھا لیکن اُن کی مانند نارمل بچہ نہ تھا..دماغ کے خلیوں میں کوئی رکاوٹ تھی جو مجھے ایسی بے وجہ آوارگی پر مائل کرتی تھی..

میں اور خاور ذرا آگے چل رہے تھے..پیاسے اور نڈھال جب ہمیں احساس ہوا کہ طیّب کہیں پیچھے رہ گیا ہے..نظر نہیں آرہا..تو ہمارے ذہن میں خدشات اُبھرے..

''کہیں وہ واپس تو نہیں چلا گیا.'' خاور نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کہیں اُسے ریچھ نہ اُٹھالے گیا ہو..ان علاقوں میں بہت ہوتے ہیں۔" یہ میں نے کہا لیکن چند لمحوں کے بعد طیّب نمودار ہو گیا..

وہ ایک مقامی گدھے پر ایک شاہ سوار کی مانند سوار اُسے ہانکتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔

ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ پارس سے پہاڑ پر چڑھ گئے تو تین چار گھنٹوں میں یقیناً شاران کے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جاؤ گے۔

ہم تو چڑھتے گئے..طیّب کا گدھا بھی چڑھتا گیا لیکن شاران نے نہ آنا تھا..نہ آیا۔

دوپہر بھی ڈھلنے لگی..

ایک شرمیلے سے گڈریے سے دریافت کیا "شاران کتنا دور ہے؟"

"نزدیک ہے۔"

"جب ہم اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچیں گے تو ہمیں کھانے کے لیے کچھ مل جائے گا؟" کہ ہم بہت ہی بھوکے ہو چکے تھے..

"اوپر تو صاحب..ایک بڑا بازار ہے۔"

ہم کِھل اُٹھے "اُدھر پراٹھا آملیٹ ملے گا۔"

"دنیا جہان کا شے ملے گا..بازار ہے۔"

"نزدیک ہے ناں؟" ہم نے مزید تصدیق چاہی..

"یہ اوپر جو درخت..بہت نزدیک ہے۔" اُس نے تسلی دی..

اور یہ جو اوپر درخت تھا..لگتا تھا کہ ہمارے اُٹھنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اُوپر اٹھتا چلا جاتا تھا اور نزدیک نہیں آتا تھا..

اور جب ہماری زبانیں پاگل کتوں کی مانند جڑوں سے لٹکتی تھیں، ہم اتنا ہانپتے تھے تو وہ درخت ہم پر ترس کھاتا ہے اور مزید بلند نہیں ہوتا۔ ایک ہی مقام پر کھڑا رہتا ہے اور ہم وہاں اُس کی قربت میں پہنچتے ہیں، پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہیں تو وہاں ایک کھوکھا ہے جس کا مالک اُسے بند کر کے کہیں دور اپنے کھیت میں کام کرنے کو گیا ہے اور جب ایک اور رحم دل گڈریا اُسے بلا کر لاتا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ انڈا پراٹھا ملے گا؟ تو اُس کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے کہ یہ انہوں نے کیا مانگ لیا ہے اور پھر مزید تفتیش کے بعد کھلتا ہے کہ اُس کے ہوٹل میں صرف بُھنے ہوئے چنے ہیں اور

وہ بھی گیلے ہو چکے ہیں..البتہ گُڑ کی دو ڈھیلیاں میسّر تھیں..ہم نے یہ آسمانی خوراک نگلی، چشمے سے پانی پیا اور چل نکلے..

آگے راہ ہموار تھی..

اس ہموار راستے کے دونوں جانب گھنے جنگل تھے جو اس تنہا راستے پر یلغار کرتے تھے۔ اس پر اُمڈے ہوئے تھے اور اسے تاریک کرتے تھے..اس جنگل کے اندر دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں تھا..

ہم اس شب کی سیاہی کے اندر چلے گئے..

جنگل جو آس پاس تھا، کاٹا جا رہا تھا..

اور ہاں طیب کا ڈنکی معاہدہ ختم ہو گیا تھا اور ڈنکی والا اپنے ڈنکی کو لے کر نیچے پارس چلا گیا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں پیدل ہو چکے تھے..

راستے میں شام ہو گئی..

گھنے جنگل میں شام ہو گئی..

دراصل ہم اُس کے اندر تو پچھلے پہر داخل ہوئے تھے اور اُس کی سیاہی نے فوری طور پر شام کر دی تھی لیکن سچ مچ کی شام کے اُترنے کا پتہ یوں چلا کہ کبھی کبھار درختوں میں سے جو ایک آدھ کرن اُتر کر راستے پر بجھتی تھی تو وہ بھی بُجھ گئی..

خاور تیز گام تھا..وہ آگے نکل گیا تھا..

پھر رات ہو گئی..

اُس جنگل میں سفر کرتے رات ہو گئی..

اور اس رات کی آمد کا بھی ہمیں یوں علم ہوا کہ جنگل کو کاٹنے والے مزدور راستے کے کناروں پر الاؤ جلا کر رات کے کھانے کی تیاری کرتے تھے اور ہمیں حیرت سے تکتے تھے کہ یہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں..

طیب اب سنبھل چکا تھا اور لڑھکتا چلا جا رہا تھا اور مجھ سے سنبھلا ہی نہ جاتا تھا۔ سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے..اور میں اپنے آپ کو گھسیٹتا چلا جا رہا تھا..

تو ہم چلتے گئے..اور چلتے گئے۔

اور پھر جیسے کسی سیاہ بادل کی اوٹ میں سے ایک سنہری کرن رونما ہوتی ہے ایسے رات جنگل اور تھکن کی جس سیاہ سرنگ میں ہم سفر کرتے تھے، اُس کے آخر میں ایک روشنی نظر آئی.. اُجالا سا تھا، سیاہی کے سرے پر..

ایک لالٹین جلتی تھی..

اور یہ لالٹین شاران ریسٹ ہاؤس کے چوبی اور سالخوردہ برآمدے میں ہمیں راہ دکھانے کی خاطر آویزاں کی گئی تھی..

خاور اس سرنگ کے آخر میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے اندر تکتا ہمارا انتظار کرتا تھا اور جب ہم اس میں سے برآمد ہو کر اُس کے سامنے آئے تو وہ ہم سے یوں لپٹ گیا جیسے ہم انتقال کر چکے ہوں اور دوبارہ زندہ ہو کر اُس کے سامنے آ گئے ہوں..

شاران ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار جو تنہائی میں زندگی کرتا قدرے خبطی ہو چکا تھا، باورچی خانے میں دیوار کی سلگتی لکڑیوں پر گرم ہوتے توے پر پراٹھوں کو پلٹتا تھا اور جانے کیوں ہنستا تھا۔ پراٹھوں کی مہک پورے شاران میں اُس پر اُمڈتے جنگلوں میں شائیں شائیں کرتی۔ اُس کی سرد ہواؤں اور ستھری فضاؤں میں دُھوم مچاتی تھی اور ہمیں تو مدہوش کرتی تھی..

اُس شب ہمارے خیال کے مطابق شاران پر اتنی بارش اُتری.. اس تواتر سے دھما دھم برسی.. کہ ہم سب کو ڈوب جانا چاہیے تھا..

لیکن اُن پراٹھوں کے ہمراہ درجن بھر انڈوں کی آملیٹ کو اپنے شکم میں اُتارنے کے بعد ہم تو ویسے ہی ڈوب گئے تھے، مزید کیا ڈوبتے..

ریسٹ ہاؤس کی چھت پر بوندیں جلترنگ نہیں بجاتی تھیں، بڑے بڑے ڈھول پیٹتی تھیں..

کبھی کِن مِن ہونے لگتی.. اگلے لمحے پانیوں کی بوچھاڑ اُترتی اور کبھی سیلاب سا آ جاتا اور چھت سے ندی نالے شور مچاتے گرنے لگتے..

یہ نہیں کہ ہم بیدار رہے.. بلکہ خواب میں رہے..

جب سویرا ہوئی اور ہم برآمدے میں آئے تو شاران ایسی دوشیزہ تھی جو شبِ عروسی کی

لذتوں اور اذیتوں سے فارغ ہو کر ابھی نہا دھو کر نکھری تھی..

شاران ریسٹ ہاؤس کے سامنے جو گھاس بھرا میدان تھا اور اُس میں جو گُل صد رنگ کھلے تھے اور اُن کے کناروں پر جو جنگل تھا وہ سب رات کی بارش میں گندھے ہوئے تھے اور بارش کی نم آلودگی اُن میں سے ایک انہونی مہک کی تخلیق کا باعث بن رہی تھی..

گھاس کا ایک ڈھلوان میدان جو بالآخر ایک جنگل میں اُترتا جاتا تھا اُس پر دُھند نہ تھی بلکہ بادلوں کے پَرے کے پَرے اُس پر بھٹک رہے تھے..

چیڑ کے درختوں کے تنوں سے لپٹی بیلوں کے کاسنی پھولوں میں سے ابھی تک بوندیں ٹپکتی تھیں..

ڈھلوان میدان کے دل میں ایک پہاڑی ندی کا سفید شور اُتر رہا تھا جو پچھلی شب بارش کے شور میں گم تھا اور اب ہر سُو گونج رہا تھا.. پتوں اور جھاڑیوں میں جھجکتی بوندیں اُس کے شور سے لرزتی تھیں اور ٹپ سے گر جاتی تھیں.. دل اس باغِ ارم کو دیکھ کر ایسے سہانا ہوا کہ خود بھی باغ ہو گیا..

برآمدے میں سے نکل کر میں میدان میں اُترا.. ایک بھٹکتے بادل کو اپنے بدن میں نمی اُتارتے محسوس کیا۔

شاران کی شادابی کی اس سویر میں بدن میں کونپلیں سی پھوٹنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں اس کی نمی سے نچڑتی نکھرتی گھاس پر منہ اُٹھا کر اس کی سرد شگفتگی والی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اُتارتا رہوں اور دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کچھ دیر ساکت کھڑا رہوں تو میں اُس زمین میں جڑیں پکڑ جاؤں گا.. ایک شجر ہو جاؤں گا..

لیکن میں نے یہ خطرہ مول نہ لیا.. خاور اور طیّب واپسی پر میرے گھر والوں کو کیا بتاتے کہ آپ کا برخوردار ماشاءاللہ شاران میں ایک شجر ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے حرکت کر گیا..

اُس پُرشور سفیدی والی ندی کے کنارے بیٹھ کر میں نے شیو بنائی، دانتوں کو بُرش کیا اور پھر ایک مختصر سا اشنان کیا اور گھاس جیسا ہو گیا، نکھرا اور تر و تازہ.. وہاں سے اُٹھ کر جنگل کا رُخ محض اس لیے کیا کہ اُس میں گمشدہ بادلوں سے اُن کی آوارگی کا جواز پوچھوں اور اگر اُنہیں وہاں سے نکلنے کی آرزو ہے تو راستہ دکھا دوں.. اور جنگل میں داخل ہونے سے پیشتر یونہی مُڑ کر گھاس کے میدان پر نظر ڈالتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس شیونگ کِٹ کو جسے میں ندی کنارے لاوارث چھوڑ

آیا تھا اُسے ایک مقامی کتا ایک کیف کی کیفیت میں مسلسل سونگھ رہا ہے اور جب میں اُس کی جانب بھاگتا ہوا شُوشُو کرتا بھاگتا ہوں تو وہ نابکار اُسے منہ میں دباتا ہے اور فرار ہو جاتا ہے۔

شاید یہ ٹوتھ پیسٹ کی خوشبو تھی جس نے اُسے مسحور کر دیا تھا.. ورنہ اُسے شیو کے سامان میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی..

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں چوکیدار مسکراتا تھا اور وہی دھوم مچاتے پراٹھے بنا رہا تھا.. اور انڈے تل رہا تھا۔

طیّب اور خاور آس پاس کے منظر سے قطعی طور پر لاتعلق فرش پر ایک بوسیدہ کمبل بچھائے اُس پر آلتی پالتی مارے ناشتہ کرنے میں مشغول تھے..

"یار ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے.. میری شیونگ کِٹ ایک ریچھ اُٹھا کر لے گیا ہے.."

طیّب کا رنگ فق ہو گیا..

پچھلی شب جب ہم کھانے سے فارغ ہو کر کمبلوں میں دبکے ہوئے برستی بارش میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتے چوکیدار کے ساتھ گپ لگاتے تھے تو اُس نے ہمیں ان علاقوں میں برفانی شیر اور ریچھ کی موجودگی کے بارے میں داستانیں سنائی تھیں اور ان ہر دو سے ذاتی طور پر ملاقاتوں کے قصے سنائے تھے.. اور اُن دنوں واقعی یہ دونوں جانور شاران کے آس پاس دکھائی دیتے رہتے تھے..

"ریچھ کتنا بڑا تھا؟" طیّب کا نوالہ حلق میں اٹکا ہوا تھا..

"کافی بڑا تھا۔"

"پھر بھی کتنا بڑا تھا؟"

"اُس نے مجھے فیتے سے ناپنے کا موقع ہی نہیں دیا تو کیا بتاؤں کتنا بڑا تھا.."

"اور وہ صرف تمہاری شیونگ کٹ اٹھا کر لے گیا اور تمہیں کچھ نہیں کہا...."

"کچھ کہتا تو میں یہاں موجود ہوتا.."

"میں چوکیدار کو جتنی بھی رقم وہ ڈیمانڈ کرے گا، ادا کر کے اُسے ہمراہ لے کر ابھی واپس بالاکوٹ جا رہا ہوں.." اُس نے اعلان کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا..

"واقعی ریچھ تھا؟" خاور نے پوچھا۔

"نہیں یار.. کتّا تھا.. میں تو مذاق کر رہا تھا.."

"کتّے نے تمہارے شیونگ کِٹ کو کیا کرنا تھا۔" یہ پھر طیب تھا۔

"اور ریچھ نے میری شیونگ کِٹ کو کیا کرنا تھا.. یار کتّا تھا.."

اب جیسا کہ ہمیں کسی کوہ نورد نے گائڈ کیا تھا، ہم نے شاران سے نکلنا تھا اور یونہی مٹرگشت کرتے دریائے کنہار کے کناروں پر جو بلند چٹانیں تھیں اُن پر چلتے ہوئے آسانی سے کاغان کے قصبے تک پہنچ جانا تھا جس نے اپنا نام اس وادی کو دیا تھا..

چوکیدار کا کہنا تھا کہ.. صاحب آپ ادھر سے نکلو گے تو جنگل میں چلتے چلتے تھوڑی دیر میں دریائے کنہار کے عین اوپر جو پہاڑ ہیں وہاں جا نکلو گے اور وہاں سے چلو گے تو دوپہر تک کاغان کے قصبے میں اُتر جاؤ گے..

"اتنا قریب ہے؟"

"ہاں صاحب.."

ہمیں اُس درخت کا تجربہ ہو چکا تھا جو اتنا قریب نہ تھا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

"ایک تو ہم آتا جاتا رہتا ہے اور دوپہر سے پہلے کاغان پہنچ جاتا ہے اور پھر ادھر سے جو بھی صاحب اُدھر کو نکلتا ہے تو ہمیشہ دوپہر کا کھانا اُدھر کاغان کے ہوٹل میں جا کر کھاتا ہے۔ آپ بھی کھاؤ گے۔"

"بے شک ہم دوپہر تک کاغان پہنچ جائیں گے لیکن تم یونہی حفظ ماتقدم کے طور پر چار پانچ پراٹھے اور آملیٹ بنا کر ہمارے پلّے باندھ دو۔"

"کہیں بلند پہاڑوں کی رات میں ایک سرد موت کی قُربت"

شاران ریسٹ ہاؤس کے عقب میں بھی ایک جنگلی جھاڑیوں اور بیلوں سے اٹا پڑا.. نیم تاریک جنگل تھا..اتنا گھنا کہ شاران ریسٹ ہاؤس پر اُتری ہوئی سویر کی روشنی اس کے فرش تک ابھی نہیں آئی تھی..کہیں اوپر ہی اوپر درختوں کی آپس میں گڈمڈ چوٹیوں پر اٹکی ہوئی تھی..

اس جنگل کے اندر رات کی بارش میں بھیگا ہوا جو راستہ تھا ہم اُس کی خوشنمائی کے اسیر ہوگئے..

اتنا بے شمار قدرتی سحر تھا کہ گرفتار ہوگئے۔

قدموں تلے چیڑ کے بال، گھاس اور خودرو پھول مسلے جاتے تھے..گھنے درختوں میں سے جب کوئی پرندہ کسی ٹہنی پر سے اُٹھ کر پر کھولتا تھا تو لرزش سے رات کی بارش کی دو چار بوندیں جو ابھی معلق تھیں، ہم پر گرتی تھیں..اور یہ نہیں کہ ہمیں دور دور تک راستہ دکھائی دے رہا تھا نہیں۔ ہر قدم پر جنگلی بیلوں کے حجاب لٹکتے تھے اور اُن کے پھول آنکھوں میں اُترتے تھے اور ہم ہاتھوں سے اُنہیں اپنے سامنے سے ہٹاتے..ہولے ہولے چلتے تھے..

اُن اَن دیکھے پھولوں میں سے ایک تیز مہک اُٹھتی تھی..

پھر جنگل کا اختتام ہونے لگا..درختوں تلے ایک کشادہ مقام آیا جہاں ہم دم لینے کو رُکے..بھوک زوروں پر تھی..ہم نے اپنے انڈے، پراٹھے تناول کیے۔اور چلنے کو تھے تو کچے اور گیلے راستے پر کچھ نشان دکھائی دیئے جو تازہ لگتے تھے اور کسی جانور کے پنجوں کے لگتے تھے جو ابھی ہم سے کچھ دیر پہلے وہاں سے گذرا تھا..اور ہم یقین سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم تجربہ کار شکاری نہیں تھے جو ایسے پگ مارک دیکھ کر فوراً جان جاتے کہ یہ کس جانور کے قدموں کے نشان ہیں..

لیکن ہم یہ تو دیکھ سکتے تھے کہ یہ کسی بلّی یا خرگوش وغیرہ کے نشان ہرگز نہیں۔ اُن سے بڑا کوئی جانور تھا جو ہماری آمد سے چند لمحے پیشتر ٹہلتا ہوا یہاں سے گذرا تھا اور وہ ریچھ بھی ہوسکتا تھا اور کوئی جنگلی بِلّا بھی ہوسکتا تھا جو شیر کی ایک ادنیٰ قسم ہے..ہم نے مناسب نہ جانا کہ ان قدموں کا پیچھا کر کے تفتیش کی جائے اور کسی حد تک ہراساں حالت میں تیز تیز چلنے لگے..

دو پہر ڈھلنے کو تھی اور وہ چٹانیں نہ آئیں جن کے نیچے جھانکنے سے ہمیں دریائے کنہار نظر آنا تھا اور ہم پھر سے بھوکے ہو رہے تھے..

اس دوران ہمیں ایک گمشدہ قسم کا مقامی شخص ملا جس نے ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ کاغان کچھ دور نہیں، آپ ابھی ادھر پہنچ جاؤ گے،شام سے پہلے پہلے..

اور شام ہوگئی..

شام تک ہم اُس مقام تک پہنچ ہی گئے..اُس چٹانی علاقے میں پہنچ گئے جس کے نیچے گہرائی میں دریائے کنہار بہتا تھا اور اُس کے کناروں کے پہلو میں ایک جیپ راستہ چلا جاتا تھا اور یہاں سے بہت غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتا تھا..

شام ہی نہ اُتری بلکہ..بادل بھی جانے کہاں سے اُترے..ہمیں گھیرنے کے لیے اور ایک سیاہ گھناوٹ میں حاملہ ہوتے ہم پر اُترنے لگے..

اور ہم یہاں تک پہنچ کر اب یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس چٹانی بلندی پر سے ہم کدھر کو جائیں کہ نیچے کنہار تک پہنچیں اور پھر کاغان تک پہنچیں..ہم اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے..بے دھیانی اور خوف میں ہم ایک ایسی اونچائی پر آنکلے جہاں سے نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نہ تھا..

چٹانوں کے بلند قصر تھے جن پر ہم معلق ہو چکے تھے..اور یاد رہے کہ اب دکھائی کم دے رہا تھا..شام ہو چکی تھی..اور سردی کا زور بڑھنے لگا تھا..

ہم ذرا آگے ہو کر جس چٹان پر سے بھی جھانکتے..نیچے تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا اور ہم خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے..

اب کیا کریں..

بھٹکے ہوئے آہو کم از کم ایک صحرا میں بھٹکتے ہیں..جہاں وہ بے شک بھٹکتے رہیں لیکن ایک وسعت میں تو بھٹکتے ہیں..ہماری طرح چٹانوں کے کنگروں پر معلق تو نہیں ہوتے..

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے..
کدھر جائیں گے..

نہ ہمارے سامان میں کوئی خیمہ تھا اور نہ کوئی سلیپنگ بیگ اور نہ ہی خوراک کا ایک دانہ..رات سر پر آ گئی تھی اور سردی ہمارے سروں میں سرایت کر رہی تھی، تو کدھر جائیں گے..

طیّب بار بار مجھے مطعون کر رہا تھا. بازاری عورتوں کی مانند کوس رہا تھا کہ تم ہمیں ورغلا کر یہاں لائے ہو..بغیر کسی منصوبہ بندی کے..اب بتاؤ کیا کریں، کہاں جائیں؟

البتہ خاور کسی حد تک شانت تھا اور مسکراتا جاتا تھا.''اوئے کسان..مروا دیاناں..کہاں لے آئے ہو؟''

میں کیا کہتا، اُن سے کہیں زیادہ ڈرا ہوا تھا''ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس جتنے بھی گرم کپڑے ہیں، مفلر، سویٹر، گرم جرابیں ہیں وہ سب کے سب پہن لیتے ہیں اور بس انہی چٹانوں میں بیٹھے رہتے ہیں پوری رات.صبح ہو گی تو دیکھیں گے.''

''صبح ہو گی تو دیکھیں گے ناں..'' خاور سنجیدہ ہو گیا.''ابھی سے سردی کا یہ حال ہے..رات کو تو درجہ حرارت انجماد سے بھی نیچے گرے گا...ہم اس بلندی پر اور کھلے آسمان تلے رات نہیں گذار سکتے..مر جائیں گے.''

''اور کیا کریں..''

طیّب کا حال مجھ سے بھی بُرا تھا''ہم یقیناً مر جائیں گے..میں تو ابھی سے کانپ رہا ہوں، میرا بدن نیلا پڑ رہا ہے..رات ہو گئی تو کیا ہو گا اور مجھے بہت زوروں کی بھوک لگی ہے، مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی.''

اور واقعی اُس بلند آفت مقام پر رات بسر کرنے کا خوف اپنی جگہ لیکن بھوک کی شدت بھی ہمیں لاغر کر رہی تھی..مرے کو مارے شاہ مدار..

''اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں..نہ ہم واپس کہیں جا سکتے ہیں اور نہ ان چٹانوں سے نیچے جانے کا کوئی راستہ ہے.'' میں نے اپنے سامان کی اتھل پتھل شروع کر دی تا کہ گرم کپڑے نکالے جائیں..

اُس لمحے خاور نے ہمارے آس پاس چند جلے ہوئے ٹنڈ منڈ کوئلہ ہو چکے درختوں کے

تنوں کی جانب اشارہ کیا.''اوئے چودھری..میں تمہیں ایک بات بتاؤں..یہاں پر نہیں ٹھہر سکتے، یہاں پر رات کو بجلی گرتی ہے.شاران ریسٹ ہاؤس میں جب پچھلی رات بجلی گرنے کے گونجدار دھماکے سنائی دیتے تھے تو چوکیدار نے نہیں بتایا کہ صاحب اوپر کے جنگلوں میں ہر رات بجلی گرتی ہے.یہ وہی علاقہ ہے..ذرا غور سے دیکھو ان میں سے چند درختوں پر ابھی پچھلی شب ہی بجلی گری ہے..تو یہاں رات گذارنی ہے؟''

خاور کا مشاہدہ بالکل درست تھا..ہم اس پہاڑی سلسلے کے بلند ترین مقام پر بھٹک رہے تھے..یہاں ہر رات بارش ہوتی تھی اور ہم دیکھ رہے تھے کہ آسمان آہستہ آہستہ بادلوں سے ڈھک رہا ہے اور تاریکی بڑھنے لگی تھی..اور اُس میں وہ جُھلسے ہوئے تنے تاریک ہو رہے تھے..

یہ جگہ باقاعدہ ایک ڈیتھ ٹریپ تھی..

موت کا شکنجہ تھی اور ہمیں بہر صورت یہاں سے نکلنا تھا..چنانچہ ہم نے مشترکہ طور پر یہی فیصلہ کیا کہ اگر مرنا ہی ہے تو سردی سے مرا جائے اور آسمانی بجلی کو ہمیں بھسم کرنے کا موقع فراہم نہ کیا جائے.چنانچہ ہم بلندی سے ذرا نشیب کی جانب اُترے اور پھر چٹانوں پر سے نیچے اُترنے کی کوشش کرنے لگے..ہم کبھی گرتے کبھی کسی پتھر کے ساتھ ٹکراتے..ٹخنے زخمی کرتے..کبھی پھسلتے..ہاتھ چھیلتے اپنے تئیں نیچے جانے کی سعی کرتے رہے لیکن اُتر نہیں رہے تھے.بس اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے کہ کھائی کی ڈھلوان ایسی تھی کہ ہم کسی بھی لمحہ لڑھک کر نیچے جا سکتے تھے.بس تھوڑا سا یہ اطمینان تھا کہ بجلی کی موت سے بچ گئے ہیں..بہت غور سے دیکھنے سے نیچے نشیب میں ایک ندی نظر آتی تھی، رات میں گم ہوتی ہوئی..ہم اب یہ خواہش کرتے تھے کہ کاش ہم اس کے کناروں تک ہی پہنچ جائیں..کم از کم جی بھر کے پانی تو پئیں گے کہ ہم صرف بھوکے ہی نہ تھے پیاسے بھی شدید تھے..تو اس ندی کے کنارے بیٹھ جائیں گے اور صبح کا انتظار کریں گے..ہو سکتا ہے صبح ہو جائے یعنی ہم اُسے دیکھ ہی لیں..

اس دوران ندی کے دوسرے کنارے سے جو پہاڑی بلند ہو رہی تھی اُس کو نظروں سے اوجھل کرنے والے سیاہ بادل ذرا سرکے تو ہم نے دیکھا کہ ڈھلوان پر دو تین جھونپڑے ہیں جن میں سے ایک میں سے دھواں اُٹھ رہا ہے..

یہ دھواں سا جہاں سے اُٹھتا ہے تو ایک ناممکن خواب سے اُٹھتا ہے کہ کاش ہم وہاں پہنچ

سکتے..جھونپڑوں کے اندر سردی سے محفوظ لوگ ہوں گے..آگ ہوگی اور اُس پر کچھ نہ کچھ تو پک رہا ہوگا..

ہم اُن چٹانوں کی اُترائی میں تادیر بھٹکتے رہے یہاں تک کہ دنیا جہان سے مایوس ہو گئے کہ نہ کوئی راستہ نظر آتا تھا اور نہ سکت باقی رہی تھی اور سردی تھی کہ تمام تر گرم کپڑے پہن لینے کے باوجود اپنے برفیلے برچھوں سے ہمیں ننگا کرتی تھی..ہم اُس ندی تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے..

کبھی میں کسی چٹان کے ساتھ ڈھیر ہو کر اُٹھنے سے انکاری ہو جاتا کہ بہت ہو چکی، میں نہیں چل سکتا اور کبھی طیب دوہائی دیتا کہ اگر مرنا ہے تو یہ جگہ بھی مناسب ہے، مزید بھٹکنے سے فائدہ..

تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی..

سردی کے قہر میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا..

ہم تینوں ذہنی طور پر ایک عظیم المیے کے لیے تیار ہو چکے تھے..ایک ایسا المیہ جس میں ہم مرکزی کردار تھے..

ہم چاہتے تو یہ تھے کہ اس آخری وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر خوب خوب روئیں لیکن ہم میں نہ لپٹنے کی سکت تھی اور نہ رونے کی..

بالآخر جہاں کہیں بھی تھے، بیٹھ گئے..ڈھلوان پر بیٹھنا مشکل تھا لیکن ہم جوں توں کر کے بیٹھ گئے..ذرا کھسکتے تو ناتوانی کے باوجود سنبھلنے کی کوشش کرتے..اگر ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی ہوتا..مٹھی بھر چنے نہ سہی دو چار ٹافیاں ہی ہوتیں تو کچھ آسرا ہوتا..

مایوسی کی کھائی میں گرے ہوئے ہمارے ناتواں بدن سردی سے ٹھٹھرتے حسرت بھری نظروں سے اُس جھونپڑے کو دیکھتے تھے جس میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور اُس کی سفیدی نیم تاریکی میں بھی نظر آتی جاتی تھی..

ناتوانی نے ہم سے قوتِ گویائی چھین لی تھی۔ ہم سردی سے کپکپاتے بھی مشکل سے تھے کہ اتنی جان بھی باقی نہ تھی..

ہم اِدھر اُدھر تاریکی میں پڑے اب بے حس ہو چکے تھے..ہتھیار ڈال چکے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کون کہاں ہے کہ بول بھی نہیں سکتے تھے..پکار کر پوچھ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم کہاں ہو..

اس نیم مُردنی میں ہمیں شائبہ ہوا کہ بہت نیچے جو ندی ہے اُسے دو سائے پار کر رہے ہیں..ہم میں سکت نہ تھی کہ اُنہیں آواز دے کر مدد کی فریاد کرتے..

وہ سائے ندی کے پار آئے..ادھر کنارے پر آئے اور پھر چٹانوں میں روپوش ہو گئے..جانے کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے..

تاریکی مزید ڈوب گئی اور اب نہ وہ جھونپڑا دکھائی دیتا تھا اور نہ اُس میں سے اُٹھنے والا دُھواں..

پہلے تو بدن کو کچھ احساس تھا بھوک کا اور کھلے آسمان سے نازل ہوتے سردی کے قہر کا لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ احساس سرد پڑنے لگا..ہم بے خبری اور نیم غنودگی کی حالت میں چلے گئے..

شائد خواب میں اُس نیم غنودگی کی کیفیت میں ہمیں موت کے دو فرشتے دکھائی دیئے جو ہمارے قریب کھڑے تھے..

موت کے متعدد فرشتے تو نہیں ہوتے..غالباً ایک ہی ہوتا ہے تو یہ دو کیسے ہو گئے..

یہ دو سائے تھے..جو جھک جھک کر تاریکی میں ہمارا معائنہ کر رہے تھے کہ ان میں سے کس کی جان پہلے نکالی جائے..

پھر وہ انسانوں کی مانند بولنے لگے..

''کون ہو؟..آپ لوگ کون ہو؟..یہاں کیا کرتے ہو؟''

عام حالات میں ہم شدید طور پر خوفزدہ ہو جاتے کہ ہم نے سُن رکھا تھا کہ شاران کے آس پاس کالا ڈھاکا کا جنگل ہے جس میں مفرور قاتل اور ڈاکو بسیرا کرتے ہیں اور اکثر اوقات راہگیروں کو یا تو قتل کر دیتے ہیں اور یا اغوا کر کے لے جاتے ہیں..ہمیں اس نیم غنودگی کی مردہ کیفیت میں ہر دو صورتیں قبول تھیں..اگر مار ڈالتے ہیں تو ہمیں سردی اور بھوک کی اذیت سے مرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے اور اگر اغوا کرتے ہیں تو کم از کم یہاں سے تو لے جائیں گے ناں! تو ہم بالکل خوفزدہ نہ ہوئے اور ہم میں سے کوئی بڑبڑایا ''مسافر ہیں۔''

''شہر سے آئے ہو؟''

''ہاں..''

''کیوں آئے ہو؟''

"پتہ نہیں۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"پتہ نہیں.."

"یہاں رات کرو گے؟"

"پتہ نہیں۔"

"تو کہاں جاؤ گے؟"

"پتہ نہیں۔"

اس "پتہ نہیں" کی گردان سے اُنہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ اپنے حواس میں نہیں۔

"بھائی ہم آپ کی مدد کے لیے آئے ہیں۔" اُنہوں نے کہا۔

"پتہ نہیں۔" ہم نے کہا۔

"ہم وہ سامنے جو پہاڑ ہے وہاں جو چند چُولہے ہیں وہاں سے آئے ہیں۔"

"پتہ نہیں۔"

"عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ہم اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ندی کے پار جو بلند چٹانیں ہیں اُن میں کوئی مسافر ہیں جو بھٹک رہے ہیں اور اُنہیں راستہ نہیں مل رہا.. تو ہم آپ کی مدد کے لیے آئے ہیں.. اپنے ساتھ لے جانے کے لیے.."

وہ موت کے نہیں مدد کے فرشتے تھے جو آسمانوں سے اُترے تھے..

اُنہوں نے ہمیں سہارا دے کر نیچے اُتارا.. ندی تک لے گئے اور جب ہم نے اُنہیں یہ بتایا کہ ہماری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ہم اس ندی کے کنارے رات گذار سکیں تو انہوں نے ہمیں مطلع کیا کہ صاحب رات کے وقت ادھر بہت درندہ پانی پینے کے لیے آتا ہے.. آپ ادھر رات کرتا تو درندہ لوگ آپ کو کھا جاتا..

اب ہم تازہ دم ہرنوں کی مانند چوکڑیاں بھرتے تھے.. قلانچیں بھرتے اُن دو فرشتوں کے ساتھ ندی پار کر کے پہاڑ پر چڑھتے جاتے تھے اور تاریکی کے باوجود ہمیں سب کچھ دکھائی دینے لگا تھا..

خاور اور طیب نے اپنے بوجھ مددگار فرشتوں کو سونپ دیئے تھے لیکن میں نے اسے ایک

کوہ نورد کی شان کے خلاف جانا تھا بے شک وہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو اور اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے تھا..

وہ دونوں آگے چلے گئے اور اُن کے ہمراہ مددگار فرشتہ حضرات بھی۔

میں تاریکی میں ایک عمودی چڑھائی پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور ایک مقام پر بالکل بے بس ہو گیا.. اٹک گیا بلکہ دم روک کر وہیں ڈھلوان پر پڑا رہا کہ اٹھتا تھا تو رُک سیک کا بوجھ پیچھے لڑھکاتا تھا۔ جب میں بہت دیر تک وہاں بے حس و حرکت پڑا رہا تو کسی اور فرشتے کا ہاتھ آیا اور میرا بوجھ میری کمر سے الگ کر کے اُٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر اوپر لے گیا..

ہم وہاں تھے جہاں سے وہ دھواں اٹھتا تھا..

ڈھلوان پر ناتراشیدہ پتھروں سے تعمیر کردہ ایک تنگ کوٹھڑی تھی جو کہ ایک مسجد تھی اور ہم اُس کی چھت تلے محفوظ مسکراتے تھے.. ایک لالٹین کی روشنی میں ہمارے سامنے کچھ نوجوان اور کچھ بزرگ چہرے بیٹھے تھے.. وہ بھی ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے اور تسلی دیتے تھے.. شاید ہماری حماقت پر مسکراتے تھے اور ہمیں بتاتے تھے کہ ہم تو کیا اگر وہ بھی کھلے آسمان تلے رات گذاریں تو رات تو کیا گذرے گی وہ بھی گذر جائیں گے..

انہوں نے ہمیں پینے کو بکری کا دودھ پیش کیا جو بہت ہی یخ تھا اور حلق سے اُترتا نہ تھا اور مکئی کی روٹی عنایت کی اور وہ بھی اتنی سوکھی کہ برباد کر دینے والی بھوک کے باوجود نگلی نہ جاتی تھی.. ہم کیسے ناشکرے تھے..

اُنہوں نے کوٹھڑی میں ہمارے لیے آگ جلائی تاکہ ہم اپنے ٹھٹھرتے بدنوں کو سینک سکیں.. بحال کر سکیں اور پھر اپنے جھونپڑوں میں چلے گئے..

جب تک آگ جلتی رہی.. جب تک اُس کی آخری چنگاریاں سلگتی رہیں ہم اُن مہربان گوجروں کے عنایت کردہ اونی کمبلوں میں لپٹے آرام سے پڑے رہے لیکن جونہی الاؤ سرد ہوا ہم بھی سرد ہو گئے..

پتھروں کے شگافوں میں سے سردی کا بے مہر قہر داخل ہونے لگا.. اس قہر کو سہارنے کی کوشش میں اگرچہ ہم اپنے آپ کو تسلی دیتے تھے کہ ذرا سوچو کہ تم کتنے بخت والے ہو کہ اب تمہارے شکم دودھ اور مکئی کی روٹی سے پُر ہیں.. سر پر چھت ہے.. کمبلوں میں لپٹے ہوئے ہو.. اگر یہ سب کچھ نہ

ہوتا وہ فرشتے مدد کو نہ اترتے اور تم اس لمحے ندی کے پار کھلے آسمان تلے اب تک شاید مردہ ہو چکے ہوتے..لیکن اس کے باوجود تسلی نہ ہوتی تھی..

ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ لپٹ کر اپنے آپ کو گرم کرنے کی سعی کرتے تھے..ٹھٹھرنا اور کانپنا بس سے باہر ہو چکا تھا اور برداشت سے باہر ہو چکا تھا، اتنی قہر انگیز سردی تھی..

طیب روتا جاتا تھا اور ہم دونوں اپنے آنسو روکے..اُسے دلاسا دیتے تھے کہ یہ شب بھی گذر ہی جائے گی اور وہ چپ نہ ہوتا تھا..

اُس رات ہم تینوں میں سے کوئی ایک تھا جس کا زیر جامہ سردی کی شدت اور خوف سے آلودہ ہو گیا..

اُس قہر کی رات کا بیان ممکن نہیں۔

جو ہم پہ گذری سو گذری..

سورج کی پہلی کرن کوٹھڑی کے پتھروں کی دراڑوں میں سے جھلکی تو ہم باہر آ کر ڈھلوان پر آ بیٹھے..ہم ایسے کوہ پیما تھے جنہیں نیم مردہ حالت میں کسی برفانی دراڑ میں سے نکالا گیا ہو یا ایسے چوہے تھے جو کسی فریزر میں پھنس گئے تھے اور اُنہیں نکال کر دھوپ میں رکھ دیا گیا ہو..

ناشتہ بھی وہی تھا..

بکری کا دودھ اور مکئی کی سخت روٹی..

ایک نوجوان گوجر ہمیں ندی کے پار اُس راستے تک لے گیا جو دریائے کنہار کے اوپر ایک بلند سطح پر دریا کو نظر میں رکھتا کاغان کے قصبے میں جا اُترتا تھا..

ہم زندہ بچ جانے پر خوش تھے..اس قسم کی احمقانہ کوہ نوردی سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو چکے تھے اور کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ آس پاس کیا منظر ہیں..لیکن اس راستے میں دل کو اپنی خوبصورتی اور بناوٹ سے تسخیر کر لینے والا ایک قدرتی تالاب آیا جس میں ایک سرد جھرنا اُترتا تھا..

سردی ایک خواب ہو چکی تھی اور کڑی دھوپ میں چلتے چلتے ہم گرمی سے نڈھال ہو چکے تھے..ہم اُس پوشیدہ سبز پانیوں والے مختصر تالاب میں تا دیر نہاتے رہے اور ہمارے بدن سردی سے نہیں اُس کے سرد پانیوں سے نیلے پڑنے لگے..

طیب پچھلی شب کے رونے دھونے کو بھول کر آج باقاعدہ گھوڑا ہو چکا تھا اور ہم دونوں سے کہیں آگے نکل گیا تھا..

پچھلے پہر جب ہم اس آسمانی بلندی سے اُتر کر دریائے کنہار پر معلق ایک قدیم پُل پار کر کے کاغان کے مختصر قصبے میں داخل ہوئے تو اُس کے واحد تندوری ہوٹل کے باہر طیب پاؤں پسارے لیٹا تھا اور ہمارے لیے آلو شوربہ اور پراٹھے آرڈر کر چکا تھا..

وہ رات ہم نے ایک مقامی مہربان ڈسپنسر کی بدولت کاغان کی نئی نکور ڈسپنسری میں گذاری جہاں سپرنگ بھرے بستروں پر نرم گدّے تھے اور نئے اونی کمبل تھے..

اگلی سویر پہلی جیپ پر سوار ہو کر خاور واپس چلا گیا..ہمیشہ کے لیے کوہ نوردی سے تائب ہو کر بالاکوٹ کے راستے ایبٹ آباد اپنی خالہ جان کی حویلی میں چلا گیا..

البتہ طیب نے ناران تک میرا ساتھ دیا..

یہ بھی چالیس برس پہلے کے قصے ہیں..

میاں طیب حسن..ان دنوں اسلام آباد میں جو تمام بیوروکریٹس کی آخری آرام گاہ ہے وہاں ایک ریٹائرڈ زندگی گذار رہا ہے۔صوبہ سرحد کا سیکرٹری صنعت اور مرکز کے فنانس سیکرٹری کے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد ایک بوڑھے بیوروکریٹ کی مانند ایک بے مصرف اور اُکتائی ہوئی زندگی بسر کرتا ہے..اپنے بلڈ پریشر اور دل کی حرکت کو قابو میں رکھنے کے لیے دن رات کوشاں رہتا ہے..

اور خاور زماں..کبھی آئی جی سندھ اور کبھی ڈی جی ایف آئی اے اور بالآخر ایک عزّت مآب سفیر پاکستان برائے آسٹریلیا..ریٹائر تو ہو چکا ہے مگر میری بچپن کی یاری سے ریٹائر نہیں ہوا اور اب بھی میرا ''بیسٹ فرینڈ'' ہے۔وہ دونوں تو میرے ورغلانے سے وقتی طور پر آوارگی کی زندگی پر مائل ہوئے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے تائب ہو کر ایک معزز اور باوقار زندگی گذارنے لگے تھے لیکن مجھے عقل نہ آئی..میں جینے کے ڈھنگ نہ سیکھ سکا اور اس عمر میں بھی دربدر ہو رہا تھا..

گہرائی میں..دریائے کنہار کے کناروں پر پارس نام کا قصبہ نظر آ رہا تھا جہاں سے چالیس برس پیشتر ہم تینوں جوانی کی نوخیزی میں..شاران کے شائق وہ سامنے والے پہاڑ پر چڑھتے تھے..

شاران..شاران..

''گُلوں میں رنگ بھرتی..کُنہار کنارے..

ناران کی رات میں''

کنارے..دریائے کُنہار کے..
تلے..چیڑ کے درختوں کے..
گرے..زمین پر، چیڑ کے بالوں میں سے..
سونگھتے..آج کی بارش کی اُن میں سے اُٹھنے والی مہک کو..
رات میں..ناران کی..
دریا کے..مدھم سُروں کے ساتھ ساتھ!

پی ٹی ڈی سی موٹل ناران کے وسیع جنگل نما احاطے میں کُنہار کے کنارے ایک الاؤ بھڑکتا تھا..

اُس کی روشنی میں ہمارے چہرے جلتے بجھتے تھے..کبھی بھڑک کر روشن ہو جاتے جیسے اُن پر فلیش کی روشنی چمکی ہو اور کبھی ایسے مدھم ہو جاتے جیسے دیئے کی روشنی میں آ گئے ہوں۔

اور صدیق ڈھولکی والا اپنے فن کی بلندیوں پر..صرف اس لیے کہ ناران خاصی بلندی پر واقع ہے..ایک ناتواں ڈھولکی کو اپنے زانوؤں میں دبوچے بے تحاشا اُس پر اپنی ہتھیلیاں برساتا..اُسے بجاتا کہہ سکتے ہیں ۔ گا رہا تھا..

''وے چھڈ میری بنی نہ مروڑ..کچ دیاں ونگاں تے نہ توڑ''

الاؤ کی روشنی میں بٹ صاحب تھے..سلیم تھا اور شیر ستان تھا اور اُن کے چہرے بھی

بھڑکتے بجھتے تھے..

لیکن یہ جو کبھی بشام میں اور کبھی گلگت میں موٹل مینجر ہوا کرتا تھا، یہ والا شیر ستان ناران میں کیا کر رہا تھا..

وہی، جس کے بارے میں اپنے میاں صاحب کہا کرتے تھے کہ تارڑ صاحب وہ جو آپ کا دوست نہیں ہے عجیب سے نام والا جس کا مطلب بہت سے شیر ہیں، تو وہی..

جب ہم شام ڈھلے..صبح کے لاہور سے چلے شام ڈھلے ناران میں داخل ہوئے تو یہ سینتالیس برس پیشتر کا وادی کشن گنگا مہم کے زمانوں کا وہ ناران تو نہ تھا جس کی کُل کائنات ایک نیا یوتھ ہوسٹل، ایک تنور ہوٹل اور ایک ڈاک بنگلہ تھا..یہ وہ ناران تھا جو مری کے بعد پاکستان کا سب سے پسندیدہ ہل سٹیشن بن چکا تھا..بالاکوٹ سے آنے والی نئی شاہراہ نے اس کے اور اس کے مکینوں کے بھاگ جگا دیئے تھے..اس کا بازار بے شک بے ترتیب تھا لیکن مری کی مال روڈ کا دیسی نمونہ بن چکا تھا جس کے فٹ پاتھوں پر جین ٹائٹ لڑکیاں، شوخ سجیلے نوجوان، شادی شدہ اور نہ بھی شادی شدہ، پُرشوق جوڑے، کراچی کے سیٹھ اور لاہور کے بیوپاری بے فکری سے چہل قدمیاں اور اٹکھیلیاں کرتے تھے اور سرد ہوا میں ٹھٹھرتے اُس خوشبو کو سونگھتے تھے جو جانے کب سے روسٹ ہوئے مرغوں، بجّی کی رانوں، چپّل کبابوں اور کڑاہی گوشت کے اوپن ایئر کھوکھوں میں سے دُھواں آلود اُٹھتی تھی..

دو چار کے سوا بیشتر ہوٹل بے حد مہنگے اور مخدوش..سیزن کے دوران اتنے مہنگے کہ گمان ہوتا تھا کہ اُن میں قیام کرنے والے کچھ لوگ کھال اُتروانے کے بعد روسٹ مرغوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں..

جب گرمیوں کا بھسم کردہ میدانی ہجوم اس مختصر وادی پر یلغار کرتا ہے تو کچی کوٹھڑیوں میں سے بھیڑوں بکریوں کو بے دخل کر کے اُن میں سیّاح داخل کر کے صرف ایک شب کے ہزاروں کمائے جاتے ہیں اور اس کے باوجود بہت سے لوگ رہائش میسر نہ آنے پر کاغان کے قصبے...یہاں تک کہ بالاکوٹ واپس جا کر سر چھپاتے ہیں..

شاید ہی دنیا میں کوئی اور اتنی حسین آبادی ہو جسے کمرشل ازم نے اتنا بدشکل کر دیا ہو..

اسے آسانی سے..نہایت ابتدائی قسم کی منصوبہ بندی سے ایک ترتیب شدہ پہاڑی بستی میں تبدیل کیا جا سکتا تھا جو کسی طور کسی سوس گاؤں سے کم نہ ہوتی..

اس بھدی، نمائشی اور بھڑکیلی بھگدڑ میں صرف پی ٹی ڈی سی موٹل کا ایک پرسکون اور مختصر جزیرہ تھا جہاں ابھی تک پرانے ناران کا قدرتی اور دلکش ماحول ابھی ٹھہرا ہوا تھا..

ہم بہت پژمردہ اور لاہور کی گرمی سے ابھی تک نڈھال موٹل کے احاطے میں داخل ہوئے تو تسلی میں تھے کہ ہمیں جگہ مل جائے گی..صرف اس لیے کہ ہم نے سیانے پن کا ثبوت دیا تھا اور پیشگی بکنگ کروا رکھی تھی..

ریسپشن پر موجود نوجوان جو متعدد ہم جیسے پژمردہ اور نڈھال سیاحوں سے معذرت کر رہا تھا کہ موٹل مکمل طور پر فُل ہے، اُس نے ہماری بکنگ رسید پر نظر نہ کی صرف مجھے دیکھا اور پھر میرے کندھے کے پار کہیں اور دیکھا اور مجھے کہا ''تارڑ صاحب..وہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

اور یہ وہ صاحب..بہت سے شیر یعنی شیرستان تھا جو ٹیلی ویژن کے سامنے ایک صوفے میں دھنسا مجھے دیکھ کر مسکرائے چلا جا رہا تھا..وہ اب ناران موٹل کا کرتا دھرتا تھا..

''تارڑ صاحب..کدھر آ گئے ہو شمال چھوڑ کر..بشام اور گلگت سے بے وفائی کر کے..آئی ایم سوری سر..موٹل تو فُل ہے۔آپ کے لیے کوئی کمرہ نہیں ہے۔''

شیرستان اب بھی ویسا ہی شیر تھا..ایک چھوٹا سا ہیریسن فورڈ..چمڑے کی جھرّیوں والا مسکراتا..عمر کے سامنے سینہ سپر..ہتھیار نہ ڈالنے والا شیرستان۔

چنانچہ یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم فوری طور پر اس کے تسلّط میں آ گئے..

ہم اپنے اپنے کمروں میں آسودہ اور آرامدہ تو ہو گئے لیکن ہم ناران کے لیے تو نہ آئے تھے..ہمیں اس کے سستے بھڑکیلے پن اور بے انت ہجوم میں سے فرار ہو کر آگے..بہت آگے..اور پھر اوپر..بہت اوپر جانا تھا..اور ہمیں وہاں تک ناران کا اکلوتا اور تجربہ کار بشیر زمان دی ٹورسٹ گائیڈ ہی لے جا سکتا تھا..

وہ جانے وہاں موجود بھی تھا یا نہیں.. پہاڑوں کا سیزن تھا اور وہ شاید کسی نہ کسی سرپھرے کوہ نورد کے ہمراہ نکل چکا ہوگا..لیکن وہ موجود تھا اور چند لمحوں کے بعد ہمارے کمرے میں

موجود تھا..

میں اُسے سکردو اور گلگت میں مل چکا تھا جہاں وہ رزق روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔اُن غیر ملکی کوہ نوردوں سے رابطہ کرنے اور اُنہیں اپنی ماہرانہ خدمات پیش کرنے کے لیے آتا تھا جو اُن دنوں وہاں ہجرت کرنے والے پرندوں کی مانند غول کے غول اُترتے تھے اور اب اُنہوں نے وہاں اُترنا ترک کر دیا تھا۔اس ڈر سے کہ کہیں کوئی فوری طور پر جنت حاصل کرنے کا خواہش مند باریش شکاری اُنہیں شکار نہ کر لے..

بشیر زمان ایک مختصر سا معصوم بُڈھا تھا..جس کی توند دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ وہ میری توند کو آسانی سے مات کرتی تھی..

میں نے اُس کے سامنے اپنی خواہشات رکھ دیں''میں پھر سے رتّی گلی جانا چاہتا ہوں...اُس جھیل کے کنارے جس میں سفید راج ہنس تیرتے ہیں۔ایک رات گذارنا چاہتا ہوں..لے چلو گے؟''

''جی جی''

''اور یہ جو نقشہ میں اپنے ساتھ لایا ہوں اس پر کوئی سرال جھیل ہے، میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں..''

''دیکھیں گے صاحب..''

''اور اس بار میں مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا..نہ برفیلی بلندیاں نہ چوٹیاں اور نہ کوئی گلیشیئر..مجھ میں سکت نہیں رہی..صرف مرغزاروں اور سبزہ زاروں میں چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں..ہرے بھرے ٹیلوں اور چمن زاروں میں ٹہلتا ٹہلتا اُن جھیلوں تک جانا چاہتا ہوں..''

''جائیں گے صاحب..''

''راستہ مشکل تو نہیں بشیر..''

''نہیں صاحب..جدھر کدھر آپ جا چکا ہے، اُس کی نسبت تو ادھر بس چہل قدمی ہے..کوئی دشواری نہیں..جیسے ناران ہے ویسے ہی تقریباً وہ ہے..جائیں گے صاحب..''

''ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ کیسے..''

''صاحب آپ تو بہت زمانہ پہلے رتّی گلی کو بوڑا وائی سے گیا تھا لیکن آپ چونکہ جھیل

سرال کو بھی دیکھو گے تو ہم ادھر سے باٹا کُنڈی کے راستے بوڑا وائی سے آگے بیسل تک جائیں گے۔ ذرا آگے جا کر جھیل لُولُوسر پر رات کریں گے اور واپس بیسل آ کر گھوڑوں کا بندوبست کر کے وہاں سے اصل ٹریک شروع کر کے پہاڑوں کے اندر جائیں گے.. جھیل دُودی پُت اور سرال کنارے راتیں بسر کر کے رتی گلی پہنچیں گے.. ادھر رات کریں گے اور پھر واپس بوڑا وائی میں اتریں گے.. کوئی مسئلہ نہیں ہے صاحب.. چہل قدمی کریں گے انشاء اللہ۔"

ہم سب کی آنکھوں میں اتنی ڈھیر ساری جھیلوں کے نام سن کر آتش بازی والے گلرنگ انار چھوٹنے لگے.. غنچہ امید ایسے کھلا کہ بدن کہکشاں ہو گئے..

"ہمیں ایک عدد باورچی بھی درکار ہوگا.."

"درکار ہے صاحب.." بشیر نے صرف اتنا کہا تو ایک باریش باورچی نواز نام کا فوری طور پر نمودار ہو گیا.. بعد میں کھلا کہ اس نے انڈہ تو کیا ابالنا تھا وہ ہم سے پوچھتا تھا کہ صاحب یہ جو سفید سفید ہے، کیا ہے اور اس کا کیا کرتے ہیں.. لیکن ہم اگر اسے اپنے ساتھ نہ لے جاتے تو اپنے آپ پر ظلم کرتے کہ وہ ایک نفیس اور ایماندار اور ہمدرد انسان تھا.. اور ٹین بند خوراک کو گرم کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا..

"صرف ایک چھوٹا سا پرابلم ہے تارڑ صاحب" بشیر نے اپنی پی کیپ جسے وہ کم ہی اپنے سر سے جدا کرتا تھا، اُتار کر اپنی چُندیا پر ایک پُرتکلف کھجلی کی۔ "ایک گورا جانے کہاں سے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آ نکلا ہے تو کل سویرے اسے ملکہ پربت کے بیس کیمپ تک لے جانا ہے.. میں اسے وہاں چھوڑ کر انشاء اللہ شام تک لوٹ آؤں گا اور پرسوں..."

"نہیں بشیر.. پرسوں نہیں.. کل.. ہم ایک اور دن ناران کے اس پاگل پن میں نہیں گذار سکتے.. کچھ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً ہی مان گیا۔ "میں اپنے بھائی کو گورے کے ساتھ بھیج دوں گا۔ میں نے تو شکر کیا ہے کہ آپ نے بالآخر ہمارے علاقوں کا رُخ کیا ہے۔"

بشیر زمان تو بین الاقوامی طور پر جانا جاتا تھا.. اُس نے ازابیل شاہ کو بھی وادی کاغان کے راستے دکھائے تھے..

میاں صاحب نے فوراً ایک تھیلا جو وہ سینے سے لگائے لاہور سے لائے تھے، بشیر کے

سامنے اُلٹ دیا اور اس میں جو پچھلی مہم کے بھانڈے برتن، مگ، تام چینی کی پلیٹیں، دیگچیاں، چمچے اور پراتیں وغیرہ تھیں وہ جھنکتی ہوئی فرش پر لڑھکتی گئیں اور سلمان نے لاہور سے خرید کردہ ٹین بند خوراکیں، آٹے اور چاولوں کے تھیلے، ٹافیوں اور چپس کے پیکٹ ایک نیلے ڈرم میں سے برآمد کر کے نمائش پر رکھ دیے تاکہ بشیر یہ اندازہ لگا سکے کہ مہم کے لیے یہ سب کچھ کافی ہے یا کسی شے کی کمی رہ گئی ہے۔

بشیر نے گن گن کر حساب کر کے اندازہ لگایا اور پھر کہنے لگا "صاحب سب کچھ وافر ہے اور موجود ہے لیکن تیل کا چولہا اور تیل موجود نہیں ہے۔"

"تو خرید لیتے ہیں۔"

"صاحب اگر ہم اس جھنجٹ میں نہ پڑیں تو بہتر ہے.. ناران کے بازار سے گیس کا سیلنڈر خرید لیں.. بھاری تو ہوں گے مگر ستھرے اور قابل اعتماد ہوں گے۔"

میاں صاحب نے پرچم خرید بلند کیا اور اُس کے سائے میں سلمان اور قیصر گیس سیلنڈرز کے علاوہ نمکو، بیسن، دیسی انڈے اور تازہ سبزیاں یعنی آلو، مٹر، گاجریں، لیموں، پیاز اور کھیرے وغیرہ حاصل کرنے کے لیے بشیر کے ساتھ موٹل کے کمرے سے نکل گئے۔

وہ نکلے تو شاید باہر منتظر شیرستان نے کمرے میں جھانکا۔ "جناب عالی، فارغ ہو گئے ہو؟"

"ہاں.. اب میں شانت ہوں کہ کل سویرے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"تو کل سویر تک تو اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیں.. آئیے دریا کنارے بیٹھک کرتے ہیں اور آپ کے لاہور سے آئے ہوئے صدیق ڈھولکی والے سے "چھڈ میری بنی نہ مروڑ" سنتے ہیں اور جشن کرتے ہیں.. آئیں۔"

یہ جو میرا ہم شہر صدیق ڈھولکی والا تھا اُسے شیرستان نے اپنی ترنگ میں آ کر موٹل کے احاطے میں ایک خیمہ الاٹ کر رکھا تھا اور اس کے خورد و نوش کا بھی بلا قیمت بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ موٹل میں قیام پذیر سیاحوں کے کمروں اور کاٹجوں کے سامنے گا بجا کر ڈھولکی بجا کر اپنا رزق کماتا تھا۔ اگرچہ لاہور کا باسی تھا لیکن وہاں اس کی قدر نہ تھی اور وہ فاقوں سے مجبور ہو کر ہر سیزن اپنی ڈھولکی گلے میں ڈالے ناران آ نکلتا تھا..

اس کی آواز کی نسبت اس کی ڈھولکی پر تھاپ زیادہ سُریلی تھی لیکن ناران کی راتوں میں فتح علی خاں تو آپ کے سامنے پرفارم کرنے سے رہے.. تو یہاں کی سرد راتوں میں اس کا دم غنیمت تھا..

''وے چھڈ میری بینی نہ مروڑ..''

اس دوران میں دزدیدہ نظروں سے الاؤ سے پرے اندھیرے میں نظر آتے چیڑ کے درختوں کی گھنی تاریکی میں ایک واہمے کی طرح دکھتے خوشنما کاٹج کو تکتا رہا جہاں کئی برس پیشتر میں نے اپنے خاندان کے ہمراہ قیام کیا تھا.. اپنی نیلی کار پر یہاں تک آیا تھا جو کاٹج کے قریب چیڑ کے ایک جھنڈ میں کھڑی رہتی..

رات کو ہم ناران کے بازار میں اپنی مرغوب گرم گرم جلیبیاں کھانے کو نکل جاتے..

یہ وہ زمانے تھے جب بچّے ابھی بچّے تھے..والدین پر انحصار کرتے تھے..منہ اٹھائے ہر خواہش کے حصول کے لیے اُن کی طرف دیکھتے تھے..جونہی وہ باشعور ہوئے، بڑے ہوئے تو ہم سے الگ ہو گئے۔ اپنے اپنے راستوں پر چل دیئے..ہمارا گھونسلا ترک کر کے اپنے گھونسلے بنا لیے..کیا عینی اپنے امریکی گھر میں..ایک گالف کورس کی جھیل کنارے..آرلینڈو فلوریڈا میں اس لمحے..یہ قیاس کر سکتی ہے کہ اس کا ابّو دریائے کنہار کے کنارے ایک سرد ہوتی رات میں بھڑکتے الاؤ اور اپنے دوستوں سے غافل ہوتا اُس کاٹج کے برآمدے کو تکتا چلا جاتا ہے جہاں ایک گارڈن چیئر پر براجمان صبح سویرے وہ اپنے گھنے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی اور اپنے ابّو کو دیکھ کر کھل کھل جاتی تھی..وہ کیسے قیاس کر سکتی تھی..

آلتی پالتی مارے..الاؤ کے جلتے بجھتے وجود کی قربت میں صدیق ڈھولکی والا اب ''آئے موسم رنگیلے سہانے تو چھٹّی لے کے آ جا بالما'' بڑے والہانہ طور پر الاپ رہا تھا اور خان سلیم نے اپنا بٹوہ وا کر دیا تھا اور اس پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا..

رات جب گہری ہونے لگی اور دریائے کنہار کے پانیوں کا شور بلند ہو کر ذرا دھیما ہوا تو صدیق بھی مدھم ہو گیا۔ ڈھولکی پیٹنے کی بجائے آہستگی سے تھاپ دینے لگا اور ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے'' گانے لگا..

کل سویر ہم نے بھی اُن گلوں میں رنگ بھرنا تھا جن کو دیکھنے کی چاہت ہمیں گرفتار

کر کے یہاں لے آئی تھی..

کیسے کیسے عجب گُل تھے اور کیسے کیسے عجب اُن کے رنگ تھے..

کوئی رنگ رتّی گلی جھیل کا جس میں سفید ہنس کھلتے تھے..

جھیل سرال کی دید کا کوئی گُل..

اور ان راستوں میں کوئی تو ایسا لالہ و گل جس میں سب کہاں شاید کبھی ہماری صورتیں نمایاں ہو جائیں..

ہم انہی گُلوں کے رنگ اپنی بے رنگ آنکھوں میں بھرنے کے لیے ہی تو گھر سے نکلے تھے..

گُلوں میں رنگ بھرے..

''جھیل سیف الملوک..جسے تماش بینوں نے طوائف بنا دیا ہے''

ابھی وہی رات تھی..

ہم ناران سے نکلے تھے..

ایک جیپ میں سوار گئی رات میں ہم ناران سے نکلے تھے..

کچھ شاندار ہوٹل گذرے بلندی سے اُترتے نالے کے کنارے اور کسی کسی کمرے میں روشنی تھی ورنہ وہ تاریکی میں گم تھے..

ہم جو ابھی آرام سے دریائے کنہار کے کناروں پر ''گلوں میں رنگ بھرے'' سن رہے تھے اب جیپ میں ہچکولے کھاتے بے آرام ہو رہے تھے..

ہم گئی رات میں جھیل سیف الملوک کے تنہا مسافر تھے..

یہ نایاب آئیڈیا خان سلیم کے آوارگی میں بہکے ہوئے ذہن کی پیداوار تھا کہ تارڑ صاحب ذرا اپنے اوپر سایہ کرتے چیڑ کے درختوں کو دیکھئے کہ الاؤ کے بجھنے سے اُن کی چوٹیوں پر جو ہلکی چاندنی رُکی ہوئی تھی وہ چھن چھن کر نیچے آنے لگی ہے تو اسی چاندنی کی جھانجھر اس سے جھیل سیف الملوک پر بھی چھنک رہی ہوگی.. پریاں اُتر رہی ہوں گی اور ان پریوں کو مایوس نہ کیا جائے ان سے ملاقات کی خاطر جھیل کو چلا جائے..

میں نے بہت عُذر کیا کہ یار بہت دیر ہو چکی ہے..ہم آج ہی تو لاہور سے چلے تھے، بہت تھک چکا ہوں..صبح سویرے نکلنا بھی ہے تو واپسی پر ناران میں ٹھہریں گے تو وعدہ کہ تب چلیں

گے لیکن خان صاحب کی سوئی اٹک گئی..سر واپسی پر تو ہمیں صرف گھر دکھائی دے رہے ہوں گے، ہم جھیل سیف الملوک نہ جائیں گے اور اگر جائیں گے تو دن کی روشنی کے ہجوم میں..ایسی رات تو نہ ہوگی..

لیکن اتنی رات گئے جیپ تو نہیں ملے گی..

''کیوں نہیں ملے گی..'' شیرستان جو اونگھ میں تھا، فوراً بیدار ہو گیا۔ ''اصغر..'' اس نے اپنے نائب کو مخاطب کیا۔ ''تارڑ صاحب کے لیے اسی وقت ناران کی سب سے آرام دہ جیپ حاضر کی جائے۔''

جیپ اسی وقت حاضر ہو گئی..

اب انکار کی گنجائش نہ تھی..

چنانچہ ہم رات گئے جھیل سیف الملوک کو جاتے تھے..آنکھیں تھکن اور نیند کے بوجھ سے بند ہوتی تھیں اور جیپ کے ہچکولے ہمیں زبردستی بیدار کرتے تھے..

پتہ نہیں وہ چاندنی وہیں دریائے کنہار کے کناروں پر ہی رہ گئی تھی کہ ہم تو ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سفر کرتے جاتے تھے اور صرف جیپ کی ہیڈ لائٹس تھیں جو راستے کی نشاندہی کرتی تھیں..

کہیں چڑھائی کا آغاز ہوا اور کہیں ایک گلیشیئر کی سفیدی روشن ہوئی اور جیپ کے شیشے سردی سے دُھندلا گئے..

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ونڈ شیلڈ میں سے اُبھرتی جھیل کی پہلی جھلک کا منتظر تھا لیکن سوائے اتھاہ تاریکی کے سامنے کچھ نہ تھا..

پھر ایک اُترائی محسوس ہوئی اور جیپ رُک گئی..ہم اندھیرے میں اُتر آئے..میرا خیال تھا کہ ہم اُس مقام پر ہیں جہاں سے جھیل پہلی بار نظر کے سامنے پھیلتی ہے اور پھر آپ پیدل نیچے اترتے اس کے کناروں تک پہنچتے ہیں لیکن نیچے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کسی نے ٹارچ جلائی تو دودھ کے خالی ڈبے، پلاسٹک بیگ اور کچھ ہڈیاں نظر آئیں..

''جھیل کہاں ہے؟'' میں نے ڈرائیور سے پوچھا..

''ادھر ہے صاحب..ہم کنارے پر ہیں۔''

اور وہاں کچھ نہ تھا.. پھر آنکھیں تاریکی کی عادی ہوئیں تو کوئی عجیب سی بے ترتیب بستی نظر آئی جھیل نظر نہ آئی.. بدوضع کھوکھے.. خیمے.. عارضی کمرے، پلاسٹک کی کرسیاں، بوسیدہ خوراک کی ناگوار بُو.. کڑاہی تکہ ہوٹل اور بورڈ.. تندور اور ریت پر بچی کھچی روٹیاں اور تکّے.. بلوچی تجّی اور لاہوری حلیم کے اشتہار..

چاندنی واقعی کنہار کے کناروں پر ہی رہ گئی تھی یہاں تاریکی کا سوگ ہر سُو سیاہ ہو رہا تھا اور وہ بھی بساند آلود سیاہ سوگ..

ہم ٹھوکریں کھاتے اکلوتی ٹارچ کی روشنی میں.. ریستورانوں کے خیموں اور پلاسٹک کی میزوں اور کرسیوں میں سے گذرتے پتہ نہیں کہاں جانا چاہتے تھے.. میں قطعی طور مبالغہ نہیں کر رہا کہ کوشش کے باوجود مجھے جھیل کا کوئی ایک گوشہ بھی نظر نہ آیا.. کیونکہ کھوکھے اور ہوٹل شاید کناروں کے بعد جھیل کے پانیوں پر بھی پھیلے ہوئے تھے.. پاؤں تلے ریت کم آتی تھی اور کاٹھ کباڑ زیادہ.. ویسے یہ بھی غنیمت تھا کہ مجھے اطلاع کر دی گئی کہ جھیل میرے دائیں جانب کہیں ہے.. ہم اپنا کھانا ساتھ لے آئے تھے.. جو مزیدار تھا لیکن شاید صرف ناران موٹل میں.. یہاں پہنچ کر وہ بے مزہ ہو گیا تھا..

پھر کہیں سے ایک مقامی فنکار نمودار ہو گیا اور اس نے گیس کی روشنی میں ہمیں کچھ لوک گیت سنائے جو اس جھیل کی شان میں تھے جو نظر نہ آتی تھی.. جھیل اگر نظر آ ہی جاتی تو پلّو چہرے پر کھینچے ایک ایسی دوشیزہ کی مانند شرمسار جس کی اجتماعی بے حرمتی ہو چکی ہو ایسے نظر آتی.. اور اسے مقامی سیاستدانوں، ضلعی حکام اور مرکز میں بیٹھے ہوئے سیاحت اور ثقافت کے وزیروں نے ہی تو بے حُرمت کیا تھا.. وہ اندھے تو نہ تھے کہ دیکھ نہ سکتے تھے کہ اس پریوں کی جھیل کو کیسے برباد کیا جا رہا ہے.. ہاں وہ اندھے ہو چکے تھے اُس دولت کے لالچ میں جو اس جھیل کی عصمت دری کے نتیجے میں ان تک پہنچتی تھی.. انہوں نے جو صاحب اقتدار ہیں اس جھیل کو ایک طوائف بنا دیا ہے تو کیا انہوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو بھی ایسا نہیں کر دیا کہ یہ جھیل بھی تو کبھی اتنی ہی پوتّر اور بے داغ تھی..

اگر میرا بس چلتا تو میں اُن کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ درج کروا دیتا..

صد شکر کہ میں دن کی روشنی میں یہاں نہیں آیا۔

کہ دن کی روشنی میں یہاں ندیدے سیّاحوں کا ہجوم ہوتا ہے جو اس کے کنارے

پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھ کر چکن کڑاہی نوش کرتے ہیں اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں جھیل کے پانیوں میں پھینکتے ہیں.. جوس اور مشروبات کے خالی ڈبے اس پر اچھالتے ہیں.. ان کے بچے جھیل میں اترنے والے گلیشیئر زیر پرانے ٹائروں پر بیٹھ کر پھسلتے ہیں۔ جھیل میں کشتیاں چلاتے ہیں اور چپس اور ٹافیوں کے ریپر اس کی سطح پر پھینکتے ہیں اور اس کے سوا درجنوں کھوکھوں اور ہوٹلوں میں سے موسیقی کا شور اٹھتا ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

جھیل احتجاج کرنا بھی چاہے تو اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

جھیل کے اردگرد ایک خاردار تار لگا دی گئی ہے اور ہر کھوکھے اور ریستوران نے اس کے کناروں تک جانے والے راستوں کی حد بندی کر رکھی ہے..

"واپس چلیں؟" کسی نے کہا "دیر ہو چکی ہے۔"

"یار مجھے جھیل کے پاس تو لے چلو.. میرا ہاتھ پکڑ کر اس تک لے تو چلو۔" میں نے اصغر سے درخواست کی..

اس نے پلاسٹک کی ایک کرسی اٹھائی. پہلے اسے ہڈیوں سے جھاڑا پھر اٹھائی اور پھر اندھیرے میں میرا ہاتھ تھامے ہوئے کنارے تک لے گیا..

"ادھر بیٹھیں تارڑ صاحب"

میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ایک تاریکی تھی جو اُمڈتی چلی آتی تھی جو یہ کہتی تھی کہ یہاں کبھی ایک جھیل ہوا کرتی تھی جو کنواری اور ان چھوئی تھی اور جس کے حسن کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی تھی لیکن مجھے کچھ دلالوں نے اغوا کر کے فروخت کر دیا۔ میرے دام کھرے کر لیے..

کچھ زیادہ مدّت تو نہ ہوئی تھی جب ایک سویر میں اپنے خاندان کے ہمراہ اس کے کناروں تک پہنچا تھا.. بلندی پر جہاں اس کی پہلی جھلک نظر آتی تھی صرف وہاں ایک ہوٹل تھا جہاں ہم نے ناشتہ کیا تھا اور پھر دوپہر تک ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا.. وہ شاید ہماری ہی منتظر تھی اور عینی کی سہیلی بن گئی تھی اور جب وہ ڈھلوان پر کھلے پھولوں کو توڑتی تھی تو وہ مسکراتی تھی.. اور جب سُمیر اور سلجوق اس کے کناروں پر چلتے چلتے دوسرے کنارے تک چلے گئے تو وہ خوش ہوئی تھی.. ہم نے وہاں جو پکنک منائی تھی تو جھیل ہمارے برابر میں آ بیٹھی تھی..

ہاں..شاید یہی وہ کنارا تھا جہاں میں اب پلاسٹک کی ایک کرسی پر بیٹھا ایک نابینا تھا..کچھ سجھائی نہ دیتا تھا تو شاید یہی وہ کنارا تھا جہاں آج سے سینتالیس برس پیشتر وادیٔ کشن گنگا کو جاتے ہوئے ایک نوجوان نے گورکھا ہیٹ، خاکی پتلون اور فوجی بوٹوں میں ملبوس..پیشانی پر بال بکھرائے افق پر نظریں جمائے ایک تصویر اُتروائی تھی..اگر میں امیر کبیر ہوتا تو دلاّلوں کو منہ مانگی رقم ادا کر کے یہ جھیل خرید لیتا..اسے اپنی رکھیل نہ بناتا..جہاں اس کی پہلی جھلک نظر آتی ہے وہاں ایک چھوٹا سا چبوترا بنوا دیتا کہ جو آئے یہاں کھڑا ہو کر اس دیوی کے درشن کرے اور چند پھول بھینٹ کر کے یہیں سے واپس چلا جائے..اس کے چرنوں کو بھی چھونے کی اجازت نہ دیتا..

لیکن میرے پلّے میں کچھ نہ تھا..

محض اداسی تھی..

محض ملال..

اور محض رنجیدگی تھی..

''سوچ کی سِلور ٹراؤٹ - بے رُوح باٹا کُنڈی اور بُوڑا وائی کا ریسٹ ہاؤس''

ناران سے درّہ بابوسر کو جاتی جیپ روڈ کو ایک چوڑی شاہراہ میں تبدیل کرنے کا کام جاری تھا..چٹانیں بارود سے کنکروں میں تبدیل ہو رہی تھیں..پتھر توڑے جا رہے تھے..جگہ جگہ بل ڈوزر پہاڑوں سے ماتھا لگائے انہیں دھکیلنے..پیچھے کرنے کی جستجو کر رہے تھے..پل تعمیر کیے جا رہے تھے..اور تعمیر کی اس بھگدڑ میں بابر باریش کی ویگن کبھی دیر تک رُکی رہتی اور کبھی رواں ہو جاتی ہمیں باٹا کنڈی تک لے گئی..ہم ناران سے نکلے تو حسبِ سابق دریائے کنہار کے برابر میں رواں ہوئے..

دریا کے پار جو سرسبز بلندیاں تھیں ان میں سے ایک تیز رو نالہ اترتا تھا اور دریا کے بہاؤ میں شامل ہو رہا تھا..اس نالے کے کناروں پر پہاڑ کی ڈھلوان پر تہہ در تہہ اٹھتی ایک دیدہ زیب بستی نظر آ رہی تھی..ایک قدرتی شالیمار کی مانند یہ گاؤں زینہ بہ زینہ نیچے اترتا دکھائی دے رہا تھا..

یہ وادیٔ کاغان میں میرا پسندیدہ ترین گاؤں تھا..

میں چند برس پیشتر ٹراؤٹ کے شکار کے چاؤ میں سوچ کے مقام پر جانے کے لیے جب یہاں سے گذرا تھا تو نیلی کار میں سے مجھے یہ گاؤں پہلی بار دکھائی دیا تھا اور سوچ کی جانب جاتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ اگر کبھی میں اس وادی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر جانے کا قصد کروں تو بس اسی گاؤں میں یہ قصد کر گذروں..میں نے اسے ایک بار پھر حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک آہ بھرنے کو تھا کہ مہم کے آفیشل باورچی انور نے اپنی سیاہ ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"صاحب یہ دریا کے پار میرا گاؤں ہے.. وہ جو تیسری سیڑھی ہے پانی سے اوپر اُس میں میرا گھر ہے.."

"کونسا والا؟" میں نے یہی پوچھا تھا..

"صاحب گھر آپس میں جُڑے ہوئے ہیں یہاں سے معلوم نہیں پڑتا.. جب ادھر بہت برف پڑتا ہے تو ہم لوگ گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے.. گھر برف میں دب جاتے ہیں تو پھر ہم گھروں کے اندر ہی اندر راستے بنا کر ایک دوسرے کے پاس چلے جاتے ہیں.."

"اس کا مطلب ہے کہ سردیوں میں تو گھروں میں آنا جانا لگا رہتا ہوگا.."

"جی صاحب.."

"تو نوجوان جوڑوں کو تو بڑی پرابلم ہوتی ہوگی.."

"نہیں صاحب" انور نے فوراً کہا اور پھر ذرا غور کرنے کے بعد ہنس دیا "ہاں صاحب.. لیکن ہم دستک دے کر دوسرے گھر میں جاتے ہیں.."

سوچ کا علاقہ سڑک کی گہرائی میں وسیع ہوتا چلا گیا.. یہاں کنہار ایک سبزہ زار کے درمیان میں پھیلا ہوا تھا اور یہ وسیع منظر وادی کاغان کی حسین ترین جھلکیوں میں سے ایک ہے.. ہم نے اپنی نیلی کار یہیں کہیں روڈ پر پارک کی تھی اور مچھلی پکڑنے کا سامان سنبھالتے نیچے اُتر گئے تھے اور جب کنہار کے کناروں تک پہنچ کر پلٹ کر دیکھا تھا تو کہیں اوپر ہماری کار ایک کھلونے کی مانند پہاڑوں میں معلق نظر آرہی تھی.. پوری دوپہر ہم ایک شکاری کی مدد سے دریا کے پانیوں میں کُنڈی پھینکتے رہے، پھر ڈور سمیٹتے رہے.. اس آس میں کہ شاید اب اس کے آخر میں کوئی تڑپتی ہوئی مچھلی ہوگی اور وہ نہ ہوئی تھی اور نہ ہوئی یہاں تک کہ ہمارے بازو اس عمل کو ہزاروں بار دہراتے درد کرنے لگے، پتھر ہونے لگے اور پھر دوپہر بھی ڈھلنے لگی اور ہم ہر بار یہ فیصلہ کر لیتے کہ بس ایک مرتبہ اور.. اور اس مرتبہ بھی مچھلی نہ پھنسی تو ہم اس کے شکار پر لعنت بھیج کر ناران واپس جائیں گے اور بازار سے ایک ٹراؤٹ خرید لیں گے.. یہ "بس ایک مرتبہ اور.." بھی سینکڑوں مرتبہ ہوا اور پھر یہ ہوا کہ ناممکن ہوگیا اور ہماری کُنڈی میں نتھنوں سے جکڑی ایک ایسی سلور ٹراؤٹ پانیوں میں سے نمودار ہوئی جو دوپہر کی ڈھلتی دھوپ میں یوں لشکتی تھی کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی..

اور یہ بہت بڑی تھی.. تقریباً تین چار کلو کی ہوگی.. اور میں نے زندگی بھر ایسی چمکتی دمکتی

پھڑکتی اور نہایت حسین ٹراؤٹ نہیں دیکھی تھی.. بچوں نے باری باری اُس ڈوری کو تھام کر جس کے سرے پر اُس کا چاندی بدن ابھی تک دھڑکتا تھا، تصویریں اُتروائیں.. عینی کی تصویر میں مچھلی کی نسبت عینی زیادہ ڈری ہوئی لگتی ہے..

اُس شب ناران موٹل کے ڈائننگ رُوم میں وہاں کا باورچی جو ٹراؤٹ تلنے کے فن میں یکتا تھا.. ایک بڑے طشت میں سلور ٹراؤٹ سجا کر اُس کے گرد آلو کے قتلے اور تازہ سلاد ترتیب دے کر ہماری میز کی جانب آرہا تھا تو وہاں ڈنر کرنے والے دیگر سیاح اپنا کھانا فراموش کر کے حسد کے مارے جل کر راکھ ہوگئے تھے کہ اُنہوں نے شاید اتنی بڑی سلور ٹراؤٹ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی.. یہ باکمال باورچی اب بھی ناران موٹل میں مقیم ہے۔ اگرچہ کنہار اب ٹراؤٹ سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔

سوچ کے آگے.. بہت آگے.. ایک کچی سڑک بلندی کی جانب اُٹھتی تھی اور سیاحوں کے پسندیدہ پکنک سپاٹ "مرغزار" تک جاتی تھی۔

اور ذرا کچھ اور آگے.. روڈ بلاکس پر رُکتے.. انتظار کرتے بقیہ ٹریفک کے ہمراہ قطار میں انتظار کرتے کہ کب بل ڈوزر کسی ایک ٹکڑے کو ہموار کریں اور ہمیں آگے جانے کی اجازت ملے.. اور کبھی ناہموار راستوں پر جُھولتے.. ٹھوکریں کھاتے ہم باٹا کُنڈی کے قصبے میں داخل ہوگئے..

عجیب بے روح سی بستی تھی جس میں صرف ایک چوبی مکان تھا جو نظر کو بھاتا تھا ورنہ پتھریلی کوٹھڑیاں اور کچے گھر تھے اور بازار میں ٹرک کھڑے تھے اور اوپر شاہراہ تعمیر ہو رہی تھی اور وہاں سے دُھول کے بادل اُترتے تھے اور ہم کھانستے تھے..

یہاں تک پہنچے ہیں تو دو بج رہے تھے..

ایک "سجاد ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ" کے سائے میں ہم بابر باریش کو فارغ کرتے ہیں کہ اُس کی ویگن راستے میں سسکتی تھی، مرنے کے قریب ہو چلی تھی اور مشکل سے یہاں تک پہنچی تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ اسے آگے لے جانے پر اصرار کیا تو یہ مرجائے گی تو ہم نے بابر کو ہدایت کی کہ بھائی صاحب آپ اب ناران لوٹ جاؤ اور وہاں ہمارے لوٹ آنے کا انتظار کرو.. تمہیں اس انتظار سے کوئی کُلفت نہیں ہوگی کہ جتنے روز تم ناران موٹل میں ہمارے خرچے پر مزے کرو گے.. تمہاری ویگن بے حرکت رہے گی تو اتنے روز دو ہزار روپے روزانہ کا میٹر چلتا رہے گا تو تم غم نہ

کرو..انتظار کرو..

ویگن واپس چلی گئی تو ہم بے آسرا ہو گئے..

اب ہمیں آگے جانے کے لیے..جھیل لُو لُو سر تک پہنچنے کے لیے جیپ کا آسرا چاہیے تھا..بشیر زماں نے جب کہ ہم سجاد ہوٹل کی دھواں دار چائے نوش کر رہے تھے، ہمیں مطلع کیا کہ اُس نے ایک جیپ کا بندوبست کر لیا ہے جو ہم چھ حضرات..اُسے اور انور باورچی کو اور ہمارے کُل سامان کو اپنے اوپر لاد کر جھیل لُو لُو سر تک لے جائے گی اور کرایہ سولہ سو روپے طے پایا ہے جو ہماری توقع سے ذرا زیادہ تھا لیکن ہم فراخ دل ہو گئے اور قبول کر لیا..

جونہی ہم سب ہوٹل کے اندھیارے قید خانے میں سے باہر نکلے تو مُہیا کردہ جیپ کے نوجوان ڈرائیور نے ہمیں ملاحظہ کیا تو فوراً مُرتد ہو گیا..

میرے سوا سب کوہ نورد حضرات نہایت ڈینڈی اور امیر کبیر نظر آ رہے تھے..قیمتی سیاہ چشمے..نئی نکور امپورٹڈ جیکٹیں..دمکتے سویٹر اور مہنگے جوگرز تو وہ ہمیں دیکھ کر مُرتد ہو گیا.سولہ سو روپے پر ایمان لا چکا تھا ہمیں دیکھ کر بے ایمان ہو گیا کہ اب تو کرایہ ڈھائی ہزار روپے ہو گا..

بشیر نے اُسے بہت ملامت کی کہ ابھی سولہ سو روپے طے ہوئے ہیں اور اب تم ڈھائی ہزار کا مطالبہ کرتے ہو تو یہ کیا شرافت ہے..

تو اُس نے نہایت کورے چہرے سے اور بے دید ہو کر کہا ''میرا خیال تھا کہ یہ مقامی لوگ ہیں لیکن یہ تو ٹورسٹ ہیں۔''

''لیکن یار یہ پاکستانی ہیں، گورے تو نہیں ہیں۔'' بشیر نے منت کی..

''ہیں تو ٹورسٹ...'' اور واک آؤٹ کر گیا..

بشیر اُس کے پیچھے پیچھے واک کر کے بہت دیر تک مذاکرات کرتا رہا..اُس کی منت سماجت کرتا رہا لیکن جیپ ڈرائیور موم نہ ہوا کہ وہ ملاحظہ کر چکا تھا کہ اس سے آس پاس اور دور دور تک کوئی اور جیپ نہیں ہے اور اگر کوئی جیپ کہیں سے نمودار ہو بھی جاتی ہے تو کسی اپنے عزیز یا دوست کی ہو گی اور وہ صورتِ حال بھانپ کر میرے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالے گی..

اس دوران ہم پھر ''سجاد ہوٹل'' کے اندر چلے گئے اور دھوئیں سے سیاہ ہو چکے شہتیروں اور کچی دیواروں سے ٹیک لگائے پھر سے دُھواں دار چائے پیتے رہے اور باہر بازار میں اُن ایک

بابا جی کو نہایت دلچسپی سے دیکھتے رہے جنہوں نے پچھلے ایک گھنٹے سے وہاں ''میلہ'' لگایا ہوا تھا..ایک ہجوم جمع کر رکھا تھا۔ وہ مسلسل بول رہے تھے..کبھی آسمان کو تکتے اور کبھی باری باری ہر شخص کو مخاطب کرتے لگاتار بول رہے تھے..کبھی نظام کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے اور کبھی زمانے کے بدلنے پر غم وغصہ کا اظہار کرتے لیکن اُن کا پسندیدہ موضوع سیاست تھا..کبھی بے نظیر کی خبر لیتے اور فوراً نواز شریف کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتے..دیوانے تو تھے پر اتنے دیوانے بھی نہ تھے کہ پرویز مشرف میں کیڑے نکالتے..ایک آدھ کیڑا نکالنے کے بعد اُس کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کر دیتے... بار بار میرے پاس آ رُکتے اور کہتے..تم داتا کی نگری سے آئے ہو..اُسے میرا سلام کہنا..وہ مجھے جانتا ہے..میری بڑی لمبی سلام دعا ہے اُس کے ساتھ..پھر وہ سب سے منہ موڑ لیتے اور آبدیدہ ہو کر آسمان کی جانب ہاتھ بلند کر کے بلند آواز میں فریاد کرتے..یا اللہ پاکستان کو آزاد کر..اور میری اولاد کو ہدایت دے...میرے بیٹوں کو سمجھا..

میرے حساب سے یہ بابا جی کبھی بہت دانش مند تھے، وہ کہیں کہیں کوئی ایسا لفظ استعمال کر جاتے جو اُن کے پڑھے لکھے ہونے کی گواہی دے جاتا لیکن کہیں زندگی نے یا اولاد نے اُن سے بے وفائی کی اور وہ ایسے ہو گئے اور باٹا کنڈی کے دور افتادہ بازار میں لوگوں کے لیے ایک کھیل تماشا ہو گئے....اور ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا..اگر زندگی میرا لحاظ نہ کرتی بے رحم ہو جاتی اور اولاد دُکھ دیتی تو..میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو سکتا تھا..صرف اس فرق کے ساتھ کہ باٹا کنڈی کی بجائے میں ایک بڑے شہر میں تماشا ہو جاتا..

بشیر اور بے ایمان ڈرائیور کے درمیان مذاکرات جاری تھے..

دوپہر ڈھلتی جا رہی تھی..

کبھی ہم تاؤ میں آ جائے کہ کیسا بلیک میلر شخص ہے سولہ سو روپے طے کر کے مُکر گیا ہے..ہماری مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے..ہرگز نہیں اٹھانے دیں گے اور کسی اور جیپ کا انتظار کریں گے اور کبھی اپنے آپ کو سمجھاتے کہ کیا پتہ آج کوئی جیپ آئے یا نہ آئے اور ہم باٹا کنڈی کے اس بے روح کھنڈر میں..اس دھواں بھرے ریستوران میں رات گذارنے پر مجبور ہو جائیں..ایک دن ضائع کر دیں..بابر باریش کی ویگن کا دو ہزار روپے یومیہ کرایہ اپنے بجٹ میں اضافہ کر لیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس بلیک میل کے آگے کان لپیٹ کر ہتھیار ڈال دیں..جو ہم

نے ڈال دیے..جیپ ڈرائیور نے البتہ ہم پر ترس کھا کر دو سو روپے کم کر دیے اور ہمارے ہتھیار ڈالتے ہی بے حد فرینڈلی ہو گیا اور یہی بات ہے منزل تک پہنچتے پہنچتے ہم نے اُس کے سارے گناہ معاف کر دیے اور وہ ہمیں باقاعدہ پیارا لگنے لگا۔

مجھے اور میاں صاحب کو سینئر سٹیزنز یا بیکار بابوں کی حیثیت سے ڈرائیور کے برابر میں بٹھا دیا گیا اور بقیہ حضرات جیپ کے پچھلے حصے میں مُہم کے سامان کے بیچوں بیچ ایسے ٹھنسے گئے کہ جب تک پورا سامان نہ نکالا جاتا اُن میں سے کوئی ایک بھی نہیں نکل سکتا تھا..لیکن سب پُر مسرت تھے کہ آج کی شب ہم جھیل لُولُوسر کے کناروں پر ہوں گے..

راستے میں حسب سابق متعدد بار رُکنا پڑا..بُل ڈوزر تو تھے ہی وہاں بڑے بڑے جہازی سائز کے جبڑوں والے کرین بھی تھے جو آہنی ڈائنا سورس کی مانند اپنے جبڑے کھولے پہاڑوں کو ہڑپ کرتے تھے اور اُن سے حاصل کردہ مٹی زیر تعمیر شاہراہ پر بچھاتے تھے..

آس پاس بلندیاں تھیں اور وہاں جو چیڑ کے گھرے سیاہ جنگل دکھائی دیتے تھے وہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور اُن پر بارش اُترتی تھی اور اُس کی نمی ہماری جیپ کے اندر تک آ کر ہمیں گیلا کرتی تھی..

پھر ایک جوگی کی طرح ہم پہاڑوں سے اُترے تو جیپ کی ونڈ سکرین میں سے لکڑی کے تختوں سے تعمیر کردہ ایک پُل ہمارے قریب آ رہا تھا..

فی الحال ہم اس پُل کے پار جاتے ہیں..

اس کے پار بائیں جانب مڑتے ہیں تو بوڑاوائی کا بازار نظر آنے لگتا ہے جو وائلڈ ویسٹ کے کسی عارضی قصبے کے بازار کی شباہت کا ہے..ایک دھول آلود وسعت کے دونوں جانب عارضی چوبی دوکانیں اور ایک رہائشی ہوٹل..پٹرول پمپ..ایک سُپر سٹور..ٹائروں کی دوکانیں..ورکشاپیں..کچھ سامان بردار ٹریلر اور جیپیں..ایک دو تنور ہوٹل اور بازار میں بے مقصد گھومتے ہوئے کچھ طالع آزما لوگ..ایک دوسرے کی جانب شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے گھومتے ہوئے..
اور یہ سب کچھ اس ویرانے میں صرف اس لیے وجود میں آ گیا تھا کہ یہاں سے تیل تو نہیں نکلا تھا البتہ ناران سے بابوسر تک ایک مہنگی شاہراہ تعمیر ہو رہی تھی۔

البتہ دریا کے کنارے بوڑاوائی کی سب سے خوش شکل اور دیدہ زیب ایک ایسی عمارت

تھی جو منظر کو خوش نما بناتی تھی اور اس کی ویرانی میں رُوح بھرتی تھی اور وہ ایک نئی مسجد تھی جو کسی حد تک ایک چینی پگوڈے سے مشابہ تھی اور اُس کی چھت شوخ سُرخ رنگ کی تھی..

ہم پُل کے پار تو جا چکے..

لیکن ابھی اگر پار نہیں جاتے اور لکڑی کے تختوں سے تعمیر کردہ پُل کے قریب آ رہے ہیں جس کے پار بوڑاوائی ہے تو بائیں جانب دریا سے ذرا اونچائی پر مجھے ایک کھنڈر نما عمارت نظر آتی ہے جو شناسا سی لگتی ہے..

سینتالیس برس بعد کوئی مسافر لوٹ کر آئے تو کوئی سرائے اگر شناسا بھی لگے تو کیا یہ معجزہ نہیں ہے..

"بوڑاوائی ایک اور ڈرا دینے والی تنہائی اور خاموشی تھا..

سوائے ایک مسمار ہوتے..راج کے زمانوں کی یادگار ایک ریسٹ ہاؤس کے اور کچھ نہ تھا اور صرف ایک کمرہ تھا جس کی چھت سلامت تھی اور ایک چوکیدار تھا جو راتوں کو لالٹین تھامے ریسٹ ہاؤس کے آس پاس گشت کرتے کچھ بڑبڑاتا تھا..

جہاں گئے زمانوں میں گورا صاحب آ کر ٹھہرتے تھے.."

بوڑاوائی 1914ء میں..1920ء میں..

اور اب 2003ء میں..

بائیں جانب دریا سے ذرا اونچائی پر مجھے ایک کھنڈر نما عمارت نظر آتی ہے جو شناسا سی لگتی ہے..

اور پھر اُس نے مجھے اپنے اندر بلا لیا کہ یوں پاس سے گذرے جاتے ہو اور مُجھ پر ایک نظر ڈال کر چلے جاتے ہو..ابھی سینتالیس برس ہی تو گذرے ہیں جب تم میرے ایک کمرے میں قیام پذیر ہوئے تھے اور دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر 1956ء کے ہندسے درج تھے اور تم بہت دیر تک لالٹین کی روشنی میں اُس پرانے رجسٹر پر جھکے رہے تھے جس میں اُن گوروں کے تاثرات درج تھے جو ہم پر راج کیا کرتے تھے اور اب یوں اجنبی بن کر گذرتے جاتے ہو..

وُہی ریسٹ ہاؤس تھا.. تقریباً اُسی حالت میں موجود تھا لیکن اُس کی ڈراؤنی تنہائی موجود نہ تھی، وہ آبادی میں گھر جا چکا تھا.. مکمل طور پر ڈھے جانے کو تھا لیکن اُس کے اندر ایک سترہ برس کا گرم خون والا.. کچا اور کنوارا لڑکا شاید اب بھی موجود تھا.. لیکن اب میں تو وہ نہ تھا.. میرا اُس سے کیا لینا دینا.. میں نے اس سے ملاقات نہ کی اور پُل کے پار بوڑا وائی میں چلا گیا..

بوڑا وائی کے بازار میں اُترتا ہوں تو امیر حسین شاہ آف کھوڑہ جیسے میرا ہی منتظر ہے، جیسے وہ اپنے نمک کی کانوں کے شہر کو ترک کر کے بوڑا وائی کے اس بلند ویرانے میں صرف اس لیے آیا ہے کہ میں نے ایک روز یہاں سے گذرنا تھا..

ان اجنبی شاہ جی کا بس چلتا تو وہ مجھے وہاں سے جانے نہ دیتے.. مجھے اور میرے ساتھیوں کو بوڑا وائی کی سب سے پُرتکلف چائے پلائی اور چائے سے کہیں بڑھ کر اپنی بے بہا محبت کو میری یادوں کی پہلے سے بھاری گٹھڑی میں باندھ دیا..

اور ہاں میں بار بار اُس تختہ دار پُل کی جانب واپس جاتا ہوں.. صرف اس لیے کہ بوڑا وائی میں داخل ہونے سے پیشتر اس پُل پر سے گذرتے ہوئے دائیں جانب ایک خوش کن ہریاول والی اپنی چوٹیوں پر برفوں کو جھومر کرتے ہوئے وادی نظر آتی ہے..

بہت شناسا دکھائی دے رہی تھی وہ وادی..

''تارڑ صاحب..'' بشیر نے وادی کی جانب ہاتھ اُٹھایا ''ہم اس وادی میں سے واپس آئیں گے.. آج سے سات روز بعد.. لُولُوسر جھیل.. دُودی پت جھیل، سرال جھیل کے کناروں پر راتیں کر کے.. تین بہت بلند درّوں کو عبور کر کے.. رتی گلی چوٹی کو عبور کر کے ہم انشاء اللہ آج سے سات روز بعد اِدھر سے واپس بوڑا وائی میں اُتریں گے..''

میاں صاحب چوکنے ہو گئے۔ ''کون سے بلند درّے؟'' میں چپ رہا تو انہوں نے بھی اصرار نہ کیا اور میں بھی جان گیا کہ تین بلند درّوں کے حوالے نے اُنہیں چونکا دیا تھا کہ یہ کہاں سے آ گئے، ہم نے تو یونہی مرغزاروں میں چہل قدمی کرنی ہے تو ان میں درّے کہاں سے آ گئے..

ماضی کی ایک اور مدھم ہو چکی تصویر میں کہیں کہیں کچھ دکھائی دینے لگتا ہے.. اس ریسٹ ہاؤس میں سے ہم نکلے تھے اور... اور.. ہاں یہی وادی تھی جس میں ہم وادیٔ کشن گنگا جانے کے لیے داخل ہوئے تھے..

لیکن اس بار ہم نے اپنے جھیلوں کے سفر مکمل کر کے اس وادی میں سے بالآخر باہر آنا تھا..

جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا وہاں پر اس کا انجام ہونا تھا..

دوپہر ڈھل رہی تھی اور مجھے تشویش تھی کہ کہیں راستے میں رات نہ ہو جائے اس لیے ہم چند تصویریں اُتار کر شاہ صاحب کی چائے پی کر شتابی سے بوڑا وائی میں سے نکل گئے.. نکلے تو اونچے ہونے لگے.. پھر نیچے ہوتے چلے گئے.. کچھ چڑھائیاں کچھ اُترائیاں اور پھر ایک ایسی اُترائی کہ اُترنے سے تھمتی ہی نہ تھی اور ہمیں بہت نیچے نشیب میں جل کھڈ کا قصبہ نظر آنے لگا.. پرے پہاڑوں میں سے ایک بل کھاتی کچی سڑک اس میں داخل ہو رہی تھی جو ابھی حال ہی میں شاردا آزاد کشمیر سے یہاں تک تعمیر کی گئی ہے..

ہم نے جل کھڈ کو کھڈ میں رہنے دیا اور آگے چلے گئے..

پر آگے آسانی سے نہ گئے.. جیسے اب تک آئے تھے ویسے نہ گئے کہ یہاں پر زیرِ تعمیر چوڑی شاہراہ کا اختتام ہو گیا اور آگے یا اوپر وہی کچھ تھا جو پہاڑوں سے خواہ مخواہ ماتھا لگانے والوں کے نصیب میں ہوتا ہے یعنی ایک تنگ اور چٹانی اور پُر پیچ اور ناہموار.. پتھروں سے اٹی بلندی پر گھومتی ہوئی جیپ روڈ..

ہم جونہی شاہراہ کے فراخ پن سے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے تو ٹائروں کی اچھل کود سے ہمارے دل بھی اُچھل کر حلق میں ٹینس کھیلنے لگے..

یہ جیپ روڈ تو نہ تھی ایک واہیات بیہودگی تھی جس کی چوڑائی ایک جیپ کی چوڑائی سے بھی ذرا کم تھی، چنانچہ جیپ اوپر جھکی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتی اپنے آپ کو بچاتی ایک ٹائر پتہ نہیں کہاں چلاتی لڑھکتی جاتی تھی..

وہ جو نہایت منچلے اور چلبلے ہو رہے تھے یعنی جیپ کے پچھلے حصے میں پیک شدہ حضرات اور طرح طرح کے فحش فلمی گانے الاپتے چلے آئے تھے اُن سب کو سانپ سونگھ گیا اور وہ چپ ہو گئے..

یکدم عافیت سے دہشت میں داخل ہونے سے مجھے بھی اُس سانپ نے سونگھ لیا اور سونگھ کر چھوڑا نہیں مسلسل سونگھتا رہا۔ چنانچہ میری تو گھگھی بندھ گئی اور میں نے بلیک میلر ڈرائیور

سے استدعا کی کہ برادر یہ جو تم نے کیسٹ پر پرانے فلمی گانے فل والیوم پر چھوڑے ہوئے ہیں انہیں بھی سانپ سنگھا دو اور پوری توجہ سے اس نامراد جیپ روڈ پر نظر رکھو..

ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ ہم نے کتنا سفر طے کیا.. یا ایک ہی مقام پر ڈگمگاتے رہے۔ پھر جب ہم ایک بلندی پر نمودار ہوئے تو بہت نیچے ایک فراخ وادی میں بیسل نظر آنے لگا..

”عجیب سی بستی، بیسل.. جہاں ابھی برف پگھلی نہ تھی“

بیسل ایک عجیب سی بستی تھی.. ایک اور طرح کا پڑاؤ تھا.. بلند پہاڑوں کے درمیان میں پھیلا ہوا سلیٹی اور سیاہ رنگ لیے ہوئے ایک مقام.. جہاں آس پاس برفوں کے تودے ابھی پگھلے نہ تھے.. چٹانیں اور چراگاہیں تھیں.. اس بلندی سے جو بکھرے ہوئے سفید اہرام دکھائی دے رہے تھے اور ہمیں وہ برف کے تودے دکھائی دے رہے تھے تو جب ہم بلندی سے چکراتے ہوئے نیچے آئے اور پھر ہموار ہو گئے تو وہ افغان خانہ بدوشوں کے سفید خیمے تھے جو وادی میں سجے ہوئے تھے.. یہ خیمے بھی افغان جہاد کا ایک ثمر تھے جو امریکیوں نے مُہیا کیے تھے.. صدیوں سے یہ خانہ بدوش ان وادیوں میں اُتر کر عارضی پتھریلی پناہ گاہیں تعمیر کرتے تھے یا بھیڑوں کی اُون سے تیار کردہ کُھردرے سیاہ خیموں میں رہتے تھے جو نہ برف کو سہارتے تھے اور نہ بارش کو مکمل طور پر روکتے تھے.. اور اب نائلون کے یہ سفید خیمے بارش اور برف پروف تھے اور ذرا سی دھوپ سے اُن کا اندرون گرم ہو جاتا تھا..

ہم بیسل میں داخل ہوئے تو ایک عجیب بستی میں داخل ہوئے..

ایک وسیع دامن میں ہموار علاقے تھے.. کہیں بڑی بڑی چٹانیں رکھی تھیں اور کہیں سفید خیموں کے پہلو میں پرانے پتھریلے گھر تھے اور ایک پنہاں تنہائی اور چپ تھی.. ڈھلوانوں پر گھوڑے چرتے تھے..

پہلی نظر میں بیسل پریوں کی کہانیوں کا کوئی ایسا قصبہ لگتا تھا جس پر کسی آسیب کا سایہ تھا اور جو ہماری جیپ کے داخل ہونے پر زندہ ہو گیا تھا.. سفید خیموں کی اوٹ میں سے گورے چٹے چہرے جھانکتے تھے..

چپٹی ناکوں والے منگول قسم کے بچے جیپ کے پیچھے بھاگتے تھے..

اور ہر جانب گھوڑے نظر آتے تھے..

اس دوران ایک نہایت دیدہ زیب گدھے کا بچہ نظر آیا جس کے لامبے کانوں پر لال پُھندنے سجے تھے اور وہ ہماری جیپ کے گرد اٹھکھیلیاں کرتا تھا..ہم سب کو اُس سجیلے گدھے کے بچے نے اتنی خوشی دی جو ہمارے اپنے بچوں نے شاید نہ دی ہو گی..ہمیں یقین تھا کہ آج اس بے بی ڈنکی کی سالگرہ ہے اور اس کے مالک نے اسے یوں ڈیکوریٹ کیا ہے اور ہم سب نے بیک آواز ہو کر جب اُسے ''ہپی برتھ ڈے ٹو یُو'' کہا تو اُس نے ایک پیاری سی ''ڈھینچوں'' کر کے گویا ہمیں تھینک یُو کہا۔

''سر جی..جیپ رُکوائیں میں اس بے بی ڈنکی کی تصویر اُتارنا چاہتا ہوں۔'' سلیمان جیپ کے پچھلے حصے میں سے درخواست گذار ہوا۔

''ہم ایک گدھے کے بچے کے لیے یہ رسک نہیں لے سکتے کہ جھیل تک پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے..''

برفیں میدان تک اُترتی آتی تھیں..

اور آس پاس جتنی بھی ڈھلوانیں تھیں سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اُن پر دھوپ کی جو آخری کرنیں تھیں اُن کی زد میں آئے ہوئے دو سیاہ گھوڑے یوں ڈلکیں مارتے تھے کہ اُن پر نظر نہ ٹھہرتی تھی اور خیموں..پتھریلی آماجگاہوں کے درمیان میں..وادی کی ہمواری میں بیسل کا واحد ہوٹل نظر آ رہا تھا جس کا نام صرف ہوٹل تھا..اور اُس کے سامنے ایک تیز رفتار ندی بہتی تھی جس کے کنارے کچھ خیمے ایستادہ تھے جو ملتان سے آئے ہوئے کوہ نوردوں کے تھے..

یہ ہوٹل ایک ڈریم ہوٹل تھا..

ڈریم ہوٹل کبھی فائیو سٹار تو نہیں ہوتے..

کبھی بڑے شہروں میں نہیں ہوتے..

یہ ہمیشہ وہاں ہوتے ہیں جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا..

افغانستان کے صحراؤں کے کنارے تیز ہواؤں سے بچاؤ کے لیے ایک کچے تہہ خانے میں..دشت مرگ کی قربت میں..

نانگا پربت کے سائے میں ترشنگ میں..

بلتستان میں قدیم لداخ روڈ کے کنارے..

ایورسٹ کے بیس کیمپ کو جانے والے راستے میں کسی بدھ خانقاہ کے نواح میں..

شاہ گوری کے راستے میں..

بیسل کے ڈریم ہوٹل میں آسائش تھی..پناہ تھی..چولہے گرم تھے..کچے فرش پر ستھری گوٹے کناری سے مزین رضائیاں تھیں..گرم روٹیاں اور انڈے تھے اور باہر برفیں اور ویران تھی ایک پُرشور ندی تھی..اور ہم اس کے اندر گئے اس کی نیم تاریک پناہ میں چلے گئے تو جی چاہا کہ بقیہ سفر ترک کر کے آج شب یہیں بسیرا کر لیں..

بشیر زماں ہمیں چائے پیتا چھوڑ کر چٹانوں کے اندر جو گھر تھے جن میں سے کسی ایک میں اشرف سردار مقیم تھا، وہ اُس سے ملاقات کرنے چلا گیا تا کہ ہمارے لیے..بلکہ ہمارے سامان کے لیے گھوڑوں کا بندوبست کر سکے جو اُس نے کر لیا..

''گھوڑے کل سویرے جھیل لُولُوسر پر پہنچ جائیں گے سَر..'' بشیر نے واپسی پر اطلاع کی..

''لیکن میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں جناب..''

''ہم تمہیں مشورہ کے لیے ہی تو ساتھ لائے ہیں بشیر..''

''میرا مشورہ تو یہ ہے تارڑ صاحب کہ..ابھی ہم جیپ پر سوار ہو کر جھیل تک جائیں اُسے دیکھیں اور واپس آ کر یہیں ہوٹل کے سامنے ندی کے کنارے خیمے لگا کر رات کریں اور کل سویرے یہیں سے دائیں ہاتھ پر جو پہاڑ نظر آتے ہیں اُن میں چلے جائیں..اگر جھیل پر رات کریں گے تو کل سویرے پھر یہاں تک پیدل واپس آئیں گے اور سفر کا آغاز کریں گے تو کیا خیال ہے..''

''بشیر ایک محبوب کو ایک نظر دیکھنا کچھ اور ہے اور اُس کے ساتھ پوری رات بسر کرنا کچھ اور معاملہ ہے۔ بے شک اس میں دشواریاں ہی کیوں نہ ہوں..ہم رات جھیل پر ہی گذاریں گے اور کل سویرے یہ تین چار کلو میٹر پیدل طے کر کے واپس آ جائیں گے..نو پرابلم''

''تو پھر چلتے ہیں صاحب..شام ہو رہی ہے''

"جھیل لُولُوسر..جس پر سورج کی زردی بجھی رہ گئی اور پھر رات چاندنی"

بیسل کی وادی میں سے نکل کر جس جیپ روڈ پر ہم نے جھیل کے چاؤ میں سفر کیا وہ بھی نامہرباں اور ظالم نکلی لیکن ہم اُسے دوش نہیں دے سکتے تھے کہ جھیلوں کی چاہت میں نابینا ہو چکے کوہ نوردوں کی قسمت میں اسی قسم کی نامہربانیاں اور ظلم ہوتے ہیں..

بالآخر شام ڈھلے ہم ایک موڑ سے ذرا آگے ہوئے اور ابھی ہم اونچائی پر تھے جب ہمیں جھیل لُولُوسر کا سمندر دکھائی دیا جو اُترتی شام کے اندھیروں میں بھی اپنی چھب دکھلاتا تھا اور اپنے نیلگوں پانیوں سے ہمیں رنگتا تھا..

ہم اُترتے تھے..

ایک نالے کے کنارے آکے جو جھیل سے بچھڑ کر بیسل کو جارہا تھا اور اُس پر لکڑی کے تختوں کا ایک مختصر پل تھا جس پر سے ہماری جیپ آسانی سے گذر گئی..اور ہم پانیوں کے برابر میں ایک بلندی پر جب کہ جھیل نشیب میں دور دور تک پھیلتی نظر آتی تھی سفر کرنے لگے..

کبھی ہم اتنے نزدیک ہو جاتے کہ پانیوں کے بوسے لے سکتے تھے اور کبھی اتنے بلند ہو جاتے کہ نیچے پانیوں کو دیکھنے سے خوف آنے لگتا..

جھیل لُولُوسر ہماری توقعات سے کہیں زیادہ وسعت والی تھی..میں نے آج تک اتنی پھیلی ہوئی..طویل جھیل نہ دیکھی تھی..یہ پار کے پہاڑوں کے برابر میں سے ادھر جدھر ہم ڈھلوانوں پر سفر کرتے تھے، چوڑائی میں بہت زیادہ نہ تھی لیکن لمبائی میں اس کا کوئی انت نہ تھا یہ ہمارے ساتھ

ساتھ چلی جارہی تھی..یہی جیپ روڈ درّہ بابوسر کو جارہی تھی جس کے پار چلاس اور گلگت تھے لیکن یہ اتنی مناسب نہ تھی کہ انسان اس پر مزید سفر کرنے کی خواہش کرتا..

شام گہری ہونے لگی..

مجھے گہرائی میں جھیل کنارے کچھ ایسے گھاس بھرے جزیرے دکھائی دیئے جہاں ہمارے خیمے نصب ہو سکتے تھے اور جب میں نے بشیر کو ان کی جانب متوجہ کیا تو وہ کہنے لگا "صاحب ادھر کبھی کبھار پانی آجاتا ہے..ذرا آگے چلتے ہیں جہاں ایک ایسی خیمہ گاہ ہے کہ وہاں سے آپ کو جھیل کا سب سے شاندار منظر دکھائی دے گا.."

ظاہر ہے وہ متعدد بار یہاں آچکا تھا اور جھیل کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔تھوڑی دیر بعد جیپ روڈ چند چٹانوں کے قریب ہوئی اور پھر ہم اُسے ترک کر کے یکدم ڈھلوانوں پر اُترنے لگے..اگرچہ ڈرائیور جھجکتا تھا کہ صاحب ادھر ہی اُتر جاؤ، جیپ نیچے کیسے جائے گی..

اور جب ہم ایک ہموار گھاس اور پھولوں سے اَٹے ہوئے قطعے میں اُترے اور پہلے خدشہ ہوا کہ جیپ اگر نہ رُکی تو ہم جھیل میں گر جائیں گے تو جیپ رُک گئی..

ہم اُترے تو ہمارے گھٹنے جواب دے گئے..لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اُترے اور پھر ہمارا سامان اُترا..

یہ جو ایک بے آباد خاموشی تھی اسے ہم نے آباد کر دیا اور خیمے سر اُٹھانے لگے..جھیل سمندر کہیں نیچے تھا اور اوپر زمین کا ایک خوش نظر ٹکڑا معلق تھا اور اس پر ہم آباد ہو رہے تھے..

باقی حضرات تو اپنے خیموں کو اپنی بیویوں کی طرح جانتے تھے کہ کدھر اُلٹا ہے اور کدھر سیدھا لیکن فکرمند تو میں تھا کہ میرا خیمہ بالکل کنوارا تھا۔امریکہ سے آیا تھا، چینی نژاد تھا، ابھی تک کُھلا نہیں تھا یعنی اس کا بندِ قبا کھلا نہیں تھا اس لیے میں اس کی خصلت سے واقف نہیں تھا۔کیا پتہ یہ ایستادہ بھی ہوتا ہے کہ نہیں..ہو گیا تو جانے اس کی شباہت کیسی ہوگی اور اس کا اندرون مہربان ہوگا یا نہیں..

کچھ عرصہ پیشتر ایک تقریباً نادیدہ نوجوان عمران..جو میری سفری تحریروں کی چاہت میں مبتلا تھا گئی رات میرے گھر آیا..میں سو چکا تھا اُس نے یہ خیمہ میرے بیٹے کے سپرد کر دیا اور کہا کہ امریکہ سے آیا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تارڑ صاحب اگلی بار پہاڑوں میں جائیں تو اس

خیمے میں سوئیں..

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے..

لیکن یہ تحفہ خیمہ پانچ منٹ کے اندر اپنے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا. گنبد شکل کا تھا.. اندرون میں اتنی کشادگی تھی کہ تین حضرات گذارا کر سکتے تھے..دو افراد مزے کر سکتے تھے اور..ایک تارڑ قلابازیاں لگا سکتا تھا. تھینک یُو عمران..

ہمارا آفیشل کُک نواز ایک پتھر کی اوٹ میں کچن ٹینٹ کا قیام عمل میں لا چکا تھا..

کچن ٹینٹ سے جانے آپ کے ذہن میں کیا نقشہ اُبھرتا ہے..کہ ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں ہیں اور ایک جانب ایپرن باندھے پکوان تیار ہو رہے ہیں وغیرہ..لیکن اصل تصویر کچھ یُوں ہے کہ ایک چھوٹی سی ترپال ایک پتھر سے بندھی ہے اور نواز نے اُسے یوں اوڑھا ہوا ہے کہ نیچے ایک گیس سٹوو اُس کی آغوش میں ہے جس پر سُوپ اُبل رہا ہے اور دوسرے سٹوو کے دہانے پر گیس کا غبارہ باندھ کر روشنی کا بندوبست کیا گیا ہے..آپ ترپال کے قریب ہو کر جھکتے ہیں تو اندر سے نواز کا ہاتھ گرم سُوپ کے مگ کے ساتھ برآمد ہو جاتا ہے..

یہ جو نواز تھا اس کی باورچیانہ اہلیت واجبی تھی لیکن ایک ٹریک کے دوران کسی فرد کی اہلیت نہیں اُس کی انسانیت زیادہ اہم ہوتی ہے کہ وہ ہمدرد اور لالچ کے بغیر ہو..وقت پر کام آنے والا ہو..مشکل میں آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لے اور نواز میں یہ تمام تر خصوصیات پائی جاتی تھیں..اور ہم ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے جب اُس نے ہمیں بتایا کہ وہ باقاعدہ حافظِ قرآن ہے اور ایبٹ آباد کی الیاس مسجد میں دینی تعلیم حاصل کر چکا ہے..کوہ نوردی کی بلندیوں پر..اُس کی قرأت ویرانوں میں نُور بھر دیتی تھی کہ اُس کے تلفظ اور ادائیگی میں بہت اثر تھا..

ابھی تک میں نے جھیل لُولُوسر کا تذکرہ نہیں کیا..اُس کی جانب دیکھا نہیں اور نہ ابھی دیکھوں گا کہ کسی بھی منزل پر پہنچ کر کوہ نورد فوری طور پر آس پاس کے منظر میں کھو نہیں جاتا بلکہ ایک بھگدڑ سی مچ جاتی ہے جس میں کوئی اپنا رک سیک کھول رہا ہے..بُوٹ اُتار رہا ہے..پاؤں سہلا رہا ہے..اپنے خیمے کے لیے مناسب جگہ تلاش کر رہا ہے..نشیب نہ ہو..ایسے پتھر نہ ہوں جو رات کو تنگ کریں..اور کوئی لوٹا اٹھائے بگٹٹ بھاگا چلا جا رہا ہے..

اور جب یہ تمام مراحل بخوبی طے پا جاتے ہیں تو پھر ہر کوئی آسودہ حال ہو کر اطمینان

سے اپنے گردونواح پر نظر ڈالتا ہے کہ وہ کس مقام پر خیمہ زن ہے..اور ہمیشہ اُسے قدرت کی جانب سے ایک ایسا انعام ملتا ہے کہ وہ اپنی تھکن اور سفر کی بدحالی فراموش کر دیتا ہے اور اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے اسے اپنی تخلیق کردہ کائنات کا ایک ایسا گوشہ دکھایا جو ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوتا..

میں نے اپنے گردونواح پر نظر ڈالی تو میرا انعام جھیل لُولُوسر کی صورت میں تھا جو دُھند کے غلاف میں سے کبھی یہاں کبھی وہاں جھانکتا تھا..شاید وہ مجھے دیکھتا تھا کہ تم اب تک کہاں تھے..

ویسے جھیل لُولُوسر وہ نہ تھی جو میرے تخیل میں تھی..

مجھے تو بس یہی بتایا گیا تھا کہ درّہ بابوسر کے راستے میں جیپ روڈ کے کناروں پر کوئی جھیل ہے..

لیکن یہ..کوئی جھیل نہ تھی..ایک خاص جھیل تھی..

اگرچہ اس کا کوئی سر پیر نہ تھا..کسی مخصوص شباہت میں قید نہ تھی..کوئی شکل نہ تھی، پانیوں کا ایک وسیع ذخیرہ تھا جو جیپ روڈ کے برابر میں گہرائی میں پھیلا ہوا تھا..کوئی واضح حد بندی نہ تھی..

بلکہ جہاں ہم تھے وہاں سے تقریباً دو کلومیٹر دور اس کا وہ آغاز تو نظر آ جاتا تھا جہاں سے ایک پُل عبور کر کے اس کے کناروں پر اونچے ہوئے تھے لیکن یہ یہاں سے آگے کہاں تک چلی جا رہی تھی یہ جو ایک گلیشیئر نظر آ رہا ہے درّہ بابوسر کی جانب تو جھیل اُس کی اوٹ میں ہو جاتی ہے تو اُس کے آگے کہاں تک جاتی ہے۔ یہ ہم نہیں جان سکتے تھے..

سیف الملوک..صدپارہ، جِنا یا کنجھر بھی ایسی ہیں کہ اُن کی کوئی ایک تصویر اُن کی نمائندگی کر سکتی ہے اُن کی شکل دکھلا سکتی ہے لیکن لُولُوسر کا معاملہ جُدا تھا..یہ ایک مسلسل جھیل تھی..

ایک بکھری ہوئی..مُنتشر جھیل تھی اور اس کی کوئی ایک تصویر اُس کی نمائندگی کرنے سے قاصر تھی یوں اُسے بیان کرنا بھی..اُس کا احاطہ کر کے..مکمل طور پر ممکن نہیں..

گھاس کے ہریاول تختے اس کے کنارے تھے..

اور اس کے بکھراؤ میں ہی اس کا حسن پنہاں تھا کہ یہ بے انت تھی..نظر کی قید سے باہر تھی..مسلسل تھی..

اسی لیے یہ کوئی جھیل نہ تھی..ایک خاص جھیل تھی..

جیسے وان گوگ نے سورج مکھی کے دمکتے روشن زرد پھول پینٹ کیے اور اُس کی موت کے بعد جب وہ انمول ہوئے تو ایک کینوس کو کاٹ کر ہر پُھول کو الگ الگ تصویر کے طور پر فروخت کیا گیا..اوراس کے باوجود کہ ہر پھول اوریجنل پینٹنگ کا ایک ٹکڑا تھا..مکمل تصویر نہ تھا..وہ ایک پھول بھی کامل تصویر تھا..وان گوگ کے بُرش کی نمائندگی کرتا تھا..اسی طور لُولُوسر جھیل کے وسیع کینوس پر بھی دراصل متعدد جھیلیں پینٹ کی گئی تھیں اور ایک وقت میں کسی ایک مقام سے صرف ایک جھیل ہی نظر کے احاطے میں آتی تھی اور پھر بھی وہ ایک جھیل ایک کامل حیرت بھری تصویر تھی..

شام ہوئی تو سورج..جو جانے کب کا غروب ہو چکا تھا اُس کی زردی جھیل کے پانیوں پر بچھی رہ گئی..یہ زرد چادر بچھا کر وہ روپوش تو کب کا ہو چکا تھا پر اُس نے فراموش کر دیا کہ رخصت ہونے سے پیشتر اُسے یہ زرد چادر سمیٹنی ہے تاکہ رات آسکے..

پر بُھول گیا اور زردی کی چادر جھیل کے پانیوں پر بچھی رہ گئی..

تاریکی میں تاریک ہو چکی پہاڑوں کے دامن میں وہ زرد چادر بل کھاتی گلیشیئر کی برفوں کی اوٹ میں چلی جارہی تھی..

اُسے جانے کب اور کس نے یکدم سمیٹ لیا اور رات ہوگئی..

اور ہاں آج پچھلے پہر موسم ابر آلود ہونے لگا تھا اور اس کی ابر آلودگی ہمیں تشویش میں مبتلا کرتی تھی..شمال میں عام طور پر موسم خشک رہتے ہیں کہ مون سون کے بادل اُن بلندیوں تک کم ہی پہنچتے ہیں اور نیچے..مری، سوات اور کاغان میں رہ جاتے ہیں اور یہاں جب مینہ برستا ہے تو برستا ہی چلا جاتا ہے..ہم نے کئی کوہ نوردوں کے دردناک دُکھڑے سنے تھے کہ وہ کیسے وادئ کاغان کے اندر گئے اور بارشیں شروع ہوئیں اور تھمنے کا نام نہ لیا اور وہ بھیگے ہوئے منجمد چُوہوں میں بدل کر دُم دبا کر سفر مکمل کیے بغیر لوٹ آئے..ہمیں بھی تشویش تو تھی لیکن اس ابر آلودگی کا ایک کرشمہ یہ بھی تھا کہ یہ ابر ایسے جھکے کہ ہمارے خیموں کے اندر آنے لگے..

ہم جہاں خیمہ زن تھے وہاں سے کچھ بلندی پر جیپ روڈ تھی جو دکھائی نہ دیتی تھی اور اُس پر چند چٹانیں جھکی ہوئی تھیں جو دکھائی دے رہی تھیں۔اگرچہ رات ہو چکی تھی تو وہاں ایک افغان گڈریا نمودار ہوا اور پھر نیچے اُترتا ہمارے قریب آ گیا..کچھ دیر خاموش کھڑا ہماری شکلوں پر

غور کرتا رہا اور ہم ٹکٹکی باندھ کر اُس کی شکل پر غور کرتے رہے کہ شاید یہ..یہ غور کر رہا ہے کہ ان میں سے کس کو اغوا کر لیا جائے اور پھر اُس نے ایک پیشکش کی..کہ ہم آپ کو ایک پلا ہوا بھیڑ دے گا..مناسب قیمت پر دے گا..آپ اُسے ذبح کر کے بھونو اور کھاؤ..میں تو ایک آسانی سے مان جانے والی عورت کی مانند فوراً راضی ہو گیا کہ جھیل لُولُوسر کے بلند کناروں پر خیمہ زن ہم ایک الاؤ روشن کر کے ایک فربہ بھیڑ روسٹ کرتے ہیں اور یقیناً لیڈر کی حیثیت سے میرے حصے میں ایک لیگ پیس آئے گا تو ایک سرد رات میں اُس پر دانت جماتے ہوئے..بے شک گوشت الگ کرتے ہوئے دو چار بوسیدہ دانت جھڑ جائیں لیکن یہ کیسی ذائقے دار رات ہوگی اور کیا مدتوں تک یاد رہ جانے والا تجربہ ہوگا..

لیکن بشیر نے میری آمادگی بھانپتے ہی میرے ارمانوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا ''تارڑ صاحب..رات ہو چکی ہے..بھیڑ کو ذبح کرنے اور پھر بھوننے میں سویر ہو جائے گی..فی الحال آپ لاہور سے جو مٹن کڑھائی کے ٹین ساتھ لائے ہیں، اُنہیں دیسی گھی کا تڑکا لگوا کر گرم روٹیوں کے ساتھ نوش کر لیں تو بہتر ہوگا۔''

افغان گڈریا ہمارے انکار پر..بے حد مایوس ہو کر شاید ہمیں کوستا پھر سے اوپر چٹانوں کے اندر چلا گیا اور شاید اُس کی شہ پر چند خونخوار کتے تھوتھنیاں ہماری کیمپ سائٹ کی جانب کر کے بھونکنے لگے..اور رات بھر بھونکتے رہے..

زرد چادر سمیٹی جا چکی تھی..اُسے اندھیارے نے نگل لیا تھا..

ہم اپنی خیمہ بستی سے پرے ہو کر..جہاں کچن ٹینٹ میں سے گیس کی روشنی پھوٹ رہی تھی..اُس سے پرے گھاس بھرے کناروں تک چلے گئے..اُن کناروں کے عین نیچے گہرائی میں..جھیل تھی..

جہاں ہم براجمان ہوئے وہاں زمین بہت سرد تھی..بے شک اُس زمین میں سے صدرنگ پھول سر اُٹھاتے تھے..

ہم جہاں بیٹھے تھے وہ گویا زمین کا آخری کنارہ تھا..

ایک قدم بھی آگے جاتے تو لڑھک کر گرتے چلے جاتے..

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم تعداد میں کُل چھ تھے..

چار..عادی مُجرم.. پہاڑوں کی اُلفت کے جرم میں سزایافتہ..خان سلیم..میاں صاحب، سلمان اور یہ خاکسار..اور قیصر اور بٹ صاحب..جو ورغلائے گئے تھے..

ہم اُس تاریک کنارے پر بیٹھے..خیمہ گاہ سے پرے گھاس میں سے سرایت کرنے والی برداشت سے باہر ہوتی یخ بستگی کو برداشت کرتے آج کے سفر کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے تھے..

بٹ صاحب..کچھ ڈرے ہوئے تھے..''تارڑ صاحب..ناران سے جل کھڈ تک تو دل کڑا کر کے..گذارا کر لیا تھا لیکن وہاں سے آگے.. یہاں تک جو روڈ تھی..اُس نے تو میری جان نکال لی تھی..''

''میری بھی تھوڑی سی نکل گئی تھی'' میں نے اقرار کیا۔

''اوئے بٹ..'' یہ خان سلیم تھا جو اُس کے ہراس سے لطف اندوز ہو رہا تھا..''بٹوں کی جان تو نکلی نکلائی ہوتی ہے..مزید کیا نکلے گی..کشمیری تو سدا کے ڈرپوک نمبر وَن ہوتے ہیں کہ بندوق تو خود ہی ٹُھس کرے گی..خود ہی چل جائے گی..''

''خان صاحب..آپ ہماری کشمیری غیرت کو چیلنج نہ کریں..'' بٹ صاحب کو تاؤ آ گیا۔ ''ہم بے شک ایک صُلح جُو قوم ہیں لیکن جو کام آپ نہیں کر سکے ہم نے کر ڈالا ہے..ہندوستان کو وخت نہیں ڈالا ہوا کشمیر میں؟''

''چھوڑ یار..اگر ہم ادھر سے کراس بارڈر وائلیشن نہ کریں تو تم ٹھہر سکتے ہو ہندوستانیوں کے سامنے..''

''خاں صاحب..اگرچہ آپ کوئی خاص خان نہیں ہیں۔'' بٹ صاحب جلال میں آ چکے تھے..''لیکن آپ وہی ہیں ناں کہ سرینگر ایئرپورٹ پر پہنچ کر لوٹ مار کرنے میں مشغول ہو گئے تھے.. اور ہندوستان والوں نے وہاں لینڈ کر کے آپ کا کُھرکس نکال دیا تھا، آپ کیسے بہادر ہو؟''

اس نازک مقام پر میاں صاحب نے مداخلت کی۔''یار بہادری کا کسی ذات یا نسل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، حالات سے ہوتا ہے..ویٹ نامی کتنے جوان تھے.. بنگالی بھائی کتنے قوی تھے..ان دونوں نے لمبے تگڑے امریکیوں اور پاکستانیوں کا کیا حشر کیا..اب ہم لوگ آرائیں ہوتے ہیں..سبزی پیاز کاشت کرنے والے..اور یہ تارڑ صاحب چودھری جاٹ ہوتے ہیں اور

اپنے سامنے ایک دو میٹر کی چڑھائی دیکھ لیں یا کوئی دو چار فٹ چوڑی پہاڑی ندی دیکھ لیں تو ان کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔خوف کے مارے بوسیدہ بتیسی جلترنگ بجانے لگتی ہے۔ایسے جاٹ ہیں کہ اُس مختصر ندی کو خود پار نہیں کر سکتے، کسی بوڑھے پورٹر کی پشت پر سوار ہو کر پار کرتے ہیں..جناب عالی اس آرائیں نے کبھی کسی پورٹر پر سوار ہو کر کوئی ندی عبور کی؟..تارڑ صاحب منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر چپ کیوں بیٹھے ہیں، جواب دیں۔''

مجھے احساس ہوا کہ صورت حال بگڑتی جا رہی ہے اور اگر میں نے مداخلت نہ کی تو جھیل لُولُوسر کی رات میں ذات پات پر فساد ہو جائے گا۔''میاں صاحب.. پہاڑوں میں یہی تو صفت ہے کہ یہ ذات پات، نسل اور مذہب کو مٹا کر سب کو ایک کر دیتے ہیں.. بٹ صاحب..آپ بھی پہاڑوں میں آ کر بٹ نہیں رہتے..''

''یہ بٹ نہ رہے تو کچھ بھی نہ رہے.. بندہ تو ہے نہیں تو بٹ بھی نہ رہے تو کیا رہے..'' خان سلیم نے دانت نکال کر بیان دیا..

ہم کچھ زیادہ ہی ٹھٹھرنے لگے..

ہمارے نیچے جو گھاس تھی وہ گویا فریزر میں لگی تھی..اُس کی ٹھنڈک براہ راست بدن میں داخل ہو رہی تھی..گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر کھلے آسمان تلے اور پانیوں کی تاریکی میں گم ہو چکے ذخیرے کے تقریباً درمیان میں بیٹھیں تو ایسا ہی ہوگا..

ہر سُو ایک اتھاہ خاموشی تھی..

اور پھر اُس رومان پرور خاموشی میں ایک گدھا نہایت پُرسوز ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا جو کہ افغان گڈریوں کی چٹانی اوٹ میں سے کسی گدھی کے عشق میں مبتلا فریاد کر رہا تھا..گدھی اتنی بیوقوف نہ تھی کہ اُس کی فریاد پر کان دھرتی اور اپنے آپ کو برباد کر لیتی..

اُس لمحے جھیل کے پار سیاہی میں ڈوبے پہاڑوں کے عقب میں سے..ابر آلودگی کے درمیان کہیں چھید کر کے ایک بجھا ہوا ناتواں سا چاند اُبھرا کہ وہ اپنے جوبن کی چودھویں شب گذار چکا تھا..اور اُس کی بیمار چاندنی میں ہماری خیمہ بستی کے کناروں سے نیچے گہرائی میں جو جھیل تاریک تھی اُس کی شباہت میں بھی ایک زردی آئی اور پھر اُس کی سطح پر بھی اُس کا عکس نمایاں ہونے لگا..

تاریکی سے الگ صرف جھیل کے پانی ایک مدھم زردی کی تصویر ہونے لگے..

اور شاید ہم شکر گزار ہوئے کہ یہ چاند قدرے لاغر سا تھا، اگر چودھویں کی رات کا ہوتا تو ہمیں پاگل کر دیتا..

کھانے کے بعد سب لوگ فوری طور پر اپنے اپنے خیموں میں روپوش ہو گئے کہ سردی برداشت سے باہر ہو رہی تھی لیکن میں ڈھیٹ بنا وہیں سرد گھاس پر بے سدھ بیٹھا رہا اور پھر مجھے خیال آیا کہ آج تک میں جتنی بھی جھیلوں کی قربت میں خیمہ زن ہوا ہوں، میں اگر اُن کے پانیوں میں اُترا نہیں تو کم از کم اُنہیں محسوس تو کیا ہے.. اگر آپ نے کسی کو چھو کر محسوس نہیں کیا تو وہ محض ایک تصویر ہے..

وہ بیمار چاند بھی پل دو پل کے لیے نمودار ہوا تھا.. پھر سے بادلوں میں دفن ہو چکا تھا، تاریکی اتنی تھی کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا اور میں ڈھلوان پر سے لڑکھڑاتا ہوا اُترا تو اُترتا ہی چلا گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ خیمہ بستی کے کناروں سے جھیل اتنی زیادہ گہرائی میں مقیم ہے.. ٹھوکریں کھاتا.. سانس سنبھالتا کنارے تک آ گیا اور آگے ہو کر اُس کے پانیوں میں ہاتھ ڈالا تو وہ میرے لیے قطعی اجنبی نہ تھے..

اگرچہ یہ پانی برف سردیلے تھے لیکن میں اُن سے اور وہ مجھ سے آشنا تھے کہ تمام جھیلوں کے پانی ایک سے ہوتے ہیں.. جان جاتے ہیں کہ اس لمس میں محبت ہے.. ہمیشہ منتظر رہتے ہیں کہ کوئی آئے اور اُنہیں محسوس کرے.. اور جب کوئی اُلفت بھرا ہاتھ اُن کو چھوتا ہے تو وہ بڑھ جاتے ہیں، لبریز ہو جاتے ہیں اور بے شک آپ کناروں پر ہوں آپ اُن میں ڈوب جاتے ہیں..

"جھیل کی سویر میں ہمارے خیمے بادلوں میں تیرتے پھرتے تھے"

کسی ملتانی مقبرے کے نیلے گنبد پر بارش کی بوندیں.. ٹپ ٹپ..

دھک دھک دستک دیتی تھیں..

جیسے گنبد کا دل دھڑک رہا ہو

ایک نیلی اینٹوں والا گنبد اتنا باریک کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس پر گرتی بوندوں کی آواز مقبرے کے اندر سوئے ہوئے شخص کے کانوں تک آنے لگے..

نیم غنودگی میں یہ دستک ایک تواتر کے ساتھ سنائی دے رہی تھی..

میرے بھاری پپوٹے کھلے تو یہ گنبد ایک تاریک خلا.. اوپر معلق نہ تھا بلکہ میرے سر کے عین اوپر آ چکا تھا.. زرد رنگ کا تھا اور اس پر بارش برستی تھی..

میں فوری طور پر قیاس نہ کر سکا کہ میں کہاں ہوں.. اپنے نئے خیمے میں تو ہوں لیکن کہاں ہوں.. اور یہ ناسمجھی کوہ نوردی کی ہر سویر میں آپ کو کچھ لمحوں کے لیے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے.. پھر دماغ پر زور دینے پر یکدم احساس ہوتا ہے کہ آپ اپنے بستر میں تو نہیں ایک سلیپنگ بیگ میں لپٹے ہوئے ہیں اور کہیں بلند پہاڑوں میں ہیں.. کہاں ہیں.. جھیل لُولُوسر کے کناروں پر!

بارش کا نم آلود احساس بدن میں ایک نامعلوم لذت بھرتا تھا جو صرف نمی ہی بھرتی ہے.. گرمی پہ آئے ہوئے کسی اور بدن کے پسینے کی یا بے اختیاری کے پہلے لمحوں کی.. لیکن یہ رومان صرف چند لمحوں کا تھا اور اس نم لذت کے عین درمیان میں خدشے کا ایک بڑا سارا پتھر غڑاپ سے

گرا اور تمام لطف غارت کر دیا کہ.. یہ تو محض بارش ہے اور مسلسل ہے اور اگر اسی طور رُکے بغیر برستی رہی تو خیمے کیسے سمیٹیں گے.. کیسے سفر اختیار کریں گے.. کہیں ہمیں یہاں رُکنا نہ پڑ جائے.. یہ خیال ازحد اندوہناک تھا کہ ہمیں اس مقام پر اس جھیل لُولُوسر کے کنارے ایک اور رات بسر کرنی پڑے گی.. کہاں آپ اس کی پہلی جھلک دیکھ کر عمر بھر یہیں پڑے رہنے کا سوچتے ہیں اور کہاں یہی خیال محض ایک اور شب بسر کرنے کا اندوہناک ہو جاتا ہے.. اس لیے کہ کوہ نوردی نام ہی اگلی سویر کوچ کر جانے کا ہے.. نئے منظروں کے چاؤ میں خیمے سمیٹ لینے کا ہے.. یہ پہلی نظر میں شدید محبت میں مبتلا ہو جانے کا پھر اپنی ہوس پوری کر کے اگلی سویر بے وفائی کر جانے کا نام ہے..

کوہ نورد بنیادی طور پر ہوس پرست اور ہرجائی ہوتے ہیں..

باہر خیمہ بستی میں کچھ ہل جل کے آثار سنائی دے رہے تھے.. کچھ آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں کبھی کبھار ایک گھوڑا ہنہناتا تھا..

''خاں صاحب..'' میں نے سلیم کو آواز دی۔ ''آپ کے خیمے پر بھی بارش ہو رہی ہے؟''

''نہیں جی.. ادھر تو خیر سے دھوپ نکلی ہوئی ہے۔''

میں نے اس بدتمیز جواب کے بعد میاں صاحب کو پکارنا زیادہ مناسب جانا۔ ''میاں صاحب.. بارش ہو رہی ہے تو اب کیا ہو گا؟''

''اب تو وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا جنابِ عالی..''

''بٹ صاحب..'' میں نے سوچا اب کسی بندے کی بجائے کسی بٹ کو پکارا جائے۔ ''کیا حال ہیں؟''

''سردی بہت ہے تارڑ صاحب۔''

''کشمیریوں کو بھی سردی لگتی ہے۔''

''اگر کشمیری گکھڑ منڈی میں پیدا ہوں تو بہت لگتی ہے۔''

اتنی دیر میں بشیر بُدھا کی آواز میرے خیمے کے پردے پر لرزی ''تارڑ صاحب.. گھوڑے آ گئے ہیں..''

''کہاں سے آ گئے ہیں؟''

''بیسل سے آ گئے ہیں۔''

''کیوں آ گئے ہیں..'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ صبح سویرے برستی بارش میں گھوڑے کہاں سے آ گئے ہیں اور کیوں آ گئے ہیں.. میں نے خیمے کی زِپ کھول کر باہر جھانکا تو بشیر ایک برساتی میں اپنی توند نمایاں کیے میرے سامنے تھا..

''صاحب تین گھوڑے جو بیسل سے آنے تھے، آ گئے ہیں..''

''اکیلے ہی آ گئے ہیں.. ٹھک ٹھک کرتے.. کیوں بشیر؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

بشیر کی مسکراہٹ کانوں تک چلی گئی اور کسی بھی پہاڑوں کی سویر میں بشیر کا چہرہ سب سے پہلے نظر آنا ایک نہایت پُر لطف اور خوش کن تجربہ تھا کہ وہ بہت خوش مزاج اور ایک گول مٹول ٹیڈی بیئر تھا جو بُدھا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا..

''بارش کا کیا ہو گا؟''

''رُک جائے گی انشاء اللہ.. آپ باہر آ کر ناشتہ تو کریں.. تیار ہے۔''

میں باہر آیا اور آس پاس نظر کی تو پتھر ہوتا ہوتا بچا..

کوہ قاف کی کسی جادوئی وادی کا ایک بھید بھرا نظارہ تھا.. جھیل کے پار جو سرسبز پہاڑ تھے وہ دھیرے دھیرے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے اور یہ بادل میری نظروں کے سامنے جھکتے اُترتے پانیوں تک پہنچ کر اُن میں جذب ہو رہے تھے..

ہمارے خیمے بھی بادلوں میں تیرتے پھرتے تھے..

یہ خیمے بارش میں یوں نکھرتے تھے جیسے ان پر ابھی ابھی زرد، نیلے اور سرخ رنگ کا پینٹ کیا گیا ہو اور پینٹ بھی کسی ہما شما نے نہیں ذاتی طور پر وان گوگ نے اپنے پسندیدہ ترین بُرش سے کیا ہو..

خیمہ بستی سے پرے تین گھوڑے بادلوں میں حرکت کرتے تھے.. تھوتھنیاں جھکائے نم گھاس اور زرد پھولوں کو چرتے تھے اور ایک گھوڑے کی ٹانگوں سے لپٹنے والا اُس کا نونہال کبھی کبھار اپنی بچہ تھوتھنی اُٹھا کر ''ای ہی ہی'' کرتا تھا.. ظاہر ہے یہ گھوڑا تو نہ تھا.. گھوڑی تھی.. انسانی بچوں کی مانند گھوڑوں کے بچے بھی باپ کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے.. ماؤں سے ہی لپٹے رہتے ہیں..

اور جھیل کے پانی جہاں تک وہ نظر آتے تھے وہاں تک ایک بھیگی ہوئی گہری نیلاہٹ

میں شانت پھیلے ہوئے تھے..

کہیں وہ نیلاہٹ میں نیلونیل تھے اور کہیں اُن کا رنگ گہرا سبز ہو رہا تھا..

بادلوں کی قربت نے تو حشر برپا کر رکھا تھا..

اُن کی سفیدی جھیل کی نیلاہٹ اور سبزے میں گھلتی جاتی تھی..

جھیل کے بلند چٹانی کناروں پر درّہ بابوسر کو جاتی جیپ روڈ تقریباً دو کلومیٹر تک تو ہماری نظروں کے سامنے جاتی نظر آتی تھی اور پھر ایک گلیشیئر کے عقب میں روپوش ہو جاتی تھی..اس گلیشیئر کی سفیدی بھی بادلوں کے ہمراہ جھیل کے پانیوں میں اُترتی تھی..

ان سحر انگیز منظروں میں ایک المناک المیہ بھی گھومتا پھرتا تھا..میرے ساتھی عجیب وغریب واہیات رنگوں کی برساتیوں میں لپٹے خیمہ بستی میں گھومتے پھرتے تھے..یہ وہ برساتیاں تھیں جو سلمان نے لاہور کے لنڈا بازار کی کسی ریڑھی سے تھوک میں صرف پچاس روپے فی دانہ کے حساب سے خریدی تھیں اور ہر کوئی اُن کا مذاق اُڑاتا تھا کہ یہ کیا خرید لائے ہو اور اب ہر کوئی منت ساجت کر رہا تھا کہ پلیز ہمیں ایک تو دے دو، بارش میں بھیگا نہیں جاتا..چنانچہ اُس نے کمال فراخ دلی سے اُنہیں بلا قیمت ان بھیگتے بے آسرا لوگوں میں بانٹ دیا تھا..

ان بے آسرا لوگوں میں مَیں بھی شامل تھا جو ابھی بھیگا نہ تھا..

میرے حصے میں جو برساتی آئی وہ پیلے رنگ کی تھی اور کسی نہایت پستہ قد میم کی..تدفین سے ذرا پیشتر کی اُترن تھی..اور میں اُسے اوڑھ کر ایک زرد سٹھایا ہوا مسخرہ لگ رہا تھا..لیکن گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف بارش میں بھیگ کر فوت ہو جانے کی بجائے کہیں بہتر تھا کہ انسان بے شک ایک گھٹیا قسم کا مسخرہ لگنے لگے..

کچن ٹینٹ میں حافظ نواز کچھ ڈھیلے سے پکوان بنا چکا تھا جنہیں وہ پراٹھے کہتا تھا اور دیسی انڈے تلنے میں مشغول تھا..

دیسی انڈوں کی ایک کھیپ ہم نے ناران کی دیسی مرغیوں کو ناراض کر کے حاصل کی تھی اور اُنہیں سینت سینت کر یہاں تک لے آئے تھے..

نواز کے پراٹھے نہایت پژمردہ، تھکے ہوئے اور لجلجے سے تھے..لیکن ان بے روح پراٹھوں کے اوپر جب توے پر تلا ہوا گھی سے نچڑتا فرائی انڈہ رکھ دیا جاتا تو نہ صرف پراٹھا زندہ ہو

جاتا بلکہ ہمارے تالو میں ذائقے کے جو مسام مدت سے بند ہو چکے تھے وہ بھی منہ کھول کر ''انڈہ پراٹھا'' پکارنے لگتے..

میں نے ایک انڈہ کھایا..پھر دوسرا نوش کیا..پھر تیسرا تناول کیا کہ آس پاس کہیں بھی میری بیٹی ڈاکٹر عینی ایم ڈی موجود نہ تھی جو مجھے سرزنش کرتی..

گرم اور کڑوی میری حسب پسند کافی کا مگ تھامے میں اپنے خیمے میں واپس آ بیٹھا اور کافی سُڑکنے لگا..

ایک آوارہ بادل کی سفیدی خیمے کے کھلے پردے میں سے سرایت کرتی. کافی کو یخ کرنے لگی..

بارش تھمنے کے کوئی آثار نہ تھے..

پھر یوں ہوا کہ اُس کے تسلسل میں خلل آنے لگا..جھجکتی ہوئی تھمنے لگی اور پھر ایک آخری بوچھاڑ کی ہچکی بھر کر پھر نہ بولی، چپ ہو گئی..

خیمے مسمار ہونے لگے..

میخیں پھولوں بھری گھاس میں سے اُکھڑنے لگیں..

گھوڑوں پر سامان لادا جانے لگا..

ابھی تک جوگرز میں گذارا ہو رہا تھا..پہلی بار ہائکنگ بوٹ رُک سیکوں میں سے برآمد ہوئے..اونی جرابیں نکلیں..پہننے سے پیشتر پاؤں ٹیلکم پاؤڈر سے چھڑکے گئے اور سب لوگ کمربستہ ہو گئے..وہ بھی جن کی کمر کا بستہ بوسیدہ ہو چکا تھا اور وہ بھی جن کی کمر ابھی دھچکے سہار سکتی تھی..

ہمیں کچھ ملال نہ ہوا اُس عشق کو چھوڑتے ہوئے کہ ہماری ہوس کو تسکین ہو چکی تھی اور بابوسر روڈ پر..درّے کی جانب یعنی..جہاں سے ہم کل شام آئے تھے..بیسل کی جانب واپس چلنے لگے..

بہت نیچے جھیل کے پانی ابھی تک بادلوں میں گھرے کبھی نیلاہٹ میں جاتے تھے اور کبھی ہرے ہو جاتے تھے..

''بیسل سے ڈانلڈ ڈک تک..دریا تو آئیں گے''

ہم واپس بیسل پہنچ گئے..

راستے میں بیسل کی نہایت ہری بھری بادلوں میں سے اُترتی ڈھلوانوں پر ہم نے ایسے شاندار پُرشکوہ گھوڑوں کو چرتے دیکھا جو یونانی دیومالا کے وہ گھوڑے تھے جن پر صرف کوہ اولمپس پر مقیم دیوتا ہی سواری کر سکتے تھے..وہ ایسی شاہانہ شباہتوں والے گھوڑے تھے..

جہاں وہ چرتے تھے اُن ڈھلوانوں پر برفیں اُترتی تھیں اور ندیاں سفید ہوتی تھیں..اور ان میں سب سے الگ اور جدا ایک گھوڑا ایسا تھا جو اُترتی برفوں کی رنگت سے بھی زیادہ سفید اور روشن تھا..اتراتا..پُرفخر اور پُرتکبر سفید گھوڑا جسے دیوتا اپالو شاید بیسل میں چرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا..

ہم نے بیسل کے اکلوتے اور اپنے مرغوب ہوٹل میں چائے کی ایک پیالی پینے تک قیام کیا اور پھر اپنے بوجھ اُٹھا کر قصبے کے بائیں جانب آبادی سے پرے پہاڑوں میں جو ایک تنگ وادی نظر آتی تھی اُس میں داخل ہونے کے لیے چلنے لگے..

بیسل کا علاقہ ہموار تھا لیکن اس میں کہیں کہیں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں اور ہم ان کو ٹاپتے..کوہ نوردی کے پہلے دن کے خمار میں مست آپس میں چُہلیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ یکدم ہمارے سامنے ناگہانی موت کی مانند ایک تیز و تند برفانی نالہ چنگھاڑ رہا تھا..

ہمیں ذرا دُکھ ہوا..

ہماری وادی 'کاغان' میں چہل قدمی کرتے سبزہ زاروں اور چمن زاروں میں ٹہلتے ہوئے گذر جانے کی کتاب میں کوئی اس نوعیت کا نالہ نہ تھا..اس لیے ہمیں دکھ ہوا۔

بہرحال اس نامعقول اور غیر متوقع آبی رکاوٹ کے پار اُترنے کے لیے ایک بادلوں میں گھرا تیز ہواؤں میں جھولتا ایک ''جھولا'' تھا..

اور یہ کوئی آٹومیٹک قسم کا..خودکار جھولا نہ تھا..اسے خود ہی جھلانا پڑتا تھا اور تب جا کر یہ جھولتا تھا..

سب سے پہلے میاں صاحب کو اس مخدوش ساخت کے جھولے میں فٹ کیا گیا اور بشیر نے آہنی رسّے کو اپنی توند پر باندھ کر کھینچا..کھینچتا ہی گیا اور آخر کار میاں صاحب کو پار پہنچا دیا..

میاں صاحب کو سب سے پہلے جھولے پر بٹھانے میں مصلحت یہ تھی کہ اگر یہ پار اُتر گئے تو اُتر گئے..نہ اُترے تو خوش رہو اہل چمن ہم تو واپس سفر کرتے ہیں..

ویسے ہم اس جھولے سے ہرگز نہ ڈرتے تھے کہ یہ کسی دریائے برالڈو کے اوپر تو نہ جھولتا تھا کہ گر جائیں تو ایک غیر طبعی موت کے حقدار ہو جائیں..

ہم باری باری پار اُتر گئے..

اس نالے کے نظر کے سامنے نہ ٹھہرتے اور جھاگ اُڑاتے پانیوں میں وحشت اتنی ہی تھی جتنی کہ برالڈو کے پانیوں میں ہوتی ہے لیکن ہم پار چلے ہی گئے..

اور پار اُتر کر ہم منتظر رہے کہ کوئی مقامی شخص نمودار ہو کر اس جھولے کو استعمال کرنے کا معاوضہ طلب کرے گا کہ شمال میں اکثر ایسا ہوتا ہے لیکن یہاں نہ ہوا..

ذرا آگے گئے..

بیسل کے آخری پتھریلے جھونپڑے..اور آخری گدھے سے آگے گئے اور ایک تنگ وادی میں داخل ہو گئے..

وادی ہو گی تو اُس کے درمیان میں دریا بھی بہتا ہو گا..جو کہ بہتا تھا..اور وادی کو بھرتا تھا..ہم اس کے کناروں پر کبھی اور کبھی ذرا بلند ہو کر چلتے گئے..ایک اور بار نیچے اس کے کناروں پر آئے تو بشیر نے کہا ''تارڑ صاحب..اس کے پار جائیں گے..''

دریا خاصا چوڑا اور بپھرا ہوا تھا صرف اس لیے کہ ٹریک کے دوران پہلے دریا کا سامنا تھا..ورنہ کوئی خاص ہلاکت خیز خصلت کا حامل نہ تھا..

''چلے تو جائیں گے بشیر لیکن تم نے کیوں نہیں بتایا تھا کہ راستے میں دریا بھی عبور کرنے

ہوں گے..''

''تارڑ صاحب بے شک یہ کاغان کی وادی ہے..نہایت معصوم سی ہری بھری ہے لیکن آپ پہاڑوں میں جائیں گے تو دریا تو آئیں گے..''

''توبسم اللہ..'' میں بے دریغ اس میں کود پڑنے کو تھا کہ بشیر نے صلاح دی ''بہتر یہ ہے کہ بوٹ نہ اتاریں ورنہ تہہ میں جو نوکیلے پتھر ہیں اُن سے پاؤں زخمی کر بیٹھیں گے..''

نئے رنگروٹ ذرا بددل ہوئے..

بٹ صاحب اور قیصر جو پہاڑوں میں نو وارد تھے اور جنہیں جھانسا دیا گیا تھا کہ راستہ آسان ہے، آگے میدان ہے..محض چہل قدمی اور چراگاہوں میں مٹرگشت ہے، وہ ذرا بددل ہوئے اور دریا کو پار کرتے ہوئے بہت بھیگے اور بہت ہراساں ہوئے..

پار ہو کر ہم نے دوپہر کا کھانا تناول فرمایا..تو ہی ڈھیلے اور لجلجے پراٹھے جو گرم گرم حالت میں تو حلق سے اُتر جاتے تھے مگر اب ٹھنڈے ٹھار ہو کر ربڑ کے موافق ہو چکے تھے..انہیں تین اقساط میں معدے تک پہنچایا جاتا تھا..پہلے نوالہ منہ میں ڈال کر اُسے تادیر چبایئے پھر دوسری قسط میں ''آہم'' کر کے گلے پر زور ڈال کر اُسے گردن کے درمیان تک دھکیلئے اور آخر میں ایک اور ''آہم'' کا دھکا لگا کر معدے تک پہنچایئے۔

بے شک میں نے بشیر کے مشورے کے مطابق بوٹ نہیں اُتارے تھے اور بے شک بوٹ شدہ پاؤں کے ساتھ پانیوں میں چلنا آسان تھا اور اب اُنہیں اتار کر پہلے جرابوں کو اور پھر اُن کو جی بھر کے نچوڑا تھا اور دوبارہ پہنا تھا لیکن پہلے کی نسبت اُن کا وزن دوگنا ہو چکا تھا..ہر مسام سے پانی پھوٹتا تھا اور میں اُن میں چھپاک چھپاک کرتا ایسے چلتا تھا جیسے کسی جوہڑ میں چل رہا ہوں..نہ صرف یہ بلکہ پاؤں اتنے برفیلے محسوس ہو رہے تھے جیسے ایک میں تو بالتورو گلیشیئر پہنا ہوا ہے اور دوسرے میں بیافو فٹ کر رکھا ہے..

یوں چلنے سے گیلے بوٹوں میں سے نہایت فحش قسم کی آوازیں بھی آتی تھیں..

نالے سے بلند ہوئے تو راستے میں ایک گلیشیئر آ گیا..

یہ ویسا ہی کمی کمین غریب غرباء جیسا گلیشیئر تھا جیسے کہ کاغان میں ہوا کرتے ہیں..

بے شک اس پر بھی احتیاط سے چلنا تھا اور اگر پھسلنا تھا تو نیچے نالے میں گرنا تھا لیکن نہ اس میں کوئی

دراڑ تھی اور نہ کوئی برفانی کنواں اور اس کا دوسرا کنارہ بھی چند میٹر کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا..وہ گلیشیئر ہی کیا جس کا دوسرا کنارہ آپ کی نظروں کے سامنے ہو اور جس پر قدم رکھنے سے پیشتر آپ اپنے گناہوں کی معافی نہ مانگ لیں اور بچوں کو آخری بار یاد نہ کر لیں..

ہم جو دُنیا کے طویل ترین گلیشیئرز کو عبور کر چکے تھے ہم نے اس بچہ گلیشیئر پر چلنے کو اپنی توہین جانا اور اس کا ٹھٹھا اُڑانے لگے۔اُس پر جگتیں لگانے لگے،فقرے کسنے لگے..

''تارڑ صاحب..'' میاں صاحب نے نہایت حقارت سے..مجھے نہیں..گلیشیئر کو دیکھ کر کہا ''جناب عالی اس پر چلنے سے تو ہماری بے عزتی خراب ہو جائے گی۔ جب تک کوئی بی پی گلیشیئر نہ ہو سواد ہی نہیں آتا..''

سلمان بھی اُس کے سامنے یوں سینہ تان کر کھڑا ہوا جیسے وہ ایک جن ہو جو کہ کسی حد تک تھا اور کسی مختصر بدن کی پری کو سامنے پا کر کہتا ہو کہ تو کیا اور تیری بساط کیا..ہٹ جا میرے راستے سے ورنہ پچھتائے گی مُٹیارے..

سلیم البتہ نیوٹرل گیئر میں تھا..

اُدھر بٹ صاحب اور قیصر کا نہ صرف رنگ فق ہوا بلکہ روح بھی فنا ہو گئی..ہم نے اُنہیں بہت ڈھارس دی، بہت لاڈ پیار سے تسلی دی لیکن نہ تو اُن کا رنگ غیر فق ہوا اور نہ ہی فنا شدہ رُوح واپس آئی..

''سرجی..یہ تو بہت ہی بڑا گلیشیئر ہے..برف بھی بہت زیادہ ہے تو اس پر پھسل گئے تو کیا ہو گا..'' بٹ صاحب ایک خدشات میں گھرے بٹ جی تھے..

''نہ پھسلو..''

''اور جناب بندہ یا کوئی بٹ پھسل ہی جائے تو یقیناً گہرائی میں جو نالہ شور کرتا ہے اُس میں جا گرے گا..''

''ہاں..بالکل گرے گا..''

''تو پھر..''

''تو پھر یہ کہ..نہ پھسلو..''

ہم تینوں تجربہ کار اور گلیشیئر آشنا جب اُس بچہ گلیشیئر پر اُترے تو اُس نے ہم تینوں کی

نظرِ حقارت کے جواب میں نہ صرف ہر قدم پر پھسلایا اور لڑھکایا بلکہ متعدد قلابازیاں لگوا کر یہ ثابت کر دیا کہ گلیشیئر بے شک بچہ ہو اُسے حقیر نہ جانو..

ہماری درگت بنتے دیکھ کر قیصر اور بٹ اُس پر انتہائی احتیاط سے.. جیسے وہ حاملہ خواتین ہوں.. پھونک پھونک کر قدم دھرنے لگے..

ظاہر ہے وہ بھی پھسلے اور لُڑھکے..

قیصر کا بے تاب خون جب لڑھکتے پھسلتے بہت بیزار ہو گیا تو وہ برف پر براجمان ہو کر ڈھلوان پر اپنی باٹم براجمان کر کے سکی ہنگ کرتا پل بھر میں گلیشیئر کے آخر تک نیچے چلا گیا اور بہت خوش ہوا..

میں جب اُس تک پہنچا تو وہ برف کی قربت میں رہ چکی اور اب مکمل طور پر یخ بستہ ہو چکی پُشت کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتا ہوا گرم کر رہا تھا..

''سر جی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کسی بھی گلیشیئر پر چلنا نہیں چاہیے.. اسے پار کرنے کا آسان ترین طریقہ یہی ہے کہ بندہ اُس پر بیٹھ جائے اور جس طرح بچے سلائیڈ لیتے ہیں ایسے برف پر گھِسی کرتے نیچے پہنچ جائے.. مزے سے۔''

''بچے تم نے کیا غور کیا ہے کہ گلیشیئر کی سفیدی میں جابجا سیاہ پتھر اُبھرے ہوئے ہیں اور اگر تم پھسلتے ہوئے اُن میں سے کسی ایک پر سے گذر جاتے تو اُس کی نوکیلی زد میں آ کر تمہاری پشت یعنی باٹی پلیس کا کیا حال ہوتا؟''

اُس نے اپنی پشت سہلانی منقطع کر دی اور اُس کا رنگ پھر سے فق ہو گیا..

اس بچہ گلیشیئر سے فراغت حاصل کر کے ہم پانیوں سے اوپر ایک ایسی ڈھلوان پر آ گئے جس نے ہمارے بجھے ہوئے دل کو باغ باغ کر دیا کہ وہ ایک باغِ ارم کی مانند تھی.. سرد پانیوں کے سفید مرغولے بلندی سے نیچے آ رہے تھے.. کہیں چشمے اُبلتے گیت گاتے تھے اور ان کے گرد پھول ہی پھول ہجوم کرتے تھے.. بس ہم ایک ایسے ہی خوش نظر منظر میں چلنے کے لیے ہی تو یہاں آئے تھے.. اگرچہ ہمارا سانس بری طرح پھولتا تھا ہم اُسے ٹھہر ٹھہر کر بحال کرتے تھے تو وہ صرف چند لمحوں کے لیے ہی بحال ہوتا تھا اور پھر پھول جاتا تھا لیکن ہمارے آس پاس اتنے پھول تھے کہ ہم سانس کے پھُول..نے.. کو بھول گئے..

تنگ وادی کے آخر میں ایک اور گلیشیئر نمودار ہوا جو پانیوں پر سایہ کیے ہوئے تھا.. اسے عبور کرتے ہوئے ہم دائیں جانب ایک اور وادی میں داخل ہو گئے جو قدرے کھلے آسمان تلے تھی اور فراخ طبیعت کی تھی..

بیسل کی وادی سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا..

اور ہاں اُس تنگ وادی میں کسی اور ذی روح سے ملاقات تو نہ ہوئی البتہ ہم نے کچھ نڈھال شدہ پریشان شکلوں والے کراچی، ملتان اور لاہور سے آئے ہوئے پہاڑوں کے شوقین سیاحوں کو واپس آتے دیکھا جن میں روح کا بیشتر حصہ رخصت ہو چکا تھا..

ایک صاحب.. گرتے پڑتے آ رہے ہیں.. گلے میں ٹیپ ریکارڈر لٹکایا ہوا... دیدہ زیب بوٹ پہنے ایسے تیار شدہ جیسے کسی شاہانہ ڈنر میں جانے کے خیال سے نکلے تھے اور اب کیچڑ میں لت پت.. کسی ندی میں بھیگے ہوئے اپنی جان کو روتے واپس آ رہے ہیں..

ایک ''کوہ نورد'' نہایت بدحواس.. ہمیں دیکھ کر حواس باختہ اور ہاتھ لہراتے ہمیں خبردار کرتے کہ آگے مت جاؤ..

گھوڑے پر سوار ایک شوقین جو بیٹھے نہ تھے گھوڑے کی گردن کو چھا مار کر اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے تھے.. یہ سب ہمارے آس پاس سے گذرے بیسل کی جانب لوٹتے ہوئے.. اور ان سے جو مکالمے ہوئے وہ کچھ یوں تھے..

یہ جو ٹیپ ریکارڈر گلے میں ڈالے سجے بنے اور اب دُرگت بنے حضرت تھے..

''تارڑ سائیں.. یہ جو بیسل کے لوگ ہیں گائڈ نہیں.. بس گائیڈ ہیں۔ ہم نے اُن کے ہوٹل میں رات گذاری تو اُنہوں نے گائڈ کیا کہ صاحب آپ صبح سویرے اُٹھو بے شک ٹیپ ریکارڈر ساتھ لے کر جاؤ.. راستے میں میوزک سنو اور واک کرتے ہوئے جھیل دُودی پت تک پہنچ جاؤ.. وہاں رب سائیں کی قدرت دیکھو.. گانے سنو اور آرام سے شام تک واپس آ جاؤ.. سائیں جھوٹ بولتے تھے.. دُودی پت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا پتہ پانی ہو گیا، پر وہ دکھائی نہیں دی.. ان کے بارے میں لکھو کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں''

اور جو حواس باختہ کوہ نورد تھے ''آپ کون ہیں.. کہاں سے آئے ہیں.. ہم کراچی سے آئے ہیں۔ کراچی واپس جائیں گے۔ پھر کبھی ادھر نہیں آئیں گے.. اُدھر سالا کوئی جھیل نہیں ہے..

ادھر مرنے کے لیے آ گیا۔تم مرنے کو جاتا ہے تو جاؤ..''

گھوڑے پر جھولتے صاحب کی رودادِ الم بھی اسی نوعیت کی تھی کہ دل رو رو کے دیتا ہے دوہائی..کسی سے کوئی پیار نہ کرے..

ہمارے سامنے ایک سرسبز اور وسیع پہاڑی سلسلہ ہویدا تھا۔اُفق تک جاتا تھا اور وہاں کچھ مدھم سی برفانی تصویریں دکھائی دیتی تھیں..

یہاں ایک اونچ نیچ کا تسلسل تھا..

کبھی ہم نیچے چلے جاتے اور پھر چڑھائی چڑھتے اوپر ہوتے تو نیچے ایک اور نشیب نظر آتا جس میں اُتر جاتے..

اس ڈوبنے اور ابھرنے میں ہمارا سانس بھی اور ہمت بھی..کبھی یوں ڈوبتے کہ کبھی نہ ابھریں گے اور جب اُبھرتے تو لگتا کہ عرش پر ہی جا کر خیمے لگائیں گے..سلمان کچھ زیادہ ہی ڈوبا جاتا تھا..

وہ ہر دو چار قدم پر رُکتا تھا..سانس سنبھالنے کی سعی کرتا تھا جو سنبھلتا نہ تھا..

اس بیمار کا حال اچھا نہ تھا..

وہ اگرچہ شمال کے سب سے دشوار ترین اور دنیا کے سب سے طویل برفانی راستے ''سنولیک'' کو اپنے قدموں تلے روند چکا تھا لیکن اس بار پتہ نہیں اُس کا بڑھا ہوا وزن تھا یا وہ آسٹریلیا اور امریکہ میں قیام کے دوران ''مہذب'' ہو گیا تھا کہ وہ اس معمولی چڑھائی کو بھی برداشت نہ کر پاتا تھا..

یہاں تک کہ مجھے بھی اُس کا انتظار کرنا پڑتا کہ وہ نیچے سے اوپر آ جائے اور پھر ہم آگے چلیں..

ویسے مجھے بھی غلط فہمی تھی کہ گلگت اور سکردو کے پار جو بلندیاں ہیں اُن کے سامنے اس بے چاری وادی کاغان کی کیا حیثیت ہے..لیکن آج یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جہاں کہیں بھی پہاڑ ہوں گے..بلندیاں ہوں گی..بے شک کمتر حیثیت کی ہوں گی..اُن کی خصلت ایک عورت کی مانند ایک ہی رہے گی کہ وہ سانس کو دشوار کر دے گی..ہماری کوہستانی معلومات کی کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ ہم بیسل سے چل کر نہایت آرام سے جھیل دُودی پت تک شام سے پہلے پہنچ جائیں گے لیکن شام ہونے میں کچھ دیر نہ تھی اور ہم کہیں بھی نہیں پہنچے تھے..

''بشیر..'' وہ جو موٹا سا بدحال لڑھکتا ہوا ہمارے آگے آگے جاتا تھا رُک گیا۔

''آج ہم جھیل تک پہنچ جائیں گے؟''

''نہیں صاحب۔''

''کیوں نہیں؟''

''آپ بہت آہستہ چلتے ہوئے تارڑ صاحب..اپنے سفرناموں میں تو بہت تیز چلتے ہو لیکن یہاں بہت آہستہ اور مشکل سے چلتے ہو..اور آپ کے ساتھی بھی..تو آج ہم ڈک میں قیام کریں گے۔''

''اور یہ ڈک کہاں ہے؟''

''جب یہ اونچ نیچ کا سفر ختم ہوگا تو ہم ایک کھلی وادی میں نکلیں گے..تقریباً میدان ہوگا تو اُس کا شروع میں ڈک آئے گا۔''

''یہ ڈک ہے کیا؟''

''جھیل دُودی پت سے جو نالہ نکلتا ہے اور وادی میں بہت آتا ہے تو وہاں اُس کے آگے پتھروں سے ایک بند بنایا گیا ہے..نالے کو ڈک دیا گیا ہے تو وہاں..''

سلمان جو بلندی سے بوکھلانے کے باوجود سلمان تھا، ذرا لہک کر بشیر کو اُس انداز میں بلانے لگا جس انداز میں وہ ''سنولیک'' کے یوسف کو پکارتا تھا۔''بشیر اوئے بشیر''

''جی صاحب۔''

''یہ جو ڈک ہے تو کیا ڈانلڈ ڈک ہے؟''

''کیا مطلب صاحب؟''

''یہ کوئی ڈانلڈ بطخ ہے..''

بشیر کی زندگی میں یہ پہلا کوہ نورد تو نہیں تھا جو بونتر گیا تھا..حواس باختہ ہو گیا تھا اس لیے وہ شانت رہا ''گڈ جوک سر..ویسے اس مقام کو ڈک بھی بولتے ہیں اور گلی بھی..''

اور یہ گلی ہمارے گلے پڑ گئی کہ ہم نے بہر صورت وہاں تک پہنچنا تھا..

شام ہوئی جاتی تھی..

اُس سراسر اجنبی اور اَن چھوئی وادی میں شام ہو رہی تھی۔ جب ہم اس کی آخری ڈھلوان پر سے اُتر کر اُس میں داخل ہوئے..

یہ کوئی جادو بھری.. سحر سے بھری وادی نہ تھی جس میں ہم سرِ شام اُترے.. لیکن جب ہم اس کے پار دیکھتے تھے تو جو منظر دیکھتے تھے وہ تو سراسر سحر سے بھرا ہوا تھا.. ایک شام کی تاریکی میں بھی ہریاول سے نمایاں ہوتی لامتناہی وادی جس کے آخر میں برف بھری چوٹیاں.. غروب کے بعد کی ہلکی زردی میں نہائی.. بہت دور.. چوٹیاں!

اور اُنہی برفیلی بلندیوں تلے کہیں وہ دُودی پت جھیل پنہاں تھی..

ہم نے اس منظر کو دیکھ کر وہی کہا جو نپولین نے اپنی محبوبہ جوزفین سے کہا تھا کہ.. نہیں جوزفین آج رات نہیں.. کل تک انتظار کرو.. تو ہم نے بھی اُس پوشیدہ جوزفین سے یہی کہا کہ نہیں آج رات نہیں.. کل تک شاید..

ہمارے دونوں رنگروٹ.. بٹ اور قیصر ڈک میں اُترے تو خوشی سے بوکھلا گئے کہ وہاں سبزہ تھا، پہلو میں ایک ندی تھی جس کے کناروں پر دو چار پھول تھے اور صاف پانی اُن کی تصویر لے رہا تھا اور افق پر برفیں تھیں اور وہ پہلی بار ایسے منظر میں اُترے تھے.. اور یہ اُن کی پہلی کوہ نوردی کی پہلی شب تھی..

ہمارا معاملہ مختلف تھا..

ہم تو ایسے ہوس پرست عیاش ہوا کرتے تھے جو شاہ گوری.. نانگا پربت اور لیلےٰ پیک ایسی حسن کی دیویوں کے چرنوں کو چُھو آئے تھے تو ہم اس معمولی منظر سے کہاں متاثر ہونے والے تھے.. اُدھر رنگروٹوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بزرگ اس شاندار منظر سے بے اعتنائی کیوں برت رہے ہیں..

اگرچہ ہم نہیں برت رہے تھے..

ہم تو وہ دل پھینک بابے تھے جو محبوب کا ٹخنہ دیکھ کر ہی اُس پر دل و جان سے فدا ہو جاتے تھے.. اگرچہ یہ ٹخنہ ڈک ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ہمارے پہلے دن کی کوہ نوردی کا انعام تھا.. بے شک ورلڈ کپ نہ تھا، ایک پتّوکی یا بھائی پھیرو کپ تھا لیکن انعام تو تھا اور یہ بھی ہمارے دلوں میں ایک نئی رُوح پھونکتا تھا..

وہ رُوح جو شہروں اور شُہرتوں سے پژمردہ ہو چکی تھی..

ڈک جیسا بھی تھا کہیں پہاڑوں کے اندر تھا، ہوا کی تازگی کی نویکلی بستی تھا..

اور ہم آبادیوں سے دور قدرت کی آغوش میں سانس لیتے تنہا تھے..

جیسے عادی شرابی کو باقاعدہ شراب نہ ملے تو وہ اپنی جگر سوزی کے لیے کھانسی کا شربت پی کر ہی نشہ پورا کر لیتا ہے ایسے ہم عادی مے نوشوں نے ڈک کو کھانسی کا شربت سمجھ کر پی لیا اور اِک گونہ بے خودی سے سرشار ہو گئے..

حافظ انور نے اپنا کچن ہیڈ کوارٹر خیمہ گاہ سے اوجھل ایک پہاڑی جھرنے کے کنارے قائم کر لیا تھا اور کڑھائی گوشت کے دو ٹین کھول کر اُنہیں تڑکا لگا رہا تھا..

چاند یہاں بھی بجھا بجھا تھا..

جیسے بچے خزانے کی تلاش میں ایک بوسیدہ نقشہ تھام کر کسی جزیرے میں اُتر جاتے ہیں، ہم بھی ایک بچگانہ طریقے سے ہی ایک نقشہ جیب میں ڈال کر جھیلوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے اور اپنی سکت کا دھیان نہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جھیلوں کو شیڈیول میں شامل کر لیا تھا..

کل ہم لُولُوسر کے ہمسر تھے..

آج ڈک میں ڈکے ہوئے تھے.. کل دُودی پت.. پھر سرال.. پھر رتّی گلی جھیل.. جھیلیں آسانی سے تو اپنے قریب نہیں آنے دیتیں..

اور راستے میں درّے بھی تھے.. بُلند اور غیر معروف دشوار درّے..

یہ ایک مارننگ واک نہ تھی جیسا کہ ہم نے سوچا تھا.. اور جیسا کہ آج کی واک نے ثابت کر دیا تھا.. آج تو ابتدائے عشق تھی اور ہم سب رونے لگے تھے.. آگے آگے ہم کیا دیکھتے کہ کیا ہونا ہے، آج کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو ہونا ہے کچھ اچھا نہیں ہونا..

آج تو ایک معمولی سا کلاس ٹیسٹ ہوا تھا اور ہم سب کی سپلیاں آ گئی تھیں۔ اصل امتحان تو آگے تھے.. اصل جہان تو آگے تھے..

جیسے بابا بھیرا ابوذری نے کہا تھا کہ..

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں.. پرے سے پراں سے پراں اور بھی ہیں۔

تو یہ جو اجنبی جھیلوں کے جہان تھے، وہ تو ابھی پرے سے پراں سے پراں.. کہیں تھے.. جانے کہاں تھے اور کتنے فاصلوں پر تھے..

ڈک کی رات میں ایک بے پناہ خوبصورتی تھی.. اور وہ یہ کہ ہم سب ایسے بے سُدھ ہوئے.. ایسی بے خبری رہی کہ نہ جنوں رہا.. نہ پری رہی.. اور نہ ہی ہم رہے.. ایسے بے سُدھ سوئے..

''قافلہ ہائے رنگ و بُو.. گھوڑوں کی وادی میں''

غالب کی بہار کے دنوں میں چمن پھولوں سے یوں اٹ جاتا تھا کہ مرغان چمن اُڑان کا قصد کرتے تھے تو اُن کے پاؤں اُن کے انبار میں اُلجھ اُلجھ جاتے تھے.. تصور کی آنکھ سے غالب نے پھولوں کے جو انبار دیکھے وہ ان انباروں کے مقابلے میں جو ہماری کھلی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، ہیچ تھے.. حقیر اور بے وقعت تھے.. یہ تو میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں..

میں نے جب سے دو تین برس کی عمر میں کسی پھول کو دیکھ کر ''پُھو.. پُھو'' کہا تھا اب تک اس حیات میں جتنے بھی پھول دیکھے تھے وہ میری نظر میں خوش رنگ اناروں کی مانند پھوٹتے ہیں تو اگر ان کا حساب کتاب کیا جائے.. کسی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ براہ کرم.. رتی گلی کی چوٹی سے اُترتے ہوئے گل لالہ کے جو تختے بچھے تھے.. کوہ الپس کے دامن میں جو الپائن پھولوں کے جمگھٹے تھے.. وادیٔ رُوپل میں نانگا پربت کے سرد پانیوں سے سیراب ہوتے جو سٹے دار گلابی معجزوں کے ڈھیر تھے جنہیں سُمیرا اپنی لامبی ٹانگوں کے ساتھ ٹاپتا تھا.. اردوکس کی بلندیوں پر جو دو چار پھول تھے اُنہیں بھی شامل کر لیجئے.. سنولیک کے سفر کے دوران زرد پھولوں کے جو بادل آسمان کو چھوتے تھے..

وادیٔ سوات کے قبرستانوں میں جو گل لالہ اور نرگس نمایاں ہوتے تھے..

وادیٔ کرومبر کی ایک آبشار کے گرد جو اَن چھوئے ہجومِ گل تھے..

چلئے ان خودرو خوبصورتیوں میں وہ تمام پھول بھی شامل کر لیجئے جو میں نے آج تک فلاور شوز میں دیکھے.. اپنے گھر میں اُگائے.. فلاور شاپس سے خرید کر پیش کیے.. جو مجھے پیش کیے گئے.. ان میں سہرے کے پھول بے شک نہ شامل کیجئے لیکن کچھ زرد گلاب اور نرگس کے ایسے پھول

بھی تو دھیان میں رکھئے جن میں بدن کی گرمی حدت دیتی تھی..

تو چلئے صرف ان سب کی گنتی کر لیں..

تو براہ کرم چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ صاحب حساب تو لگائیے کہ کل کتنے تھے..

وہ جتنے بھی تھے وہ سب کے سب بہت کم تھے.. ہیچ اور حقیر تھے ان پھولوں کے مقابلے میں جن میں ہم چلتے تھے اور مرغانِ چمن کی مانند ہمارے پاؤں بھی ان میں اُلجھتے تھے.. اور جو آس پاس کی ڈھلوانوں کو ڈھکتے برفوں تک جاتے تھے اور اُن برفوں پر بھی گل رنگ عکس دکھائی دیتے تھے..

اتنے پھول تھے..

ڈھلوانوں پر لدے ہوئے پھولوں کی رنگت کہیں گلابی ہوتی تھی اور کہیں پیلی پھٹک اور ارغوانی.. حیرت ہوتی تھی کہ ان انباروں کا بوجھ پہاڑوں نے کیسے سنبھالا ہوا ہے..

جیسے برف کا بوجھ بڑھتا ہے تو وہ کھسکتی ہے.. ذرا پھسلتی ہے تو ایک ایولانچ کی صورت وادی میں ایک آبشار کی مانند اُترنے لگتی ہے..

تو ایسے ہمارے قدموں سے شروع ہو کر آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں تک راج کرتے بے انت پھول بھی تو اپنا بوجھ نہ سہار کر ایک ایولانچ کی صورت ہم پر گر سکتے تھے..

ہمیں دفن کر سکتے تھے..

نہ کسی کو مرنے کی چاہت تھی اور نہ کوئی اس جہان سے بچھڑنا چاہتا تھا لیکن ڈک سے آگے جو جہان رنگ و بُو ہم پر اُمڈتا تھا اس میں دفن ہو جانا بھی کیا برا تھا..

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا..

تو اگر بار بار مرنے کی سہولت حاصل ہو تو کم از کم ایک بار تو ایسے ہی مرا جائے کہ اوپر سے بے حساب گلہائے رنگارنگ کے تودے ایک رنگین ایولانچ کی صورت میں گریں اور آپ اُن میں دفن ہو جائیں..

غرقِ دریا ہونے سے بہتر نہیں کہ انسان غرقِ گُل ہو جائے..

یوں عزیز و اقارب کو قبر پر پھول چڑھانے کا تردد بھی نہیں کرنا پڑے گا..

ہوا سرد تھی..

اُس میں برفیلی کرچیاں تھیں جنہیں بدن کی گرمی پگھلانے سے قاصر تھی.. سامنے وادی کے آخر میں وہ برف ڈھکی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں جن کے دامن میں ہماری جوزفین.. ڈودی پت پوشیدہ تھی..

آسمان یکدم ابر آلود ہو گیا اور سردی کی شدت بڑھ گئی..

کبھی کبھی سرد چھینٹے ہمارے رخساروں میں چھید کرتے تھے..

ہم نے ایک مختصر بستی کے کناروں پر کچھ دیر قیام کیا.. چرواہوں کی مہیا کردہ اُپلوں کے دھویں کی مہک میں رچی بسی نہایت ہی ذائقہ دار چائے پی۔ ذرا آرام کیا اور پھر رختِ سفر باندھ لیا.. آگے چلے گئے..

آگے چلے جانے سے بھی کچھ افاقہ نہ ہوا.. چھٹکارا نہ ملا.. یہ سبزہ و گل کی وادی نہ تھی محض گل ہی گل کی کائنات تھی..

ہم تھوڑے سے بیزار ہو گئے جیسے بنی اسرائیل من و سلویٰ سے بیزار ہو گئے تھے کہ یہ کیا کہ آسمانوں سے صرف صد رنگ بناوٹوں کے پُھول ہی پُھول اُترے چلے جا رہے ہیں.. کہیں تو پُھولوں سے عاری جگہ نظر آئے.. سادہ سی زمین دکھائی دے.. نہ دکھائی دی..

اس واک کے دوران ہم جو ہمہ وقت اونٹوں کی مانند گردنیں لمبی کیے ڈھلتی ڈھلوانوں پر راج کرتے پھولوں میں کھوئے ہوئے تھے جب اُن سے بیزار ہو کر دائیں جانب وادی کے نشیب میں پہلی بار دیکھتے ہیں تو وہاں گھوڑے تھے.. نشیب میں بہتی.. جھیل ڈودی پت کے پانیوں میں سے پیدا ہونے والی پارہ صفت لشکیلی ندی کے دونوں کناروں پر جو ہموار سرسبز چراگاہیں تھیں وہاں گھوڑے تھے..

وہ بھی پُھولوں کی مانند بے حساب ہی تھے..

گردنیں جھکائے جس بلند سطح پر ہم چلتے تھے وہاں سے بہت مختصر نظر آتے تھے..

جیسے کھلونے ہوں..

ابھی زندہ تھے، ابھی ساکت ہو گئے ہوں..

جیسے ہراتی مصور بہزاد کے ''تیمور نامہ'' میں تصویر کیے گئے گھوڑے ہوں جو زندہ لگتے ہوں پھر بھی ایک تصویر ہوں..

بے شک میرے محبوب شمال کی وحشی بلندیوں اور چٹیل ویرانوں اور ازلی برفوں کے کرشموں اور جادوگریوں کے سامنے یہ وادیٔ کاغان کہاں ٹھہرتی تھی لیکن وہاں کی پتھریلی تنہائیوں کے اندر مارخور تو سانس لیتے تھے.. ریچھوں کی بھی شُنید تھی.. ایسے گھوڑے تو نہ تھے جو نظر بھی آتے تھے..

پھر ایسا ہوا کہ وہ ٹھٹک گئے..

نیچے.. نشیب میں کچھ ایسا ہوا کہ وہ ہراساں ہو گئے..

ابھی آرام سے ساکت کھڑے تھے.. یکدم ٹھٹک کر بگٹٹ بھاگنے لگے.. متحرک ہو گئے.. اور اُن میں جو لشکیلی ندی کے کنارے چراگاہ میں ابھی گردنیں جھکائے ایک تصویر تھے، ایک ہی مختصر لمحے میں زندگی ہو گئے..

اُن سب میں..

اور وہ سب نیم سنہری بُھوری رنگت والے تھے..

اور اُن میں صرف ایک براق تھا.. سفید برف ایسا.. پاکیزہ اور دُم سے لے کر نتھنوں کے آگے تھوتھنی کے آخر تک برفیلی سفیدی والا گھوڑا..

وہ اُن سب سے الگ ہو کر تنہا سرپٹ دوڑنے لگا..

یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سعید اختر یا ایم۔ ایف حسین یا کوئی بھی جاپانی مصور کبھی وادیٔ کاغان میں نہیں آیا.. شاید وہ اس کے وجود سے بھی آگاہ نہ ہوں اور اس کے باوجود وہ کیسے اس قسم کے گھوڑوں کو پینٹ کر لیتے ہیں.. یہ جو سفید بدن گھوڑا ایک وسیع چراگاہ میں برفوں کے دامن میں ایک برف ندی کے کنارے سرپٹ بھاگتا چلا جا رہا ہے، اس قسم کے گھوڑے!

اور پھر وہ براق بدن.. بے چین گھوڑا ندی کے بہاؤ کے قریب جا کر یکدم رُکا.. اور ساکت ہو گیا..

ہم پُھولوں اور گھوڑوں پر دھیان دیتے رہے لیکن اُس شام سے غافل رہے جو چپکے چپکے اس پاکستانی کوہ قاف پر اُتر رہی تھی..

ہم چلتے جا رہے تھے اور آج نہ ہمارا سانس بے وفا ہوتا تھا اور نہ تھکاوٹ زیر کرتی تھی تو یہ شام پُھولوں میں اُلجھتی ہم پر دھیرے دھیرے وارد ہو رہی تھی..

یہ ایک جادو بھری شام تھی..

بہت عرصہ پہلے.. گئے وقتوں میں.. میں نے جیمز مشنر کی کہانیوں سے ترتیب شدہ میوزیکل ''ساؤتھ پیسفک'' دیکھی تھی جس میں اطالوی اداکار روزانو براتزی گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک سحر طراز جزیرے کی شام میں گاتا تھا کہ این انچانٹڈ ایوننگ.. کیسی جادو بھری شام ہے..

تو یہ اُس شام سے کہیں بڑھ کر جادو بھری تھی..

اور ہم اس سے غافل رہے تھے..

پہلے پھولوں کا جادو.. پھر گھوڑوں کا نظر کو اسیر کرنے والا الحسن.. اور پھر یہ شام..

ہم جو اِن شرابوں کے شرابوں میں ملنے سے مخمور ہو گئے تھے، یکدم ہوش میں آ گئے کہ ہم پر برف کے چھرّوں نے بوچھاڑ کر دی تھی..

وہ جو کبھی کبھار گرنے والے بارش کے قطرے تھے وہ منجمد ہونے لگے..

ژالہ باری میں بدل گئے..

برف کے منی ایچر گیند ہماری برساتیوں پر ٹپ ٹپ دستک دینے لگے..

ہمارے آس پاس اُچھلنے لگے..

ہم پھولوں، گھوڑوں اور اُس شام کی جادوگری سے غافل ہو کر کچھوے ہو گئے اپنے سر برساتیوں میں سمیٹ کر ژالہ باری کی زد سے بچنے کی کوشش کرنے لگے..

ظاہر ہے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا..

برف کے یہ چھرّے.. نہایت بے چین اور پُھدکتے ہوئے سر دیلے.. افیون کی اُس گولی کے سائز کے تھے جو میرا چاچا جہان خان پھانکتا تھا اور پھر ''بدریا برس گئی اُس پار'' اور سہگل کے گانے سنتا تھا..

برف کے یہ چھوٹے چھوٹے گیند.. ہماری گردنوں پر برس کر نیچے گرتے تھے اور ہمارے آس پاس جو پھول تھے اُن میں احمق مینڈکوں کی طرح اُچھلتے تھے.. پھر ایک ایسا منظر وجود میں آیا جسے یاد کرتے ہوئے میں اب بھی مسکراتا ہوں اور اس کے اچھوتے پن کا یقین نہیں آتا..

ہم گردن نیوڑھائے.. ژالہ باری سے بچتے چلے جا رہے تھے تو ہمارے دائیں بائیں نہایت چھوٹے چھوٹے پانچ پتیوں والے سفید پھولوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا..

یہ پھول بہت ہی مختصر اور بہت ہی سفید تھے..اور ان پر بے انت سفید اولے برستے تھے..

ایک تسلسل کے ساتھ..

بے حساب سفید مختصر پانچ پتیوں والے پھولوں پر بے شمار اولے گرتے اور اُچھلتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اولے نہیں گر رہے بلکہ سفید پھول اپنے ڈنٹھلوں سے الگ ہو کر اُچھل رہے ہیں..

اولوں میں اور اُن سفید پھولوں میں کوئی فرق نہ تھا..

شاید یہ سفید اولے ہی تھے جو ڈنٹھلوں پر براجمان تھے اور اب اُن سے جدا ہو کر اُچھلتے تھے..

یا پھول تھے جو اُس شام اولوں میں بدل گئے تھے..

میرے کچھ ساتھی آگے جا چکے تھے اور کچھ پیچھے رہ گئے تھے اور میں اُن کے درمیان اسی مخمصے میں اُلجھا ہوا تھا کہ کیا یہ اولے ہیں جو اُچھلتے ہیں یا سفید پھول ہیں جو اپنے ڈنٹھل ترک کر کے اُچھلتے ہیں..

ایک ذی ہوش شخص یہی قیاس کر سکتا ہے کہ انبارِ لالہ وگل..ایک براق گھوڑے، ایک نشیلی شام اور سفید پھولوں اور برف اولوں کی اُلجھن کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے جو دکھائی دے..

تو اُس لمحے جھیل دُودی پت دکھائی دی..

دُودی پت..جہاں بہت دودھ ہوتا ہے..اس لیے کہ وہاں ایسی چراگاہیں ہیں..ایسی گھاس ہے کہ اُس میں جو جانور گردن جھکا کر اُسے چرتے ہیں تو وہ بہت دودھ دیتے ہیں..

دُودی پت!

''جھیل دُودی پت..جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی''

نہیں ابھی نہیں..میں نے جلد بازی سے کام لیا اور یونہی کہہ دیا کہ جھیل دُودی پت دکھائی دی..

ایسی جھیلیں یونہی دکھائی نہیں دے جاتیں..

ہم ایک بلند ٹیلے پر پہنچے اور ہمیں ہولے ہولے قدم دھرتے ذرا کی ذرا احتیاط برتتے دوسری جانب اُترنا تھا۔ جو ہم کہیں کہیں ذرا کی ذرا پھسلتے اُترے..اور ایک نالے کے کنارے اُترے جو جھیل دودی پت کے پانیوں میں سے جدا ہو کر آ رہا تھا اور ہمیں اس کے پار جانا تھا..یہ نالہ جھیل سے جدا ہو کر اداسی سے بہتا تھا۔ یقیناً اس جدائی میں اداسی اور دل گیری تھی لیکن جب وہ یہاں سے اُتر کر وادیٔ رنگ و بو میں داخل ہوتا تھا تو اس کے کناروں پر..کئی کلومیٹر تک ساتھ دیتے جو لاکھوں عشق آتش ایسے سرخ گلال سٹے دار پھول تھے اُن کے درمیان میں بہتے ہوئے وہ اپنی اداسی اور دل گیری ترک کر کے اُن عشق آتش سرخ پھولوں کی تمازت سے دمکنے لگتا تھا اور اُسے جھیل سے جدائی کا دکھ بھول جاتا تھا..انہی کناروں پر وہ گھوڑے تھے اور اُن میں وہ ایک گھوڑا جو بدک کر بھاگا تھا اور دودھ سفید تھا نالے کے برفانی پانیوں کی طرح تو صرف اُسے دیکھنے سے ہی اداسی ترک کرنی پڑتی تھی..

ہم بھی تو اُدھر سے ہی آئے تھے..

تو ہم اس فی الحال اداس نالے کے پار ہوئے..پار ہوتے ہی ایک اور ٹیلے پر چڑھنے لگے اور جب ہم اوپر پہنچے اور نمودار ہوئے تو تب جا کر بائیں جانب جھیل دودی پت نمودار ہوئی..

یعنی نمودار تو ہو گئی ہو گی لیکن فی الحال ہمیں نظر نہ آئی..

کہ ابھی ہماری آنکھوں سے وادیٔ رنگ وبو کے رنگ نچڑتے تھے..

ایسے کہ ہم دو چار آنسو بہا کر کسی مٹیار کی سفید اوڑھنی کو رنگ سکتے تھے..

جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے ایسے ہم بھی جس گل وگلزار سے نکل کر آئے تھے اُس کے اندھے ہو چکے تھے اور ہمیں سُرخ سُرخ.. زرد زرد اور جامنی جامنی وغیرہ ہی سوجھتا تھا اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.. تو ہم ایسے اندھوں کو جھیل دودی پت کہاں سوجھتی..

ہماری آنکھوں میں قافلۂ بہار اترا تھا اور ٹھہر گیا تھا..

ایسا خیمہ زن ہوا تھا کہ رخصت ہونے کا نام نہ لیتا تھا..

پھولوں کے کھیت جھومتے تھے..

رنگوں کی ایسی فصلیں جوبن پر آئی ہوئی جھلملاتی تھیں کہ اُن کے پار ہمیں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

کچھ نہ سوجھتا تھا..

دودی پت کہاں سوجھتی..

خدا خدا کر کے آنکھوں میں سے نچڑتے رنگوں کی ٹپ ٹپ تھمنے لگی.. قافلۂ بہار خیمے سمیٹنے لگا اور ہم اندھوں کو کچھ کچھ سجھائی دینے لگا..

شام میں.. بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے مدھم ہوتے رنگوں کے پار جھیل دودی پت کے نیلے ذخیرے دکھائی دینے لگے..

پانیوں کے پار سیاہی مائل سبزے سے ڈھکی جو ڈھلانیں تھیں اُن پر جو برفیں تھیں وہ ابھی تک پگھلی نہ تھیں.. گھاٹیوں میں براجمان تھیں اور جہاں انہیں سورج ستاتا تھا وہاں وہ چھدری ہو رہی تھیں اور جہاں وہ اُس کی کرنوں کی زد میں کم آتی تھیں وہاں وہ گھنی اور سفید انبار تھیں.. جھیل کے کناروں پر اُتر کر اُس کے پانیوں میں داخل ہو رہی تھیں تو وہاں برف کنارے تھے..

ہمارا سانس ناہموار ہونے لگا.. رُک رُک کر آنے لگا..

یہ محض ایک پوشیدہ نیلگوں اور تنہا پانیوں کی جھلک کی کرشمہ سازی نہ تھی بلکہ اس مقام کی پورے بارہ ہزار چھ سو فٹ کی بلندی بھی تھی جو اثر دکھا رہی تھی اور ہمارے سانس کی آمد و رفت میں خلل ڈال رہی تھی..

ویسے اس کی شکل شباہت جھیل سیف الملوک سے مشابہ تھی بلکہ یہ اُس کی چھوٹی ہمشیرہ لگتی تھی..

لیکن بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بڑی کی نسبت چھوٹی بہن زیادہ پیاری نکل آتی ہے..

اس لیے بھی پیاری لگتی ہے کہ اُس کی کم سنی کے باعث اُس تک رسائی حاصل کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے.. اُس پر کسی کی نظر نہیں جاتی.. بے شک جس نے بھی ڈالی بُری نظر ڈالی لیکن بُری نظر ڈالنے کے لیے بھی تو اُس تک رسائی شرط ہے.. اور ہم نے یہ شرط پوری کر دی تھی.. اور یہاں بھی ہمیں چین نصیب نہ ہوا..

اندھے ہو جانے کے باوجود ہمیں چین اس لیے نصیب نہ ہوا کہ جھیل پر بھی وہی فصل لالہ وگل امڈتی ہجوم کرتی تھی۔ اگرچہ یہ یہاں سبزے پر حاوی نہ ہوتی تھی.. اُسے کہیں کہیں نمایاں ہونے کی اجازت دے دیتی تھی..

ہم ٹیلے سے اُتر کر جھیل کے پانیوں تک مست سانپوں کی مانند جھومتے سرکتے گئے تا کہ انہیں قریب سے دیکھیں اور اُن پر بُری بُری نظریں ڈالیں اور پانیوں نے بھی چنداں اعتراض نہ کیا کہ وہ بھی منتظر تھے کہ کوئی تو آئے بے شک بُری نظر ہی ڈالے.. نہ ہم نے آپس میں کوئی بات کی نہ توصیفی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا کہ ہم سب اپنے آپ میں مگن مسلسل مسکراتے تھے..

آپ کسی بھی معمولی جھیل کو جب پہلی بار دیکھتے ہیں تو دل ذرا رُکتا ہے اور اگر آپ جھیل دُودی پت کو پہلی بار دیکھیں تو دل دیر تک رُکا ہی رہے تو یہ تو ہوتا ہی ہے..

کاغان کا اکلوتا بُدھ بشیر ہمارے تعاقب میں لڑھکتا چلا آ رہا تھا..

''بشیر.. ہمارے خیمے عین یہاں پر ایسے نصب کیے جائیں کہ اُن کا رُخ جھیل کی جانب ہو اور بے شک کناروں کے اتنے قریب لگائے جائیں کہ ہمیں اُن میں داخل ہونے کے لیے ایک کشتی درکار ہو..''

''تارڑ صاحب یہاں زمین گیلی ہے.. پانیوں کی قربت ہے اور پونے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی ہے تو یہاں سونے سے نمونیا ہو جائے گا۔''

"ہو جائے۔۔" میں نے یہ "ہو جائے" اُسی شاہانہ انداز میں کہا جیسے پرتھوی راج "مغل اعظم" میں "پیش کیا جائے" کہتا ہے۔۔

"ٹینٹ تو لگا دیئے گئے ہیں" بشیر پر بھی میرے نادر شاہی موڈ کا اثر ہو گیا اور اُس نے بھی یہ "لگا دیئے گئے ہیں" اُسی شاہانہ انداز میں کہا۔۔ "آپ حکم کرو تو اُنہیں اکھاڑتے ہیں یہاں لا کر لگاتے ہیں لیکن شام ہو جائے گی اور نمونیا بھی ہو جائے گا۔"

"رہنے دو" میں نے ہار مان لی۔

ہم نے جھیل سے مُنہ موڑ کر اُس ٹیلے کو دیکھا جس کی بلندی پر ہمارے خیمے نصب ہو چکے تھے اور وہاں دو زرد رنگت کے۔۔ ایک سرخ اور ایک سُرمئی گنبد بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے نظر آئے۔۔

ہم نے فوراً کچھ حساب کتاب کیا۔۔

ایک زرد گھر میاں صاحب کا۔۔ دوسرا سلمان کا۔۔ سُرخ گنبد والا اُس کا جو بوڑھا اور سمندر نہ تھا بوڑھا اور پہاڑ تھا۔ یعنی میرا۔ تو یہ چوتھا سلیٹی رنگ کا خیمہ کون لگا گیا ہے۔۔

"یہ میرا ہے صاحب۔" بشیر نے فوراً کہا۔

"لیکن بشیر۔۔" سلمان نے ذرا لٹک کر سنو لیک کے "یوسف اوئے یوسف" کے انداز میں لاڈ سے کہا "یہ تو نہایت خوبصورت اور زبردست خیمہ ہے، تمہارا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایک گورے نے دیا تھا صاحب۔"

"کتنا گورا تھا بشیر۔۔ تارڑ صاحب سے بھی گورا تھا؟"

سلمان ایسے موٹو بچہ لوگ کو لفٹ کرانے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں کا لحاظ نہیں کرتے اور بد تمیز ہو جاتے ہیں۔۔

"بکواس نہیں کرو سلمان۔"

اُس پر میری ڈانٹ کا کچھ اثر نہ ہوا اور اُس نے ایک نسوانی سی انگڑائی لے کر کہا "ہائے اوئے"

یہ "ہائے اوئے" اُس نے آخری بار گندوگورو کی شام میں لیلے پیک کو تکتے ہوئے کہا تھا۔۔

ہم جھیل سے جدا ہو کر ٹیلے پر چڑھنے لگے جہاں خیمے بہار دکھاتے تھے۔۔ ذرا ایک جانب گھاٹی پر ہمارے سامان بردار گھوڑے گھاس اور پھولوں میں تھوتھنیاں دیئے شکم پُری کے عمل میں مشغول تھے اور اُن کے مالک الاؤ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کر رہے تھے۔۔

جیسے پہاڑوں میں۔۔ شام ہوتی ہے اور پھر یکدم اگلے لمحے رات گر جاتی ہے ایسے رات گری اور پورٹروں کے روشن کیے ہوئے الاؤ اور ٹیلے کے نیچے دودی پت نالے کے کنارے ایک چٹان کی اوٹ میں ایستادہ حافظ نواز کے کچن ٹینٹ میں جلتے سٹوو کی روشنی کے سوا سب کچھ تاریکی میں دفن ہو گیا۔۔

کمالِ حسن اپنی جگہ اور سردی کی شدت اپنی جگہ۔۔

ہم آغوشی بھی ٹھٹھرتی حالت میں ممکن نہیں ہوتی بے شک حسن کمال کو پہنچا ہوا گداز اور شہوت انگیز ہو تو میں جھیل دودی پت سے توبہ تائب ہو کر پناہ کے لیے اپنے خیمے میں چلا گیا۔۔

آج سفر کی تیسری اور کوہ نوردی کی دُوسری رات تھی۔۔ اور مجھے کچھ دھچکے لگے تھے۔۔

یہ ٹریک ایسا نہ تھا جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا۔۔

تصور تو میں نے یہی کیا تھا اور دوستوں کو اسی تصور کا جھانسا بھی دیا تھا کہ ہم ہری بھری چراگاہوں میں چہل قدمی کرتے سیٹیاں بجاتے گنگناتے لاپروا بے تھکن چلتے جائیں گے۔۔ ہر پتھر۔۔ اگر راستے میں کوئی پتھر ہوا تو۔۔ اور ہر بلندی۔۔ اگر کوئی نابالغ بلندی آئی تو۔۔ اُس پر چشم حقارت ڈالتے چلتے جائیں گے کہ تم کیا جانو کہ اصل شمال کے پتھر کیسے ہوتے ہیں اور بلندیاں کتنی ہوتی ہیں۔۔

ہم تو تم پر ترس کھا کر ادھر آ گئے تھے۔۔

لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہو گیا۔۔ نہ گنگنانے کی فرصت ملی اور نہ سیٹیاں بجانے کی۔۔

بے شک بلندیاں کم کم تھیں۔۔ پتھروں میں بھی تکبر اور جلال نہ تھا۔۔ نہ کسی پہاڑی نالے میں مرگ وحشت تھی لیکن پھر بھی ہم بہت بدحال ہوئے۔۔ نہ راستے میں سانس بحال ہوا اور نہ ہم۔۔ لیکن ہم یہ بھی تو اپنے آپ کو پوچھ سکتے تھے کہ پورے شمال میں کوئی ایسی وادی رنگ و بُو ہے جس میں سے آج تمہارا گذر ہوا؟ نہیں ہے!

کیا ہم اس سے پیشتر کبھی اندھے ہوئے؟ نہیں ہوئے!

اور کبھی لُولُوسر اور دودی پت ایسی جھیلوں کے کنارے خیمہ زن ہوئے؟ نہیں ہوئے!

عدؔم نے کہا تھا..

نشہ شراب کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

تو یہاں اگرچہ بلندیوں اور برفوں کی بے انت شراب مقدار میں کم تھی لیکن یہاں ساقی نظر ملا کے پلا رہا تھا تو ہم صرف مست نہیں بدمست ہو گئے تھے..

بلند شمال کا.. فیئری میڈو، نانگا پربت، شاہ گوری، سنولیک، یاک سرائے یا لیلیٰ پیک کا ساقی آپ سے کبھی نظر نہیں ملاتا تھا۔ وہ اپنے آسمانی تخت پر جو پہاڑوں کے دیوتاؤں کا تخت کہلاتا ہے، وہاں براجمان راج کرتا تھا اور اپنے راج میں داخل ہونے والے کوہ نورد ذرّوں کے وجود سے بھی آگاہ نہیں ہوتا تھا..

اُسے کچھ پروا نہیں تھی کہ آپ اُس کی مہیا کردہ شراب پیتے ہیں یا نہیں..

آپ خواہش ہی کرتے رہتے ہیں کہ کاش یہ ساقی ایک نظر ہم پر بھی ڈال لے..

لیکن وہ اپنے بلند سنگھاسن سے اُتر کر آپ کی سطح پر آئے تو نظر ملائے!

لیکن یہاں..

یہ ساقی رُوبرُو تھا..

نظر ملاتا تھا اور پلاتا تھا..

اور شکر گزار ہوتا تھا کہ مے خوار مجھ تک پہنچے تو سہی..

''تارڑ صاحب ایک بُری خبر ہے... اور فُل بے دید لوگ''

''تارڑ صاحب..'' کاغانی بُدھ خیمے کے پردے کو اُٹھا کر نمودار ہوا۔ ''ایک بُری خبر ہے۔''

''پورٹروں نے بغاوت کر دی ہے؟''

پہاڑوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی خبر بُری نہیں ہو سکتی..

''نہیں.. طبیعت خراب ہے۔''

''تمہاری؟''

''نہیں جناب.. بٹ صاحب کو تیز بخار ہے اور وہ متعدد بار قے کر چکے ہیں۔ قیصر صاحب بھی بخار کی شدت میں مبتلا ہیں اور ہذیان میں ہیں۔ سلمان صاحب کے سر میں شدید درد ہے اور اُن سے چلا نہیں جا رہا..''

یہ ایک نہیں تین بُری خبریں تھیں..

''بٹ اور قیصر کا یہ پہلا پہاڑی سفر ہے.. ایسا ہو جاتا ہے.. انشاءاللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''نہیں صاحب'' بشیر جھکا رہا۔ ''اگر تیز بخار ہوتا ہے، ساتھ میں قے بھی آتی ہے اور آنکھیں بہت سرخ ہو جاتی ہیں تو تارڑ صاحب یہ ہائٹ کا اثر ہے اور بہت خطرناک علامت ہے۔''

''اتنی زیادہ ہائٹ تو نہیں بشیر۔''

''پونے تیرہ ہزار فٹ کی ہائٹ ایک ناتجربہ کار ٹریکر کے لیے بہت ہوتی ہے۔ یہ لوگ بے شک جوان ہیں پر ان کے پھیپھڑے ہائٹ کے عادی نہیں.. اسے سہار نہیں سکتے..''

''تو پھر.. تم کیا کہتے ہو؟''

''ان کا ہائٹ کم کرنا ہوگا.. ورنہ مشکل ہے.. خطرہ ہے جان کا۔''

''تو پھر..'' میں اتنا نروس ہوا کہ سوائے ''تو پھر'' کے اور کچھ نہ کہہ سکا..

''ان کو نیچے.. واپس بیسل یا ناران بھیجنا پڑے گا.. ہائٹ کم کرنے کے لیے۔''

''تینوں کو؟''

''ہاں صاحب۔''

''تم چلو میں آتا ہوں۔''

خان سلیم کے خیمے میں ہم سب جمع تھے.. سارا نشہ کافور ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں سے نہ رنگ نچڑتے تھے اور نہ کوئی ایک پھول بہار دیتا تھا.. خوف اور بے بسی کی بینائی تھی.. خزاں حاوی ہو گئی تھی.. بٹ صاحب کا رنگ رُوپ اُجڑا ہوا تھا.. بار بار قے کرنے سے اُس کا چہرہ پیلا اور ناتواں ہو رہا تھا۔ وہ اگرچہ مسکراتا تھا لیکن بے چارگی اور معذرت کے انداز میں..

قیصر کی عینک بار بار ناک سے پھسلتی تھی اور وہ ابکائیاں لے رہا تھا..

اگرچہ اُن کی نسبت سلمان بہتر حالت میں تھا لیکن اُس نے بھی اقرار کیا کہ سر کا درد سہا نہیں جاتا..

''تو پھر.. کیا کریں بشیر؟''

''یہ رات خیر خیرت سے گذر جائے تو کل سویر ان کو نیچے بھیج دیں.. خطرہ مول نہ لیں..''

بشیر کے اس مشورے پر تینوں میں سے کسی ایک نے بھی احتجاج نہ کیا.. شرمندہ سے بیٹھے رہے..

''نیچے کیسے بھیجیں؟''

''گھوڑوں پر..''

''گھوڑے کہاں سے آئیں گے؟''

''گھوڑے'' بشیر مسکرا دیا ''آپ نے آج دیکھے نہیں۔ اس وادی میں گھوڑے بہت ہیں، ہارس ویلی ہے سر.. میں ابھی کسی پورٹر کو نیچے بھیجتا ہوں وہ سویر تک گھوڑے لے آئے گا..''

پھر خاموشی چھا گئی.. سب لوگ گُم سے ہو گئے..

سراسر بھول گئے کہ ہم جھیل دُودی پت کی ایک رات میں ہیں..

وہ تین.. بلندی کے شکاری کی زد میں آ گئے تھے اور ہم تینوں اس شکاری سے فی الحال بچ نکلے تھے لیکن ہم سب ہی مجرم محسوس کر رہے تھے..

وہ.. اس لیے کہ شکار ہو گئے تھے..

اور ہم.. اس لیے کہ شکار نہ ہوئے تھے..

اس میں نہ کوئی اُن کا دوش تھا اور نہ کوئی ہمارا کمال..

''کیوں تارڑ صاحب..'' کسی نے پوچھا۔

''کل صبح صرف یہ تینوں نہیں ہم سب واپس چلیں گے.. مُہم ترک کی جاتی ہے۔''

''کیوں تارڑ صاحب؟'' اُس کسی نے پھر پوچھا۔

''اگر چھ میں سے تین کوہ نورد دوست واپس چلے جاتے ہیں تو ہم کس دل سے آگے جائیں.. ان کے بغیر ہم تینوں ادھورے محسوس کریں گے.. یوں بھی ہم نے لُولُوسر دیکھ لی.. وادیٔ رنگ و بو میں سے گذرے اور اب جھیل دودی پت کے کناروں پر خیمہ زن ہیں تو کافی کچھ دیکھ لیا.. واپس چلتے ہیں اکٹھے.. اگلے برس پھر آ جائیں گے..''

اس فیصلے پر کوئی بھی خوش نہ تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا..

لیکن سلیم کی ناخوشی کسی اور وجہ سے تھی.. اس نے پہلے اپنی بکھری ہوئی مونچھوں کو تادیر سنوارا پھر اُنہیں تاؤ دیا اور پھر جا کر بولا ''تارڑ صاحب.. آپ سب سے بے شک واپس چلے جائیں، میں تو نہیں جاؤں گا..''

''میں کہہ چکا ہوں کہ ہم سب واپس جائیں گے..''

''آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے.. ایسی پہاڑی مُہموں کے دوران لوگ بیمار ہوتے رہتے ہیں لیکن اُن کی خاطر مُہم ترک تو نہیں کی جاتی.. کیوں میاں صاحب؟''

میاں صاحب ایک ناتواں سی جھرجھری لے کر بولے.. ''تارڑ صاحب لیڈر ہیں، یہ جو

فیصلہ کریں مجھے قبول ہے لیکن خان سلیم بھی غلط نہیں کہہ رہا۔۔"

اس پر بلندی کے بیچاروں ان تینوں نے بھی بیک آواز صلاح دی کہ نہیں نہیں، آپ آگے چلے جائیے۔صرف ہماری وجہ سے مُہم ختم نہ کریں۔۔

قیصر کا حال اچھا نہ تھا اور بٹ کا چہرہ اتنا لاغر اور نچڑا ہوا تھا کہ اُس کی مونچھیں ابھر آئی تھیں۔۔سلمان بھی ڈاؤن تھا۔۔

"یار اگلے برس آجائیں گے۔" میں نے خان سلیم کی منت کی "انہیں واپس بھیج کر ہم آگے چلے گئے تو پورے سفر کے دوران ہمیں یہ پریشانی کھا جائے گی کہ پتہ نہیں یہ کس حال میں ہیں، ناران تک بھی پہنچے ہیں یا نہیں۔۔"

"کیوں یہ کاکے ہیں۔۔انگوٹھا چوستے چُھنے کاکے ہیں جو راستے میں گم ہو جائیں گے۔۔یہ ڈک تک اُترے تو چنگے بھلے ہو جائیں گے۔۔میں تو آگے جا رہا ہوں۔۔" خان سلیم تو فُل بے دید ہو گیا۔۔

یہ "فُل" بھی لاہوریوں کا اختراع کردہ اظہار ہے۔۔کسی بھی شے یا انسان کی کاملیت بیان کریں گے تو اس کے ساتھ "فُل" لگا دیں گے یعنی یار یہ جھیل تو فُل ہے۔۔فلاں ڈرامہ تو فُل کامیڈی ہے۔۔یا یہ کہ سامنے سے آنے والی خاتون فُل ہے بھئی۔۔چونکہ خان سلیم اپنی ملتائی نیشنل پوزیشن کے باوجود اپنی شکل اور اظہار کو اُس مرتبے پر جان بوجھ کر نہ لے کر گیا تھا اور بدستور لاہوریا تھا اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ فُل بے دید ہو گیا۔۔

"آپ کہتے ہو کہ اگلے برس آجائیں گے۔۔اگلا برس کس نے دیکھا ہے، آئے نہ آئے۔آپ نے ان کاکوں کی رکھوالی کرنے کی خاطر کُوچ کا نقارہ بجانا ہے تو بجا دیں ہم دونوں تو آگے جا رہے ہیں۔۔کیوں میاں صاحب؟"

"آہو جی۔۔" میاں صاحب بھی رنگ پکڑ گئے اور فُل بے دید ہو گئے۔۔

ویسے تو اندر سے میں بھی ڈانواں ڈول ہو رہا تھا، مروّت کے مارے اور لیڈری کا مارا ہوا کہے چلا جا رہا تھا کہ یہاں سے واپس چلتے ہیں۔۔میں بھی کسی حد تک ایک خفیہ فُل بے دید تھا "ٹھیک ہے خان صاحب۔تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔۔یہ صبح واپس جائیں گے اور ہم آگے جائیں گے۔"

"ایک اور تجویز ہے سر۔" خان سلیم فوراً فُل بے دیدگی سے تائب ہو کر فُل مؤدب ہو گیا۔ "کیوں نہ ہم یہاں سے آگے پیدل چلنے کی بجائے گھوڑوں پر سفر کریں۔۔وہ اورنگزیب نہیں گھوڑے والا وہ کہہ رہا تھا کہ صاحب آپ تو پاگل ہو جو یوں پیدل چل چل کر اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہو۔ادھر سے گھوڑا لو اور مزے مزے سے دو چار دن میں درّوں کو عبور کرتے پار ہو جاؤ۔۔کیا خیال ہے؟"

"یار مجھے تو گھڑ سواری کا کوئی تجربہ نہیں۔" "یاک سرائے" کے دوران نگیر کے گھوڑے پر بیٹھا تھا کچھ دیر کے لیے اور پریشان ہی بیٹھا تھا۔۔مجھ سے نہیں ہوگا۔۔میاں صاحب آپ کیا کہتے ہیں؟"

"جناب عالی ہماری جو زمینیں تھیں ناں لاہور کے آس پاس تو ہم نے ایک گھوری رکھی ہوئی تھی بہت اتھری تو میں جب چھوٹا تھا تو اُس پر سواری کرتا تھا تو مجھے کوئی پرابلم نہیں۔۔"

"میاں صاحب گھوڑی کہ گھوری۔۔"

"یار بتایا جو ہے کہ گھوری۔۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ گھوری پہ سواری کر سکتے ہیں گھورے پر نہیں؟"

"خان سلیم تم بکواس نہ کرو اور بتاؤ کہ تمہارا کیا تجربہ ہے؟"

"مجھے تو خاصا تجربہ ہے۔۔بلکہ کسی حد تک ماہر گھڑ سوار ہوں۔" خان سلیم نے اعلان کیا "اور سر تارڑ صاحب ہارس رائڈنگ کوئی مشکل کام نہیں۔۔یورپ اور امریکہ میں تو ہر دوسری لڑکی ہارس رائیڈنگ کرتی ہے۔۔"

"اُنہیں مختلف اقسام کی رائڈنگ کرنے کی عادت ہوتی ہے تو ہارس رائیڈنگ بھی کر لیتی ہیں خان صاحب۔۔آگے میدانی سفر ہوتا تو شاید میں بھی گھوڑے پر بیٹھ کر ٹھک ٹھک چلا جاتا لیکن راستے میں بلند درّے ہیں۔کھائیاں، گلیشیئر اور دریا ہوں گے۔۔مشکل ہے۔"

"سر جی اورنگزیب کہتا ہے کہ اُن کے گھوڑے بڑے شریف ہیں، بے شک ایک بچے کو اُن پر بٹھا دو تو وہ انگوٹھا چوستا رتّی گلی جا پہنچے گا اور اُسے خبر بھی نہیں ہوگی۔آپ فکر نہ کریں ہم مل ملا کے آپ کو گھوڑے پر بٹھا دیں گے اور منزل پر پہنچ کر آپ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر نیچے اُتار لیں گے۔۔اس دوران اورنگزیب یا سلیم آپ کے گھوڑے کی باگ تھام کر آگے آگے چلے گا، بے شک

آپ اونگھتے رہیں اپنی عمر کے حساب سے..''

''ٹھیک ہے بیٹھ جاؤں گا..کدھر ہے گھوڑا..''

اس گھوڑا گفتگو کے دوران وہ تینوں بلندی کے مارے ہوئے ہمیں بے چارگی سے تکتے رہے کہ ہم تو یہاں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہیں اور یہ اتنے بے مروت ہیں کہ نہ ہمیں کوئی دوا دیتے ہیں نہ کوئی مٹھی چاپی کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی خاص فکر مندی ان کے چہروں پر ہے اور اپنے گھوڑا منصوبے بنائے ہی جا رہے ہیں۔

''تو پھر کیا فیصلہ ہے سَر..''بشیر نے دریافت کیا۔

''ہمارے پاس سامان والا کتنا گھوڑا ہے؟''

''تین ہے..''

''اور گھوڑا والا..''

''وہ بھی تین ہے..''

''تو کل سویرے تین گھوڑے ان بیماروں کو بیسل واپس بھیجنے کے لیے اور مزید تین ہمیں رتی گلی کے پار لے جانے کے لیے۔کُل چھ گھوڑے مزید درکار ہیں۔''

''میں ابھی سلیم کو نیچے وادی میں بھیجتا ہوں..مجھے امید ہے کہ وہ صبح تک گھوڑے لے آئے گا۔''

''وہ بے شک اُنہیں اگر ابھی لاسکتا ہے تو لے آئے۔تسلی رہے گی۔''

''گھوڑا تلاش کرنے میں بہت ٹائم لگتا ہے صاحب۔''بشیر مسکرایا۔

''نیچے وادی میں ہے تو جائے اور لے آئے۔تلاش کہاں کرنا ہے؟''

''گھوڑا پکڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا صاحب..وہ تو چراگاہ میں سینکڑوں دوسرے گھوڑوں کے ساتھ چرتا ہے اور مستیاں کرتا ہے..سلیم نیچے جا کر مالک کو بولے گا کہ گھوڑا لا دو تو وہ سویرے چراگاہ میں جائے گا..پہلے تو وہ سینکڑوں گھوڑوں میں سے اپنا گھوڑا نہیں پہچان سکے گا..پھر اُن کے درمیان گھومے گا..کبھی وہ پہچان لے گا اور کبھی گھوڑا اُسے پہچان کر ہنہنائے گا تو وہ جان جائے گا کہ یہ میرا ہے۔''

''یہ تو بڑا طویل طریقہ کار ہے۔''

''جی صاحب..لیکن یہ طریقہ کار تو ابھی شروع ہوتا ہے جب گھوڑا مالک کو دیکھ کر ہنہناتا ہے..اُس کے پاس نہیں آتا ہنہنا کر سرپٹ بھاگتا فرار ہو جاتا ہے..اُس کے قابو میں نہیں آتا..اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

''صاحب ادھر گھوڑی بھی تو ہوتا ہے اُسے چھوڑ کر کیسے آجائے۔''

''بشیر''سلیم نے اپنی مونچھوں کو واجبی سا تاؤ دیا۔''ہم اپنی بڈھی گھوڑیوں کو چھوڑ کر ادھر آجاتے ہیں تو گھوڑا نہیں آسکتا۔''

بشیر کی توند ہلنے لگی، ہنستا ہوا بولا''ادھر گھوڑی بڈھی نہیں ہوتا تو گھوڑا کیسے اُسے چھوڑ دے۔''

''یار تم مختصر بات کرو۔''میں سنجیدہ ہو گیا۔''کل صبح تک چھ گھوڑے آسکتے ہیں یا نہیں؟''

''آسکتے ہیں سر..میں ابھی سلیم کو نیچے وادی میں بھیجتا ہوں..''

بشیر اٹھنے لگا تو سلمان نے اُسے روک لیا''بشیر سلیم سے کہنا کہ ایک گھوڑا نیوٹرل قسم کا لائے..ہوسکتا ہے میری طبیعت صبح تک سنبھل جائے..سنبھل گئی تو میں رتی گلی چلا جاؤں گا نہ سنبھلی تو بیسل اُتر جاؤں گا..''

اس پر خان سلیم نے سلمان سے مخاطب ہو کر کہا''موٹے بچے تم اتنے بیمار نہیں، بس ہمت ہار گئے ہو..اپنے نین پران چھوڑ گئے ہو..تم تو نوجوان ہو..مانا کہ حال ہی میں تمہاری شادی ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں کسی حد تک نقاہت کا شکار ہو گئے ہو لیکن یہ عارضی ہے..''

سلمان خفا ہو گیا''یہ جو تیز بخار اور شدید سر درد ہے، یہ عارضی ہے..اور اس کا شادی سے کیا تعلق..''

''جب شادی نہیں ہوئی تھی تو کوہ نوردی کے دوران کبھی بخار ہوا تھا..سر درد ہوا تھا..نقاہت طاری ہوئی تھی؟''

''نہیں..''

''تو پھر..''

"پھر یہی کہ گھوڑا نیوٹرل ہونا چاہیے..غیر جانبدار قسم کا..جو رتی گلی بھی چلا جائے اور بیسل بھی اُتر جائے.."

"کھانا بن گیا ہے صاحب.." انور کی داڑھی مشاورتی خیمے کے اندر لہرانے لگی۔

"یار کھانا یہیں لے آؤ..یہ دودی پت ہسپتال میں داخل تین مریض چل پھر نہیں سکتے۔" میاں صاحب نے فرمادیا..

کھانے سے فارغ ہو کر مریض اپنے خیموں میں منتقل ہو گئے..اور ہم اپنے خیموں میں..

"ابدیت کے شعلے کے سامنے فنا کا ٹمٹماتا چراغ..میں تھا"

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی..

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ٹریک کے دوران کسی ساتھی کو بیماری کے باعث واپس جانا پڑا ہو..خالد ندیم ٹھنگل سے واپس ہوا تھا اور نوید سکردو سے جب کہ ابھی ٹریک شروع نہیں ہوا تھا..

شگون اچھا نہ تھا..

صرف تین کوہ نوردیوں بھی ایسے ویرانوں میں غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں..

میرے خیمے کے کلیجی رنگ کے گنبد میں سے ہلکی روشنی نکھرتی سرایت کرتی آتی تھی جو بجھے چاند کی تھی اور میرے چہرے پر بکھرتی تھی..

باہر نکلا جائے..میں نے سوچا..

میں نے بہت ہمت کی..سلیپنگ بیگ کی آغوش میں سے نکلنا کسی شاہ گوری کی آغوش میں سے نکلنے سے بھی مشکل تھا..

باہر آیا تو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا..

نہ پھول اور نہ سرسبز ڈھلوانیں..

نیچے کنارے تک چلا گیا..پانی کے اندر قدم رکھتے رکھتے بچا..

بجھی ہوئی چاندنی کے سناٹے میں جھیل کے پانی ایک سیاہ سکوت کے فریب میں تھے..صرف دوسرے کنارے پر پانیوں تک آتی برفیں مدھم مدھم دکھائی دے جاتی تھیں..اور ہمارے تین گھوڑے تھے جو سیاہ ہیولے تھے..

ایک ٹیلے کی چوٹی پر معلق..

دوسرا ہماری خیمہ گاہ کی قربت میں..

اور تیسرا مجھ سے کچھ فاصلے پر جھیل میں سے نکلتے نالے کے کنارے..

جو چوٹی پر تھا وہ بجھی ہوئی چاندنی میں بجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا..

ہماری خیمہ گاہ کے آس پاس جو تھا وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور کبھی کبھار نظر آ جاتا تھا..

اور جو گھوڑا نالے کے کنارے کھڑا تھا کبھی مدھم ہو جاتا اور کبھی ایک پل کے لیے نمایاں ہو جاتا..

میں نے متعدد بار اس کیفیت کو.. عجیب سرشاری اور روحانی کیف کو بیان کیا ہے۔ جب آپ کہیں بلند پہاڑوں کے اندر، قدرت کے کسی معجزے کے درمیان، یکسر تنہا، کسی اور زمین پر ایک اور آسمان تلے آبادیوں سے کوسوں دور جب آپ کے سوا کوئی نہیں ہوتا سوائے اُس کے جو ہر جگہ ہوتا ہے تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں.. شاید ایک چھوٹے سے دیوتا..

بے شک آپ ایک بوڑھے برگد ہوں.. ٹھگنے بدشکل ہوں.. نوٹرڈیم کے کُبڑے ہوں، آپ محسوس ایک چھوٹے سے دیوتا ہی کرتے ہیں.. ہندو یا یونانی دیومالا کے ہزاروں دیوتاؤں میں سے سب سے نچلے درجے پر براجمان بے شک ایک کمی کمین دیوتا.. لیکن بہر حال ایک دیوتا..

صرف ایک فرق کے ساتھ..

دیوتاؤں کو اپنی ابدیت کا یقین ہوتا ہے اور وہ ان پہاڑوں کی تنہائی اور حسن کو ایسے تو محسوس کر سکتے ہی نہیں جیسے میں ایک معمولی بشر کہ مجھے اپنی فنا کا یقین ہے.. اسی لیے جھیل دودی پت کی سرد تنہا رات میں قدرت کے اس معجزے کو میں ایسی ہوس سے دیکھتا ہوں.. جیسے آخری بار دیکھ رہا ہوں..

دیوتاؤں میں یہ ہوس نہیں ہوتی.. ہو نہیں سکتی..

وہ اپنی ابدیت کے سحر میں مبتلا یہ جانتے ہیں کہ اس منظر کو وہ دوبارہ.. کئی بار جب جی چاہے دیکھ لیں گے.. کہ اُن کی حیات کی کوئی ڈیڈ لائن نہیں ہے..

اور میں جانتا ہوں کہ میری ڈیڈ لائن ہے..

اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کا امکان نہیں..

اس لیے میں اُسے اُس ہوس سے اور چاہت سے دیکھتا ہوں جو آخری جدائی کے خیال سے جنم لیتی ہے..

یوں میں اُن دیوتاؤں سے افضل سطح پر ہوں.. میں اُن کی ابدیت کے شعلے کے سامنے اپنی فنا کا ٹمٹماتا چراغ جلاتا ہوں اور اُن سے بلند درجے پر فائز ہو جاتا ہوں..

ایک گھوڑا جو شاید میری موجودگی کی باس سے آشنا ہو گیا اور گردن اُٹھا کر ہنہنایا..

دوسرے گھوڑوں نے بھی کان کھڑے کر دیئے..

ثبات چونکہ صرف تغیر کو ہے، اس لیے تغیر ہوا..

پل بھر میں کچھ اور ماجرا ہو گیا..

ابھی نیم تاریکی میں ہر شے روپوش سناٹے میں تھی اور ابھی بجھا ہوا چاند یکدم شفاف اور روشن ہو گیا..

ہر شے عیاں ہو گئی.. برہنہ اور عریاں ہو گئی.. نظر آنے لگی..

تینوں گھوڑے بھی نمایاں.. ہمارے خیمے اور ذرا غور کرنے سے ڈھلوانوں پر اونگھتے پھول کہ رات کو سب پودے اور پھول آرام کرتے ہیں.. یہاں تک کہ میرے پاؤں تلے جو گھاس تھی اُس کے ہریاول تنکے بھی.. اگر اتنا کچھ ظاہر ہو گیا تھا تو دودی پت کے پانی کیوں ظاہر نہ ہوتے..

پونے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر..

جب کہ بجھا ہوا چاند یکدم بھڑک اُٹھا تھا، جھیل کے پانی ایک دیوزاد جگنو کی مانند ٹمٹمانے لگے۔

اور مجھے خدشہ ہوا کہ نیلاہٹ سے بھرا یہ ایک جگنو ابھی برفوں اور سبز ڈھلوانوں کے دامن میں آ بیٹھا ہے اور ابھی پرواز کر جائے گا تو باقی ایک تاریک خلاء رہ جائے گا..

لیکن نیلاہٹ سے بھرا وہ جگنو میری قربت کی آہٹ سے ہراساں ہو کر اُڑا نہیں.. ایک شانت حالت میں میری آنکھوں کے سامنے براجمان رہا..

یہ تغیر پل دو پل کا قصہ تھا..

اور پھر اگلے پل.. تاریک پہاڑوں میں سے اُبھرتا چاند جو پہلے بجھا ہوا تھا.. پھر یکدم اپنی کینچلی اُتار کر پُھرتیلا اور روشن ہو گیا تھا اور جھیل کے پانیوں کو ایک جگنو میں ڈھال دیا تھا.. بس اُسی بے پروائی سے اگلے پل پھر اپنے دھیمے پن میں چلا گیا اور میں.. جھیل کے پانی.. گھوڑے.. خیمہ گاہ.. برفیں.. تاریکیوں میں اُتر گئے..

''اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تو ہے''

نیند تو آنی تھی.. سو آ گئی..

رات تو گذرنی تھی.. سو گذر گئی..

اور صبح تو ہونی تھی جو ہو گئی..

سویرے سویرے..

میں اب بھی اپنے خیمے سے باہر تھا..

ٹھٹھرتا تھا.. سویرے سویرے..

ہر شے سکوت میں.. تھمی ہوئی.. ہر شے جہاں تھی کسی سحر کی پھونک سے وہیں ساکت سانس روکے ہوئے..

ابھی طلوع کی سفیدی کا گورا بدن مکمل طور پر عیاں نہ ہوا تھا.. ہولے ہولے ظاہر ہو رہا تھا..

رات کی سیاہی میں گھلتا اُسے رخصت کر رہا تھا..

تو اُس ساعت میں بھی جھیل وہاں نہ تھی..

گھاس بھری چاروں اور سے اُترتی ڈھلوانیں رات کی ٹھنڈک میں سرد ہو رہی تھیں..

خیمہ گاہ کے گرد پھولوں کے قافلے اپنے رنگ نکھار رہے تھے.. نیند سے بیدار ہو رہے تھے لیکن وہ بھی سانس نہ لیتے تھے..

صرف گلیشیئر تھے جو دکھائی دے رہے تھے جیسے آئینے ہوں..

اور جھیل نہ تھی..

اُس کے پانی اتنے ساکت اور بغیر کسی ہلکی سی لہر کے تھے کہ گویا نہ تھے اور اُن پر اُمڈتے جو صدرنگ پھول تھے.. برفیں اور نچڑتی ہوئی گھاس تھی وہ سب کے سب اتنی کاملیت کے ساتھ اُن پر عکس ہو رہے تھے گویا نقش ہو چکے ہیں۔ چنانچہ پانی دکھائی نہ دیتے تھے.. آئینے ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے تھے..

صبح کے مدھم اُجالے میں.. یہ جھیل کی ہیر برفوں، گلابی رنگتوں اور سبزے کی تراوٹوں کو اپنے آپ پر یوں عکس کر رہی تھی کہ وہ ہیر نہ رہی تھی.. برف کی سفیدی۔ سبزے اور رنگ وبُو کا رانجھا ہو گئی تھی.. ہیر نہ رہی تھی.. میں جب.. سویرے سویرے.. خیمے سے باہر آیا تھا تو یکدم ٹھٹک گیا تھا اور واقعی مجھے گمان ہوا کہ میرا چہرہ جھیل کی جانب نہیں.. اگر ہوتا تو وہ دکھائی دیتی.. اور پھر فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ وہاں ہے تو سہی پر اُس کے چار چفیرے جو سفیدیاں برف کی ہیں.. ڈھلوانوں کی گھاس اور صدرنگ شبہاتیں اور اوپر جو نیلگوں گنبدِ آسمان کا ہے تو وہ اُس پر تصویر ہو رہے ہیں.. وہ کہاں دکھائی دیتی.. آئینہ ہو کر اپنا وجود کھو چکی تھی..

اُسے اپنا وجود پانے اور دکھانے کے لیے سورج کی پہلی کرنوں کا انتظار کرنا تھا.. میں نے دیکھا کہ صرف میں اُس منظر کی یکتائی میں تنہا نہ تھا۔ سلمان اپنا بھاری کیمرہ سینے سے لگائے ڈھلوانوں پر.. جھیل کناروں پر لڑھکتا پھرتا ہے.. قطعی طور پر بیمار نہیں لگتا اور سویر کے سکوت میں آئے ہوئے اس آئینہ منظر کو تصویروں میں قید کرنے کی سعی کر رہا ہے..

تھوڑی ہی دیر میں سویر کی دُھندلی سفیدی کی گھلاوٹ میں سے سورج کی پہلی کرنیں ٹھٹھرتی ہوئی نمودار ہوئیں اور وہ سب سکوت ٹوٹ گیا.. جھیل کی سطح کروٹیں بدلنے لگی.. دکھائی دینے لگی.. جھلملاتی، جگمگاتی پہلی کرنوں کے سنہری پن کو وصول کر کے پانیوں میں ستارے ٹانکنے لگی..

ڈھلوانوں پر بھی دھوپ چھاؤں کا کھیل اُترنے لگا۔ جیسے نوح کے برف پوش پہاڑ آرارات پر ایسی سویر میں اُترتا ہے..

نیم تاریکی میں خوابیدہ برف جو تھی وہ ہلکی دھوپ میں ایک گورے بدن کی مانند انگڑائیاں لینے لگی..

سویر ہو رہی تھی..

پھر وہ مکمل صبح میں بدل گئی..

"قافلۂ اسپ سواراں درکوہستانِ کاغان"

اور سویرے سویرے..گھوڑے ہی گھوڑے..

اتنے گھوڑے ہم کیا کریں گے..چنگیز خان کے منگولین ہو جائیں گے..

وہ دور سے اتنے زیادہ لگتے تھے..

دُودی پت کی رنگینیٔ نو بہار وادی میں سے نمودار ہو کر نالے کو عبور کرتے ہماری خیمہ گاہ کی جانب چلے آتے تھے..

یہ ہمیں یکدم نظر نہ آئے..

ہم نے تو بہت بعد میں اُن کو شناخت کیا لیکن بشیر آنکھیں میچ کر نیچے پچھلی وادی کو دیکھتے ہوئے کہتا تھا کہ صاحب..گھوڑے آ رہے ہیں..

ہم بھی آنکھیں میچ کر اُدھر کو دیکھتے لیکن وادیٔ دودی پت پر پھیلتی سویر کی دُھوپ میں کچھ نظر نہ آتا..پھر کچھ دیر کے بعد شائبہ سا ہوا کہ وہاں گھوڑے سے ہیں...بہت چھوٹے چھوٹے..

پھر وہ بڑے ہوتے گئے اور جب وہ نالہ پار کر کے اُس ٹیلے پر چڑھتے آئے جس پر براجمان ہم اُن کو دیکھتے تھے تو وہ باقاعدہ فل سائز کے گھوڑے ہو گئے..

اس دوران کُوچ کی تیاری ہونے لگی..خیمے سمیٹے جانے لگے اور کچن ٹینٹ زمین بوس ہو گیا..

سلمان جو طلوعِ آفتاب سے کہیں پہلے کی سرمئی ساعتوں میں جھیل کناروں پر تصویریں اُتارنے کے چاؤ میں اچھا بھلا لُوھکتا پھرتا تھا، گھوڑوں کو آتا دیکھ کر بیمار لگنے کی کوشش کرنے لگا..

بہانے بنانے لگا "سرجی سر درد تو کم ہے لیکن ابھی طبیعت بحال نہیں ہوئی..بخار بھی ہے..میرا خیال ہے میں قیصر اور بٹ کے ہمراہ واپس چلا جاتا ہوں..یا نہ جاؤں..آپ بتائیں۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" خان سلیم نے ایک معمولی سی بڑھک لگائی۔ "صبح سویرے ہم تو اپنے خیموں میں ادھ موئے پڑے تھے اور تم جھیل کنارے قلابازیاں لگا رہے تھے دیوسائی کے کسی ریچھ کی طرح..نخرے کرتے ہو، سیدھی طرح چلو ہمارے ساتھ.."

"میں نے سرجی سے پوچھا ہے خان صاحب..آپ سے تو نہیں پوچھا۔"

"سرجی تو خود حواس باختہ ہیں، اُنہوں نے سنا ہی نہیں جو تم نے کہا ہے..اونچا سنتے ہیں..اور اب بھی دیکھ لو، یونہی مسکرائے چلے جا رہے ہیں..کیوں تارڑ صاحب؟"

"کیا کہا.." میں نے ایک کان پر ہتھیلی جما کر کہا۔

"تو بہانے مت بناؤ..کل رات جو ایک غیر جانب دار گھوڑا آرڈر کیا گیا تھا وہ آج صبح جانب دار ہو گیا ہے اور رتی گلی کی جانب جائے گا اور تم اُس پر سوار ہو گے..نہیں سمجھے یا سمجھاؤں تمہیں.."

"خان صاحب دھمکیاں تو نہ دیں..چلتا ہوں آپ کے ساتھ!"

باقی رہ گئے دو بیمار..اُن میں واقعی سکت نہ تھی..اگر ذرہ بھر بھی ہوتی تو وہ ہمارے ساتھ چلتے..انہیں افاقہ نہ ہوا تھا..اُن دونوں کو بہ چشمِ نم گھوڑوں پر بٹھایا گیا..تیسرے گھوڑے پر اُن کا سامان لادا گیا اور پھر ہم نے بھاری دل اور آزردگی سے اُنہیں دیکھا کہ وہ سر جھکائے لاچار اپنے گھوڑوں پر بیٹھے نیچے وادی میں اُترتے ہیں اور بار بار مڑ کر ہمیں دیکھتے ہیں کہ..خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں..

اس جدائی کے بارے میں قطعیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہاں سے جو آگے جا رہے تھے وہ نصیب والے تھے اور جو واپس لوٹ رہے تھے، وہ نصیب کے مارے ہوئے تھے..

نصیب کی تختی کو کوئی نہیں پڑھ سکتا..

اس کی لکھائی تو تبھی سامنے آتی ہے جب جو لکھا ہوتا ہے، وہ پورا ہونے کو ہوتا ہے..

استنبول سے انقرہ جانے والی بس میں سوار دو تین سیاحوں کو زبردستی اُتار دیا گیا تھا کہ اُن کے ٹکٹوں پر اگلے روز کی تاریخ درج تھی اور جب ہماری بس چلی ہے تو وہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہمیں انتہائی حسرت سے دیکھتے تھے کہ یہ جا رہے ہیں اور ہم نہیں جا رہے..لیکن پھر وہی پیچھے رہ جانے والے سیاح خوش نصیب ہو گئے جب ہماری بس آبنائے باسفورس کے پُل کو توڑتی

حادثے کا شکار ہوگئی..

تو کیا پتہ کون خوش بخت رہا ہے.. پیچھے رہ جانے والے یا آگے چلے جانے والے..وہ رخصت ہوئے تو ہم نے گھڑسواری کے لیے کمر کس لی..

کمر کسنے کے مرحلے میں سے میاں صاحب بخوبی گذر گئے کہ اُن کی کمر مزید کسی جاتی تو ایک کی بجائے دو میاں صاحب ہو جاتے.. خان سلیم کو بھی دشواری نہ ہوئی البتہ سلمان اور میں اپنے وسیع گھیر میں بہت دیر تک کمر تلاش کرتے رہے کہ ملے تو کسی جائے.. یہ کمر تو کیا ایسے کمرے تھے کہ انہیں گھیرے میں لینے کے لیے اگر ایک کی بجائے دو آزار بندوں کو گانٹھ بھی دی جائے تب بھی گھیرنے میں کچھ نہ کچھ کسر باقی رہ جاتی تھی..

میاں صاحب ایک پٹوسی مار کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور عینک درست کر کے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے افق کے اُس پار دیکھنے لگے..

اُنہیں ایک ایسی سہولت میسر آ گئی جو ہمارے حصے میں نہ آئی تھی یعنی اُنہیں صرف ایک گھوڑا نہ ملا اُس کے ہمراہ اُس کا ایک ذاتی بچہ بھی ملا جو ایک سیاہ ہرن کی مانند خرمستیاں کرتا تھا بلکہ اسپ مستیاں کرتا پھرتا تھا..

تب ہم نے غور کیا کہ میاں صاحب جس پر سوار ہیں اگر وہ گھوڑا ہے تو اُس کا بچہ کیسے ہو سکتا ہے.. مزید غور کیا تو کھلا کہ وہ گھوڑا نہیں گھوری ہے، تبھی تو بچہ تھا.. یہ نہیں صرف ہم مشرق والے ہی مردانہ فوقیت کے علمبردار ہیں بلکہ مغرب میں بھی ہمیشہ ہارس رائڈر یا ہارس رائڈنگ کی اصطلاح ہی استعمال ہوتی ہے.. کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ کوئی شے میئر رائڈنگ یا گھوڑی سواری بھی ہے..

چنانچہ جن سب کو ہم اب تک گھوڑے کہتے آئے تھے یا سمجھتے آئے تھے اُن میں ظاہر ہے کچھ گھوڑیاں بھی تھیں جن میں سے ایک پر میاں صاحب سوار تھے اور اُن کی گھوڑی کا نگہبان باگ تھام کر آگے آگے چلتا اگر یہ گنگناتا کہ "ویر میرا گھوڑی چڑھیا.." تو کتنا حق بجانب ہوتا۔

خان سلیم کے حصے میں ایک سچ مچ کا گھوڑا آیا تھا.. ہم آگاہ تو نہیں تھے لیکن خان سلیم نے دعویٰ کیا کہ وہ گھوڑوں کے بارے میں وسیع جنسی معلومات رکھتا ہے اور یہ یقیناً ایک گھوڑا ہے..

میرے نام جو جانور الاٹ ہوا تھا میں اُس کی جنس کا تعین نہ کر سکا..اور مجھے اس عمر میں

کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ میں کس صنف پر سوار ہوتا ہوں یا کونسی صنف مجھ پر سوار ہو جاتی ہے کہ دونوں صورتوں میں لاحاصلی ہی مقدر تھی.. میں خود تو اُس پر سوار نہیں ہو سکتا تھا.. پورٹروں نے کرم کیا اور میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے ایک بارہ من کی دھوبن کی مانند اٹھایا اور گھوڑے یا گھوڑی پر بٹھا دیا..

بٹھا تو دیا لیکن ظالموں نے مجھے چھوڑ بھی دیا..اور ساکت کھڑے گھوڑے پر بھی بیلنس قائم رکھنا جان لیوا ثابت ہو رہا تھا. گھوڑا ذرا کپکپاتا تو میں ڈول جاتا..وہ یکدم گردن جھکا کر گھاس کو سونگھتا تو میں بھی پھسلتا ہوا اُس کی گردن کو جپھا مار لیتا..

اُدھر سلمان کے ساتھ ایک المیہ ہو گیا..

اُس کے حصے میں نہ کوئی گھوڑا آیا اور نہ کوئی گھوڑی..ایک فربہ خچر آیا..

سلمان نے احتجاج کیا تو عالمگیر کہنے لگا "صاحب گھوڑا تو چٹانوں پر گر جاتا ہے. پھسل جاتا ہے..اور خچر تو پہاڑوں میں ایسے پاؤں جما کر چلتا ہے جیسے پنجاب میں چلتا ہو..اور یہ کوئی معمولی خچر نہیں ہے. ہمارے سردار اشرف کا خچر ہے اور اس کا قیمت عام گھوڑے سے دوگنا ہے.."

اس اعلیٰ نسل اور بیش قیمت خچر پر سواری کے اعزاز پر نازاں ہونے کی بجائے سلمان نے اپنا احتجاج جاری رکھا اور مجھے گھوڑا چاہیے، مجھے گھوڑا چاہیے کی گردان کرتا رہا۔ اس پر عالمگیر نہایت بدتمیزی سے بولا "صاحب آپ کا وزن بہت ہے، یہ پہاڑی گھوڑا چھوٹا ہوتا ہے، سہار نہیں سکتا.. خچر زیادہ وزن اٹھاتا ہے انشاءاللہ آپ کو اٹھا لے گا.."

چنانچہ سلمان نے کان لپیٹے اور خاموشی سے خچر پر سوار ہو گیا..

"آج..آج" میں ایک مخمور شخص کی مانند ڈولتا بمشکل اپنا بیلنس قائم رکھ رہا تھا "بشیر آج ہم کہاں جائیں گے؟"

"ہم سرال لیک جائیں گے سر."

"کیسے جائیں گے؟"

"ادھر وادی سے بائیں ہاتھ پر بلند ہو کر ہم درّہ سرال کراس کریں گے تو آزاد کشمیر میں داخل ہو جائیں گے..درّے سے نیچے وادی کے دامن میں سرال ہو گی."

"تو پھر بسم اللہ کریں."

حافظ انور نے ہماری فرمائش پر نہایت خوش الحانی سے تلاوت کی اور سفر شروع ہو گیا..

ظاہر ہے سفر شروع کرنے کے لیے میرے گھوڑے کو بھی چلنا تھا... جب سلیم نے جو میرے گھوڑے کا مالک تھا، باگ کھینچ کر ٹخ ٹخ کی آواز نکال کر اُسے سکوت میں سے نکال کر متحرک کیا. گھوڑا چلا تو یکدم آس پاس کے پہاڑوں میں زلزلہ آ گیا.. ہر شے ہلنے لگی.. اور میں بہ نفسِ نفیس اس زلزلے کے منبے پر بیٹھا کہاں ہوا، ایک خلانورد کی مانند بے اختیار اور بے بس ڈولتا ہوا.. میں دل و جان سے سلیم کو روکنا چاہتا تھا لیکن اُسے روکنے کے لیے بولنا پڑتا تھا اور بولتا ہوں تو اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تگ و دو میں خلل پڑتا ہے.. میں قطعی طور پر مبالغہ نہیں کر رہا کہ میں اگر کود سکتا تو کود جاتا اور پیدل چلنے کو ترجیح دیتا..

اُدھر سلیم نے مجال ہے کہ ایک بار بھی پلٹ کر چیک کیا ہو کہ سوار ابھی تک گھوڑے پر موجود بھی ہے یا کسی گھاٹی میں لڑھک چکا ہے اور اگر ہے تو کس حال میں ہے۔ گھوڑا نشیب میں اُترتا تو میں کھسکتا ہوا اُس کی گردن پر گر کر اُس سے لپٹ جاتا.. پھر بلند ہوتا تو میں بے اختیار ہو کر پیچھے گرنے لگتا..

یہ کیسا رخشِ عمر تھا کہ...

حیرت یہ تھی کہ صرف میں تھا جس پر یہ متزلزل قیامت گذر رہی تھی بقیہ سوار چین سے تھے۔ اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے جو کھینچا تانی میں کر رہا تھا، اُس کے نتیجے میں بدن اکڑنے لگا.. پٹھے چڑھنے لگے.. مجھے کامل یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی اُترائی یا چڑھائی پر گر جاؤں گا، اگر نہیں گرا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت تھی ورنہ اس کے سوا اور کوئی وجہ نہ تھی..

ہم اپنی خیمہ گاہ سے نیچے وادی میں اُترنے کی بجائے بائیں ہاتھ پر جو پہاڑی تھی اُس پر آہستہ آہستہ بلند ہوتے چلے جاتے تھے... جب کبھی میں اُدھر کو لڑھکتا جدھر وادئ دودیت بہت نیچے رہ جاتی تھی تو اُس کے اس آسمانی نظارے کا اسیر ہو کر پل بھر کے لیے غافل ہو جاتا اور پھر اگلے دھچکے سے ہراساں ہو کر پھر سے گھوڑے کو لپٹ جاتا۔ کاٹھی کی ناؤ کے اگلے حصے کو میں نے اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ میری ہتھیلیوں میں خون کی گردش تھمنے لگی اور وہ سُوجنے لگیں..

اور پھر وادئ رنگ و بو کی آخری جھلک نظر آئی اور پھر وہ نظر نہ آئی اوجھل ہو گئی..

....اور اُس نظر کو واپس لا کر جب سامنے دیکھا تو ایک چٹانی برفیلی دیوار نظر آئی..

"صاحب اوپر چوٹی کے قریب جو برفیں دکھائی دیتی ہیں اُن میں کچھ سیاہ چٹانیں نظر آتی ہیں ہم اُن کے درمیان میں سے گذر کر اوپر سرال درّے کی ٹاپ پر پہنچیں گے۔" بشیر میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا، یہ میں نے پہلی بار نوٹ کیا..

وہاں اُس آسمانی رفعت میں معلق سیاہ چٹانوں میں ہمیں تو کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا.. شاید گھوڑوں نے اساطیری گھوڑوں کی مانند پر کھول کر ان پر سے پرواز کرتے ہوئے اوپر جانا تھا..

میری ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں.. اپاہج ہو چکی تھیں..

میں ہر دوسرے موڑ سے بلند ہوتے ہوئے سلیم سے گذارش کرتا تھا کہ میری ٹانگوں میں خون کی گردش تھم گئی ہے.. مجھے سہارا دے کر گھوڑے سے اُتارو تا کہ یہ رواں ہو سکے.. اور وہ سُنی اَن سُنی کر دیتا اور میں اُس کو وہ سناتا جو اُس نے کبھی نہیں سنا ہو گا اور وہ گھوڑا روک دیتا. صرف دس بارہ منٹ کی مسلسل سواری سے ہی میری ٹانگیں خشک لکڑیاں ہو جاتیں، بے جان.. لیکن اتنی جان بہر طور باقی رہ جاتی کہ اُن میں جو جو چیونٹے سے درد کے رینگتے تھے، اُنہیں محسوس کر سکوں اور میرا جی چاہتا کہ میں نزدیکی کھائی میں چھلانگ لگا کر اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کر لوں لیکن مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں اپنے آپ کو کاٹھی سے الگ کر کے اپنی یہ خواہش پوری کر سکوں.. چنانچہ میرے ہاؤ ہُو سے تنگ آ کر سلیم گھوڑا روک دیتا..

"اوئے وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو.. اِدھر آؤ.. مجھے گھوڑے سے اُتارو."

میں بچوں کی طرح بانہیں بلند کر دیتا، وہ مجھے تھامتا تو میں ایک سیمنٹ کی بوری کی مانند اُس پر گر جاتا اور وہ غریب بمشکل میرے بوجھ کو سنبھالتا.. میں زمین پر قدم رکھتا تو لگتا جیسے جنت میں آ گیا ہوں.. لیکن ٹانگیں کھڑے ہونے سے انکاری ہو جاتیں.. میں کچھ اُچھل کود کرتا.. رانوں پر مکّے رسید کرتا۔ جب ٹانگوں میں کچھ جان آتی تو دیکھتا کہ یاران تیز گام جو ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں تو پھر سلیم کے کندھوں پر پورا بوجھ ڈال کر گھوڑے پر لد جاتا۔

تھوڑی دیر بعد پھر وہی ہاؤ ہُو شروع ہو جاتی..

خان سلیم کا بھورا گھوڑا اگرچہ نہایت شریف النفس تھا. نفس کے حوالے سے.. لیکن کبھی کبھار جانے اُس کے جی میں کیا آتی کہ وہ پگڈنڈی ترک کر کے بلندی کی جانب تیر ہو جاتا..

اپنے آپ کو کھینچتا زور لگاتا ڈھلوان پر چڑھنے لگتا جو ظاہر ہے ایک خطرناک عمل تھا..سلیم اُسے واپس نیچے راہ راست پر لانے کے لیے گھڑسواری کی اپنی تمام تر ماہرانہ صلاحیتیں بروئے کار لاتا مگر گھوڑے کے لامبے کانوں پر جُوں تک نہ رینگتی اور وہ اوپر چڑھنے میں مشغول رہتا..اس پر سلیم شور مچا دیتا..اوئے اوئے یہ کیا کر رہا ہے..تارڑ صاحب اسے منع کرو..اوئے یہ کیا کر رہا ہے..اوئے گھوڑے تیری میں ماں کو..

مادر اسپ کے بارے میں سلیم جن جذبات کا اظہار کرتا شاید اُن کی وجہ سے گھوڑا ذرا سوبر ہو جاتا اور ٹھنڈا ہو کر پھر سے نیچے آ کر نہایت شرافت سے پگڈنڈی پر چلنے لگتا..لیکن کچھ دیر کے بعد ہی وہ شرافت کا یہ دامن چھوڑ دیتا اور اپنا راستہ ترک کر کے اوپر جانے کی بجائے نیچے کھائی میں اُترتا چلا جاتا اور سلیم پھر نعرے لگانے لگتا، اوئے اب کدھر جا رہا ہے..اسے روکو تارڑ صاحب..اوئے بشیر کہاں ہے..اوئے گھوڑے..اوئے تیری میں ماں کو..

گھوڑا پھر کان لپیٹ کر راہ راست پر آ جاتا..

البتہ میاں صاحب مزے میں تھے..اُن کی گھوڑی اُن سے بہت خوش تھی۔ایک تو اُن کا وزن اُس کاٹھی کے وزن سے بھی کم تھا جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے اُس کا بچھیرا دڑکیاں لگاتا، اچھلتا کودتا اُس کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا..جب کبھی ماں سے اداس ہو جاتا تو اُس کی پچھلی ٹانگوں پر تھوتھنی رگڑ کر خوش ہو جاتا کہ ماں ہے اور پھر اپنی مسرت کے اظہار کے لیے راستے سے الگ ہو کر ذرا اوپر جا کر ہنہنانے لگتا..یہ بچہ ہنہناہٹ بالکل ویسی ہوتی جیسے میرا بچہ سُمیر جو ایک بیوروکریٹ ہو چکا ہے جب اپنی ماں کو دیکھتا ہے تو خوشی سے پورے گھر میں "ایں ہی ہی" کرتے ہنہناتا پھرتا ہے..

سلمان بالکل شانت تھا..

وہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کی خبر پا کر بیت اللحم جانے والا کوئی فربہ راہب تھا..دور سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ ٹٹو کہاں ختم ہوتا ہے اور سلمان کہاں سے شروع ہوتا ہے..البتہ اس خچر یا ٹٹو میں بھی ایک مینوفیکچرنگ فالٹ تھی..یہ اچھا بھلا خوش وخرم ٹٹو چلتے چلتے بغیر کسی وجہ یا وارننگ کے یکدم رُک جاتا اور وہیں اُنہی قدموں پر بلکہ سُموں پر ایک ہی مقام پر کھڑا گھسن گھیریاں کھانے لگتا.. جیسے ایک کتا موج میں ہو تو شغل کے طور پر اپنی ہی دُم کو دبوچنے کے لیے ایک ہی جگہ گھومتا چلا جاتا

ہے..سلمان کا ٹٹو کچھ دیر تک یونہی چکراتا رہتا اور اُس کے ساتھ سلمان کا رنگ فق وہ بھی چکراتا رہتا اور پھر ٹٹو اس عالم اضطراب سے نکل کر معصومیت سے اپنے راستے پر گامزن ہو جاتا۔بشیر بدھا ہماری گھڑسواریوں کے کمالات سے لاتعلق لٹکتا ہوا آگے آگے چلا جاتا تھا اور وہ بھی شکل سے ایسے لگتا تھا جیسے کسی اطالوی راہب خانے کا ایسا راہب ہو جو دراصل راہب نہ ہو بلکہ بھیس بدل کر راہبات کی عصمتوں کے درپے ہو جیسا کہ اطالوی کلاسیک "بوکیشیو" میں آیا ہے..

اور اس قافلہ اسپ سواروں در کوہستان کاغان کے بہت آگے ہمارے سامان سے لدے ہوئے تین گھوڑے اور اُن کے نگہبان چلے جاتے تھے..

پھر مجھے اس دشت تنہائی میں..بلکہ دشت اونچائی میں ایک شناسا سُریلی آواز سنائی دی..

ایک مخصوص شرارت بھری سیٹی کی آواز سنائی دی جو درّہ سرال کی جانب اٹھتی چٹانوں کے دامن میں..کھائی سے پار ہمارے مقابل میں جو ڈھلوانیں تھیں، اُن میں گونجتی ہم تک آتی تھی..

یہ میرے پسندیدہ بلندیوں کے خرگوش..ننھے منے جانور مارموٹ تھے..گھنے بھورے بالوں والے چھوٹے سے ریچھ مارموٹ جن کی سیٹیاں صرف بلندترین برفیلی بلندیوں کی قربت میں ہی گونجتی ہیں..کبھی وادیٔ روپل میں اور کبھی دیوسائی کے بلند میدانوں میں..وہ خنجراب کے نواح میں یا جھیل کرومبر کے کناروں پر..ہمیشہ انہی شرارت بھری سیٹیوں سے میرا استقبال کرتے ہیں کہ یہ ہم جیسا مارموٹ پھر آ گیا ہے..یہ ہماری طرح اپنے پنجوں سے زمین میں ایک سرنگ کھود کر یہیں بسیرا کیوں نہیں کر لیتا..ہماری طرح کیوں نہیں ہو جاتا..آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے تو یہیں گھر کیوں نہیں بنا لیتا..

متعدد مارموٹوں کی سیٹیوں کا آرکسٹرا تھا جو درّہ سرال کے دامن میں گونجتا تھا لیکن بہت غور کرنے، کوشش کرنے کے باوجود پار کی ڈھلوانوں پر میں کسی ایک مارموٹ کو بھی نہ دیکھ سکا۔وہ جانے کہاں تھے..یقیناً سامنے والی ڈھلوانوں پر براجمان ہوں گے..کبھی روپوش ہوتے..کبھی دونوں ٹانگوں پر ایک کنگرو کی طرح کھڑے ہو کر مجھے اور میرے گھوڑے کو تکتے ہوئے..اور کبھی غڑاپ سے اپنے بل میں غائب ہو جاتے ہوئے..

وہ وہاں تھے تو سہی لیکن نظر نہ آتے تھے..

اُن کی موجودگی نے مجھے تقویت دی۔ جیسے سمندر کے سفر کے آغاز میں اگر ڈولفن تمہاری کشتی کے پیچھے پیچھے سیٹیاں بجاتی چلی آئیں تو یہ ایک اچھا شگون ہوتا ہے.. یہ جہاز رانی کی قدیم کتابوں میں آیا ہے.. ایسے ہی بلندیوں کے سفر میں اگر مارموٹ تمہیں دیکھ کر سیٹیاں بجائیں تو یہ بھی ایک اچھا شگون ہے جو میری دریافت ہے، اس لیے صرف میری کتابوں میں آیا ہے..

''چھ گھوڑے، ایک ٹٹو، چار کوہ نورد اور درّہ سرال کی چڑھائی''

پگڈنڈی جس پر چھ گھوڑے.. ایک ٹٹو.. چھ گھوڑوں کے نگہبان.. چار کوہ نورد.. ایک انور باورچی اور ایک بشیر گائڈ چلتے تھے اور بلندی کی جانب چڑھتے تھے۔ وہ پگڈنڈی ایک اونٹ کی گردن کی طرح آسمان کی جانب اٹھنے لگی.. اور ہم کیا کر سکتے تھے.. سوائے یہی کہ ہم سب بھی اٹھنے لگے..

البتہ آج ایک آسانی تھی.. بلندی کی جانب سفر کرتے ہر قدم پر سانس ساتھ چھوڑتا تھا لیکن آج ہم نہ ہونکتے تھے ہمارے گھوڑے ہونکتے تھے.. اُن کے نتھنے آکسیجن کی کمی کے باعث سکڑتے پھیلتے تھے اور اُن کی ہانپتی ہوئی تھوتھنیاں کھلی تھیں جن میں سے سفید سانس برآمد ہوتے تھے.. اُن کے بدن کی رگیں زور لگانے سے پھولتی تھیں اور ہماری ٹانگیں اُن کے پسینے کو محسوس کر سکتی تھیں..

چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اُن کی حالت زار پر ترس کھا کر اُنہیں اپنے بوجھ سے آزاد کر دیتے لیکن آس پاس جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے ہم ڈٹے رہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرتے رہے۔

یکدم پگڈنڈی کا اختتام ہوا اور ویرانہ شروع ہو گیا..

ہم وادئ دودی پت سے اتنے بلند ہوئے کہ راستے میں چٹانیں اور پہاڑ حائل ہو کر اُسے ہم سے اوجھل کر چکے تھے.. اور ہم ان چٹانوں اور بلند پہاڑوں میں گھر چکے تھے.. اور یہیں

پر ایک ویرانہ شروع ہو گیا.. آگے ایک سنگلاخ دنیا تھی.. پتھروں، تودوں اور چھوٹی بڑی چٹانوں سے اَٹی ہوئی اور اُس میں ہمارے گھوڑے ٹھوکریں کھاتے سنبھلتے.. اور ہمیں بھی سنبھالتے.. کبھی پھسلتے تھے اور کبھی تھوتھنی کے آگے ایک چٹان کو پا کر رُک جاتے کہ اب کدھر جانا ہے.. کیا کرنا ہے.. پھر وہ سر جھکا کر زمین کو سونگھتے ہوئے چلنے لگتے.. کبھی ہمیں لگتا کہ وہ ایک چٹان سے جا ٹکرائیں گے اور پھر وہاں اُس کے پہلو میں اتنی سی جگہ ہوتی کہ وہ اپنے پیٹ کو پچکا لیتے اور ہم اپنی ٹانگیں اُس پچکے ہوئے پیٹ پر سکیڑ لیتے اور ایک آدھ خراش وصول کر کے گذر جاتے..

بے شک میری ٹانگیں بھی اکڑ چکی تھیں لیکن میں شکرگزار تھا اس گھوڑے کا جو مجھے اس ناممکن میں سے.. دشوار ترین چٹانی بھول بھلیاں راستے میں سے نکالتا جا رہا تھا.. کہیں گہرائی میں پتھر گرتے تھے اور اُن کی سنگلاخ گونج ہمارے آس پاس مسلسل سنائی دیتی تھی..

نہ خان سلیم کے گھوڑے نے کوئی روگردانی کی.. اور نہ سلمان کے ٹٹو نے کوئی ایک بھی گھسن گھیری پیش کرنے کے بارے میں سوچا.. یہاں تک کہ میاں صاحب کا پچھیرا بھی نہایت سنجیدہ ہو گیا، ایک بار بھی ''ایں ہی ہی'' نہ کیا کہ اُسے بھی مقام کی خطرناکی کا احساس ہو چکا تھا..

ایک پُر ہول دہشت تھی اُس بلندی پر.. جہاں ہم تھے اور ہمارے گھوڑے تھے.. اس بکھرے ہوئے چٹانی تودوں اور پتھروں کے علاقے میں سے گذر کر جب ہم مزید بلند ہوئے اور ایک اونچے کنارے پر نمودار ہوئے تو نشیب میں ایک گلیشیئر دھوپ میں سرد ہو رہا تھا.. درّہ سرال کے عین دامن میں پھیلا ہوا تھا..

میں دیگر شہ سواروں کی نسبت کاہل تھا.. اُن سے پیچھے رہ گیا تھا..

اور میں نے اونچے کنارے پر نمودار ہو کر جب نیچے دیکھا تو میاں صاحب کی گھوڑی نہایت نپے تلے قدم رکھتی.. سنبھلتی.. کبھی یکدم اترائی پر اپنی چاروں ٹانگوں کو بریکیں لگا کر روکتی بالآخر گلیشیئر کے کنارے تک پہنچ گئی تھی.. وہ برف کے پھیلاؤ کو اپنے سامنے پا کر جو درّہ سرال کی جانب اٹھتا تھا رُک گئی کہ اب کیا کرنا ہے تو میاں صاحب اُس کی پشت کو فارغ کر کے نیچے اُتر جاتے ہیں.. یہ نہیں کہ میں اُس اونچے کنارے پر نشیب پر نظر کرتا ایک جامد حالت میں اُن کو تک رہا ہوں بلکہ اس دوران میرا گھوڑا بھی اپنی ٹانگوں کی بریکیں لگاتا.. ایک ایسے عمودی زاویے پر کہ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی خاطر ٹانگیں سیدھی کیے پیچھے ہونے کی کوشش کرتا ہوا کہ مجھے اس حالت

میں پورا گھوڑا نظر نہیں آ رہا.. اور وہ مجھے جھلاتا.. ایک عظیم بے چارگی اور لاچارگی میں مجھے مبتلا کرتا جب کہ میری اکڑی ہوئی ٹانگیں اُس کی پسلیوں میں کُھبی جاتی ہیں.. جیسے میں نہ صرف پیر ہوں بلکہ ایک پیرِ تسمہ پا ہوں.. مجھے نیچے لے جا رہا ہے اور اس حالت میں میں میاں صاحب کو دیکھ رہا ہوں..

دیکھ رہا ہوں کہ وہ گھوڑی سے اُترے.. ذرا آگے ہوئے.. نہایت جاہ و جلال اور ناتواں تمکنت کے ساتھ واکنگ سٹک ٹیکتے گلیشیئر کی برف پر قدم رکھا.. دو چار قدم بے حد بُردباری اور متانت سے چلے اور پھر ایک نہایت پھرتیلی قلابازی لگائی اور برف پر گر گئے.. وہ ہمت ہارنے والے نہ تھے.. برف جھاڑ کر اُٹھے ایک اور قدم اُٹھایا اور اس بار دو قلابازیاں پرفارم کر کے گلیشیئر پر چاروں شانے چت ہو گئے.. اور بہت دیر تک وہیں اُسی چت حالت میں پڑے رہے جیسے سونی لسٹن، محمد علی کا آخری گھونسا وصول کر کے رنگ میں بہت دیر تک پڑا رہا تھا..

ظاہر ہے ان کرتبوں سے میں بے حد محظوظ ہوا..

اس دوران خان سلیم بھی اپنے بھورے گھوڑے کو ٹخ ٹخ کرتا گلیشیئر کے کناروں تک پہنچ چکا تھا.. اور وہ بھی میاں صاحب کی قلابازیوں کے تماشے سے لطف اُٹھاتا دانت نکال رہا تھا..

وہ اپنے گھوڑے سے اُترا.. گلیشیئر پر قدم رکھا اور نہایت شان سے چلتا گیا جب کہ میاں صاحب برف پر مصلوب ہاتھ پھیلائے گلیشیئر پر پڑے تھے تو اُن پر ایک نظر حقارت ڈالتا آسانی سے چلتا گیا.. اور پھر وہ ذرا ہولے ہولے ڈولا، سنبھلا اور پھر ڈول گیا اور پھر یوں پھسلا کہ پھسلتا ہی چلا گیا اور اترائی کی جانب لڑھکتا گیا اور خوفزدہ ہو کر شور مچاتا کہ.. روکو روکو.. تارڑ صاحب روکو.. اوئے گلیشیئر میں تیری ماں کو.. اوئے..

گلیشیئر ایک گھوڑا نہ تھا جو ماں کی گالی کھا کر غیرت کے مارے راہ راست پر آ جاتا..

چنانچہ خان سلیم لڑھکتا چلا گیا.. اپنی پشت پر سکی رنگ کرتا بہت گہرائی میں جہاں گلیشیئر کی آخری حد تھی وہاں تک پھسلتا چلا گیا اور پتھریلے کنارے سے ٹکرا کر ادھ موا سا ہو گیا..

اس دوران میں بھی.. بلکہ میرا گھوڑا اور میں بھی نیچے برف کناروں تک پہنچ گئے..

یہ بہت ہی بچہ گلیشیئر تو نہ تھا.. ذرا سا نابالغ قسم کا مختصر گلیشیئر تھا.. اور میری سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ میاں صاحب ایسے گلیشیئر دیدہ کوہ نورد اس پر کیوں قلابازیاں لگا رہے ہیں اور خان سلیم کیوں اتنا بے اختیار ہو گیا ہے.. یقیناً یہ دونوں لاپروا ہو گئے تھے..

چنانچہ میں نے پروا کی.. اور احتیاط کے ساتھ.. ایک تجربہ کار اطمینان کے ساتھ.. اپنے گھوڑے سے اُتر کر اس پر قدم رکھا..

کوئی مسئلہ نہ تھا.. برف ذرا سخت تھی..

پھونک پھونک کر چند قدم رکھے.. کوئی دشواری نہ تھی.. ان نامعقول دوستوں نے بے پروائی کی تھی.. میں نے پروا کی تھی تو اطمینان سے چل رہا تھا.... پھر اگلے ہی لمحے کچھ ہوا.. زمین یا برف اور آسمان ایک ہوا، میں خلاء میں چلا گیا اور جب کچھ ہوش آیا تو میں بھی میاں صاحب کے برابر میں چاروں شانے چت پڑا تھا اور میری پشت منجمد ہو رہی تھی..

اس دوران خان سلیم گلیشیئر کے کناروں پر چلتا ہمارے پاس آ گیا تھا.. اور وہ بھی اپنی پشت سہلاتا تھا..

طے پایا کہ اگرچہ یہ ایک نابالغ قسم کا مختصر گلیشیئر ہے لیکن اس کی خصلت میں کمینگی بہت ہے.. اس کی برف تلے ایک لوہے کی مانند سخت برفانی تہہ ہے جس پر قدم پڑتا ہے تو ٹھہرتا نہیں اور اُلٹ بازیاں لگنے لگتی ہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس نامراد کو عبور کرنے کا کام گھوڑوں پر چھوڑ دیا جائے یعنی ہم اُن پر سوار ہوں اور پھر چھوڑ دیا جائے..

پھر بھی کچھ زیادہ افاقہ نہ ہوا..

یہ تو نہیں کہ جو برف ہمارے قدموں تلے لوہے کی سختی رکھتی تھی وہ گھوڑوں کا لحاظ کرتے ہوئے نرم ہو جائے..

میرا گھوڑا برف پر چند قدم چلتا اور پھر یکدم ساکت ہو جاتا.. اور پھر اسی ساکت حالت میں اپنے سُموں پر پھسلتا.. بیک ورڈ سکی انگ کرتا نیچے گہرائی میں جانے لگتا..

اور میں اس دوران بُت بنا یوں بیٹھا رہتا جیسے کسی یادگاری چوک کے درمیان کوئی قومی ہیرو ایک گھوڑے پر سوار مجسمہ بنا بیٹھا رہتا ہے..

اور پھر میرا گھوڑا.. جانے کیسے رُک جاتا اور پھر سے برفیلی چڑھائی پر چڑھنے لگتا..

اور ذرا بلندی پر پہنچتا ہے تو پھر پھسلتا ہوا نیچے آنے لگتا ہے..

اس زیروبم میں.. نیچے اوپر کی کشمکش میں تو زندگی بیت جائے گی.. میں گھوڑے سے اُتر آیا..

"میں پیدل گلیشیئر پار کروں گا.. چاہے لاکھ قلابازیاں لگیں۔"

"صاحب آپ گھوڑے پر بیٹھو۔" سلیم گھوڑے والا مسکرا رہا تھا۔ "گھوڑا اب نیچے نہیں جائے گا.."

"کیسے نہیں جائے گا.."

"زگ زیگ جائے گا تو نہیں جائے گا۔ آپ تشریف رکھو۔"

میں پھر سے گھوڑے پر سوار ہو گیا..

سلیم نے باگ پکڑی اور سیدھا اوپر جانے کی بجائے گلیشیئر پر چکرانے لگا.. ساتھ میں مجھے بھی چکرانے لگا..

وہ چند قدم چلتا پھر دائیں جانب رُخ کر کے گلیشیئر کی آخری چٹانوں تک ہموار چلا جاتا اور وہاں سے اباؤٹ ٹرن ہو کر درّہ سرال کے دامن میں جو سنگلاخ دیواریں تھیں وہاں تک جاتا.. اور پھر وہاں سے اباؤٹ ٹرن ہو جاتا..

اگر کوئی طائر بلندی سے ہمیں دیکھتا تو سخت حیران ہوتا کہ گھوڑے پر سوار یہ شخص شاید دیوانہ ہو چکا ہے جو ایک ہی مقام پر چکر کاٹتا چلا جا رہا ہے..

یہ ایک صبر آزما ورزش تھی.. ایک ہی سطح پر.. کبھی اُس کنارے کی جانب اور وہاں سے لوٹ کر واپس اس کنارے تک..

لیکن اس ورزش کے زگ زیگ نتیجے میں ہم دھیرے دھیرے گلیشیئر کے آخری سرے پر پہنچ گئے جہاں سے درّہ سرال کی چوٹی تک عمودی کٹھنائیاں اور بے شمار چٹانیں تھیں..

اوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا..

راستے میں چٹانیں اور بلندیاں تھیں..

سنگلاخ دیواریں تھیں..

ہم سب کے ہانپتے پسینے میں شرابور گھوڑے رُک گئے..

اپنی تھوتھنیوں سے چٹانوں کو سونگھنے لگے..

اوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا..

پھر ہمارے پورٹر فرہاد ہو گئے..اُن کے ہاتھ تیشے ہوئے اور اُنہوں نے پتھروں کو دھکیلا..بڑی بڑی چٹانوں کو دھکے لگا کر گلیشیئر پر لڑھکایا اور ایک راستہ تراشا..

یہ بھی کوئی باقاعدہ قسم کا راستہ تو نہ تھا..بس یہ تھا کہ کہیں کہیں قدم رکھا جا سکتا تھا اور اُس قدم کے بعد کسی پتھر یا چٹان کو پار کر کے پھر ایک اور قدم رکھا جا سکتا تھا..ہمارے گھوڑوں کے سُم ابھی سرد تھے اور برف کے ذرے اُن کی سیاہی سے چمٹے ہوئے تھے..انہی برف آلود سُموں میں سے دو چار قدم بعد چنگاریاں پھوٹنے لگیں کہ زور لگتا تھا..

گھوڑے اس پتھریلی دنیا کی عمودی چڑھائی پر اپنے آپ کو اور ہمیں کھینچتے..ایسے کہ اُن کے بدن کی رگیں ہماری ٹانگوں تلے دھڑکتی اور کھنچاؤ کی دستک دیتی تھیں..پھسلتے سنبھلتے ہمیں درّہ سرال پر اُترتا جو آسمان تھا اُس کے قریب لے گئے..

اس کشاکش کے دوران ایک مختصر سا حادثہ ہو گیا..

سلمان..جب کہ اُس کا ہانپتا ہوا ٹٹو درّہ سرال تک اُٹھتے ہوئے راستے پر اُٹھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اپنے آپ کو اُس پتھریلی بلندی پر قائم رکھنے کی سعی کر رہا تھا تو اُس کے پائے استقلال میں لغزش آ گئی اور سلمان اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور گر گیا..

صد شکر کہ اُس کے دائیں جانب نیچے گلیشیئر میں گرتی جو کھائی تھی وہاں ایک مختصر سی ہموارگی تھی جہاں لڑھکتے ہوئے وہ اٹک گیا..وہاں جا پڑا تو پڑا رہا..مزید نیچے نہیں گیا۔

وہ بہت دیر تک وہاں گرا رہا..پڑا رہا اور پھر سب مدد کو پہنچے اور اُسے تسلی دی..

لیکن اُس کے حواس اس سانحہ کے باعث منتشر ہو رہے تھے اور وہ بار بار ٹٹو کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا کہ یہ ایک واہیات اور دو نمبر قسم کا بیہودہ ٹٹو ہے..باقاعدہ ٹٹو نہیں ہے..بے شک اشرف سردار کا ٹٹو ہے اور اس کی قیمت بقیہ گھوڑوں کی نسبت دوگنی ہے۔اس کے باوجود یہ ایک ٹٹو ہے جو مجھ ایسے نازک اندام کو بھی سہار نہیں سکتا..

سوائے چند معمولی خراشوں کے اُسے کوئی چوٹ نہ لگی تھی..

ہم سب کا خیال تھا کہ ایسا سلمان کے وزن کے باعث ہوا ہے کہ وہ ٹٹو کے ٹھوکر کھانے پر اپنے آپ کو سنبھالنے سے قاصر رہا تھا..

بالآخر ہم چٹانوں کے گھیرے اور خوف سے بلند ہو کر درہ سرال کی چوٹی پر جو آسمان تھا اُس کی نیلاہٹ میں نمودار ہونے لگے..

نہ آس پاس نہ پار نظر کی..اپنے اپنے گھوڑوں سے اُتر کر..بے سُدھ لیٹ گئے..

اپنے حواس کو بحال کرتے رہے..

کھلے اور ہم پر جُھکے آسمان تلے گہرے سانس لیتے رہے..

اور پھر ہمیں احساس ہوا کہ ہم تو پہنچ گئے ہیں لیکن ہمارے سامان کے گھوڑے اور اُن کے رکھوالے کہاں ہیں..

ہمارے سواری کے گھوڑے تو آس پاس اکا دکا تنکوں پر منہ مارتے تھے لیکن سامان کے گھوڑے..وہ نہیں تھے..

قصہ کچھ یوں تھا کہ جہاں گلیشیئر کا اختتام ہوا اور چٹانی چڑھائی کا آغاز ہوا وہاں جب سامان سے لدا ہوا پہلا گھوڑا آگے ہوا تو بوجھ کے باعث لڑکھڑانے لگا..اس کے علاوہ اُس کی پشت پر بندھا جو نیلا ڈرم تھا وہ چٹانوں سے ٹکراتا تھا اور اُسے گراتا تھا..سامان کے ہمراہ اس چڑھائی پر چڑھنا گھوڑوں کے بس میں نہ تھا..اُن کے رکھوالے ذہنی طور پر اس آزمائش کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے سامان کو گھوڑوں پر سے کھولا اور پھر اپنی پشت پر لاد کر اوپر چڑھنے لگے..جہاں خالی ہاتھ ایک گھوڑے کی پشت پر سوار اوپر چڑھنا جان جوکھوں کا کام تھا وہاں تیس چالیس کلو وزنی بوجھ اپنی پشت پر لاد کر اوپر چڑھنا کیسا کام ہوگا..

ظاہر ہے وہ بہت آہستگی سے اوپر آتے تھے۔ جانوروں کی مانند مشقت کرتے کبڑے ہو چکے اوپر آتے تھے جہاں ہم لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے قریب سامان ڈھیر کرتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے..ہم اُن پر ترس کھا سکتے تھے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ ہم اُن کی مدد کر سکتے، نیچے جا کر صرف ایک دیا سلائی کی ایک ڈبیا بھی اوپر لے آتے..

جب کُل سامان چوٹی پر ڈھیر ہو گیا تو وہ پھر نیچے گئے..گھوڑوں کو اوپر لانے کے لیے..

ہم نے دیکھا کہ خالی گھوڑوں کی باگیں کھینچتے وہ جیسے اُنہیں گھسیٹتے چٹانوں اور پتھروں کے درمیان میں سے اُٹھتے..گھوڑوں کے نتھنے چیرتے وہ اوپر ہم تک آ رہے تھے..

وہ اپنے گھوڑوں کو چٹانوں کے بکھراؤ اور عمودی ڈھلوانوں پر کھینچتے ایک بلند درّے تک لا

رہے تھے..

اور یہ ایک نہایت ہی فلمی قسم کا منظر تھا..

اور یہی وہ منظر ہے جو اب تک ایک متحرک جاندار صورت میں میرے ذہن کی سکرین پر چلتا ہے اور مجھے ایک عجیب جادوئی سنسنی سے دوچار کرتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ ہم پونے چودہ ہزار فٹ بلند درّہ سرال کی چوٹی پر براجمان ہیں اور ذرا آگے ہو کر.. ایک قدم آگے ہو کر جھانکتے ہیں.. نیچے نگاہ کرتے ہیں تو گلیشیئر تک اُترنے والی جو چٹانی گذرگاہ ہے.. پتھروں کے انبار ہیں اُن میں تین جفاکش بدن اپنی تمام تر بدنی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے اوپر ہم تک پہنچنے کی سعی کر رہے ہیں اور باگیں کھینچنے سے گھوڑوں کے نتھنے پھولتے ہیں اور چرے جاتے ہیں.. یہ گھوڑے کبھی اس آسمان کو اُٹھتی چڑھائی پر اپنے سُم جما نہیں سکتے اور لڑکھڑا کر کبھی اگلے اور کبھی پچھلے پیروں کو سیدھا کر کے پھر سے سنبھل جاتے ہیں..

اور وہ مسلسل اوپر نہیں چڑھتے..

کبھی کوئی رکھوالا ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو اُس کا گھوڑا رکتا ہے.. اُس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا ہے.. اور کبھی دونوں.. گھوڑا بھی اور رکھوالا بھی اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکتے.. اور لوٹ پوٹ ہوتے گلیشیئر تک چلے جاتے ہیں..

یہ نہیں کہ گھوڑے اوپر آنے سے انکاری ہو رہے تھے..

اُن کی نسل تو پیدا ہی ان گھاٹیوں اور بلندیوں کے لیے ہوئی تھی..

مجھے یقین تھا کہ یہ گھوڑے پنجاب کے میدانوں میں بالکل بیکار ہوں گے.. پہلا قدم اٹھاتے ہی ٹھوکر کھائیں گے اور منہ کے بل جا گریں گے کہ اُن کے قدموں کو عادت ہی اوپر اٹھنے کی ہے لیکن اس کے باوجود یہ بلندی اُن کے بس سے باہر لگتی تھی..

چنانچہ وہ انکاری تو نہ ہوتے تھے..

اس تگ ودو میں اُن کے رکھوالوں کی شدید فکرمندی بھی شامل کر لیجیے کہ اگر اُن کا گھوڑا گرتا ہے.. ڈگمگا کر اپنے آپ کو زخمی کر دیتا ہے یا اُس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے تو اُن کا رزق چھن جاتا ہے.. کُل متاع ہاتھ سے نکل جاتی ہے..

تین انسان.. جُھکے ہوئے۔ پونے چودہ ہزار فٹ بلند درّے کے دامن میں.. اوپر

آتے.. آسمان کی جانب چڑھتے.. پتھروں چٹانوں کو عبور کرتے.. اوپر آتے.. اُن کے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی باگوں میں جو بوجھ تھا اُس کے زور سے اُن کی بند ہتھیلیاں چھلتی خراشیں وصول کرتی ہوئیں.. اور تین باگوں کے آخر میں.. تین اُس لمحے دنیا کے سب سے شاندار اور سنہری شکل والے داستانوی شباہت کے جانور.. جن کی جلد پسینے سے بھیگتی تھی اور اُن کے نتھنے چرنے کو آتے تھے.. اوپر آ رہے تھے..

اور جب وہ چوٹی پر نمودار ہوئے.. پہلے اُن کے جھکے ہوئے رکھوالے اور پھر وہ تین گھوڑے اوپر پہنچے تو ہم سب نے باری باری پہلے گھوڑوں کو تھپکی دی، اپنی ہتھیلیاں اُن کے گرم پسینے سے گیلی کیں اور پھر پورٹروں کے کندھے پکڑ کر اُنہیں شاباش دی..

''چلیں صاحب..'' اُن میں سے ایک نے اپنے آپ کو سیدھا کر کے مجھ سے کہا..

''یار ابھی ان گھوڑوں کو سانس تو لینے دو.. اپنے آپ کو بحال کرو۔ پھر چلیں گے۔''

''صاحب ادھر اوپر آ گیا ہے ناں!.. تو آگے نیچے جانا ہے.. آگے سانس ہی سانس ہے.. سیر سپاٹا ہے.. دشواری نہیں.. چلتے ہیں۔''

اُنہوں نے آرام کیے بغیر چوٹی پر ڈھیر سامان کو پھر سے گھوڑوں میں تقسیم کیا اور اُسے رسّوں سے باندھ کر مستحکم کرنے لگے..

''سرال ٹاپ پر آنسو جھیل..ہم آنسو بہاتے ہیں''

جب سامان لادا جا رہا تھا تو ہم درّے کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد پہلی بار کمر سیدھی کرتے ہوئے اپنی حالت استراحت میں سے اُٹھے اور پہلی بار آس پاس نگاہ کی..

پہلے تو صرف شکر گزاری تھی کہ چوٹی پر پہنچ گئے، اِدھر اُدھر نگاہ کرنے کی نہ سکت تھی اور نہ خواہش..

تو جہاں ہم استراحت فرماتے تھے وہیں ہمارے پہلو میں ذرا نیچے ایک چپکی سی مختصر سی گلیشیئر جھیل بھی استراحت فرماتی تھی..

اُس کی جانب دھیان نہ گیا..

دھیان نہ گیا تو قدرے پشیمانی بھی ہوئی کہ دس بارہ قدم کی اترائی پر ایک مُنّی بیگم جھیل ہیں اور ہم نے دھیان نہ دیا..

یہ آنسو جھیل تھی..

ہمارے کاغانی مہاتما بدھ بشیر نے ٹریک کی تفصیل بتاتے ہوئے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ ہم کسی آنسو جھیل پر بھی اُتریں گے.. اور ہم فی الفور اس رومانوی نام کے اسیر ہو گئے..

آنسو جھیل..ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں میں سے کوئی ایک آنسو جو نامعلوم بلندیوں پر جھیل ہو گیا تھا..

ہم نے عالم تصور میں اس کے کیسے کیسے رُوپ دیکھے تھے..

مجھے اپنی ایک ''چھوٹی سی بات'' یاد آ جاتی کہ ''ندی کے پانی اور آنکھ کے پانی میں صرف جذبات کا فرق ہوتا ہے۔''

تو یہ کیسی جذباتی جھیل ہو گی جو سراسر ایک آنسو ہے..

اب اسے سامنے پایا تو اُس کے پہلو میں اپنی مایوسی کو بھی پایا کہ بلندی کی برفوں میں سے قطرہ قطرہ رسنے والے پانی ایک نشیب میں جمع تھے..

قلیل اور مختصر تھے اور نہایت سرد اور غیر جذباتی تھے..

بے شک ایک آنسو مختصر ہوتا ہے لیکن اتنا سرد تو نہیں ہوتا..

تو یہ آنسو جھیل ہی کیوں کہلائی؟

صرف اس لیے کہ جہاں اس کے پانی برفوں میں سے ٹپکتے تھے وہاں یہ دو چار ہاتھ کی تھی اور پھر چوڑی ہو کر پھیل جاتی تھی جیسے آنکھ سے بہنے والا آنسو رخساروں پر پھیل جاتا ہے..

اسے دیکھ کر اپنے تخیل پر خاصا ظلم کرنا پڑتا تھا اور تب جا کر یہ ایک آنسو کی شکل میں بمشکل دکھائی دیتی تھی..

تو ہم اس نتیجے پر نہایت آسانی سے پہنچے کہ کوہ نورد اس آنسو جھیل کے عشق میں مدہوش..منزلیں مارتے..مشقتیں سہتے..پونے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر آکسیجن سے خالی ہوا میں منہ کھولے..ہانپتے..زبانیں لٹکائے جب یہاں پہنچ کر اسے اپنی نظروں کے سامنے پاتے ہیں تو اسے دیکھ کر آنسو بہانے لگتے ہیں..کہ یہ جھیل ہے..یہ آنسو جھیل ہے؟

ویسے درہ سرال کی چوٹی میں روپوش یہ جھیل اتنی بُری بھی نہ تھی..اگر اس کا کوئی نام نہ ہوتا تو اُسے یکدم قدموں میں بچھا دیکھ کر اس پر نچھاور ہو جاتے..کہ کیا گمنام اور غیر متوقع پوشیدہ پانیوں کا جزیرہ ہے..

اس کا نام نہ ہوتا تو ہم اس کی قدر کرتے..

نام نے اُسے بے قدر کر دیا تھا..

میاں صاحب اپنی گھوڑی اس کے کناروں تک لے گئے اور کہنے لگے..''کس نامہ نیم نے اس کا نام آنسو جھیل رکھا ہے..لو جی ہمیں بیوقوف بناتے ہیں۔''

ہمارے سامان بردار گھوڑوں پر سامان..بردار ہو گیا۔ اور ہم اپنے اپنے ذاتی گھوڑوں پر بردار ہو گئے اور نیچے اُتر کر آنسو جھیل کے کناروں تک آئے اور پھر اُس سے جدا ہو کر ہمارے گھوڑے ایک سرسبز ٹیلے پر چڑھے تو پھر ہمارے سامنے..سامنے تو نہیں کہ ہم بہت بلندی پر تھے..نشیب میں حیران سحر کا ایک منظر کھُلا..

ایک وسیع منظر کھُلا..

''جھیل سرال.. گنبدِ افلاک تلے ایک پگھلا ہوا نیلم''

آنسو جھیل سے ذرا آگے ہوئے تو درّہ سرال کے دوسری جانب جو منظر منتظر تھا وہ کھلا..
نہ صرف منظر بلکہ حیرت اور تشکر اور مسرت کے مارے ہمارے منہ بھی کھل گئے..

ہم نے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں..

ہم اس علاقے میں سب سے بلند سطح پر فائز تھے اور ہم ایک پرندے کی مانند اُس پر نظر کرتے تھے.. اُس وادی سرال کو جو ہمارے بہت نیچے پھیلتی تھی اور اُس کے کناروں پر جو پہاڑ برفوں سے ڈھکے اُس کی حفاظت پر مامور تھے.. اور اُن میں صرف دو ایسے درے تھے جو گویا اس وادی میں داخل ہونے کے دروازے تھے اور وہی ان بلند دروازوں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا جو سکت رکھتا تھا دیوانگی رکھتا تھا.. اُن کے سوا اس وادی میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ نہ تھا.. یہ اپنے تنہا حسن کے فریب میں قید تھی.. برفبار بلندیوں کی فصلیں اس کی تنہائی کی حفاظت کرتی تھیں..

ہم گھوڑوں سے اُتر گئے.. ابھی سوار ہوئے اور ابھی اُتر گئے.. اس لیے کہ محض قدموں میں بچھے پہاڑوں میں بند ایک وادی ہی نہ تھی اُس کے درمیان میں.. اُس کے سرسبز پیراہن میں ایک نیلا آنسو تھا..

ایک پگھلا ہوا نیلم تھا..

سرال جھیل تھی..

گلگت کی جانب پرواز کرتے ہوئے جیسے فوکر فرینڈشپ طیارے کے کاک پٹ سے جھیل سیف الملوک بھی ایک نیلا آنسو نظر آتی ہے.. ایسے..

اوپر آسمان کا گنبد تھا.. اُس کے تلے جھیل کا نیلگوں آنسو تھا اور ان کے درمیان میں

برف کی سفید ریکھائیں اُترتی تھیں..

وہ جو گنبدِ افلاک تھا تو ملتان کی نیلی ٹائلوں کی رنگت کا تھا اور اُس کے نیچے وادی کی آغوش میں جو جھیل تھی وہ ہالہ کی نیلی ٹائلوں کی نیلاہٹ میں بھیگی ہوئی تھی..

درّہ سرال کاغان اور آزاد کشمیر کو جدا کرتا تھا..

اب ہم نے آزاد کشمیر میں اُترنا تھا لیکن ابھی ہم کہاں اُترنے والے تھے.. ہم نے اس علاقے کی بہت تحقیر کی تھی۔ شمال کے چودھری کے مقابلے میں اسے کمین جانا تھا اور محض اس پر ترس کھا کر ادھر آ گئے تھے کہ چلو اسے بھی نواز دیں۔ اس تکبر کی اب ہمیں پے در پے سزا دی جا رہی تھی.. ہمیں شرمندہ کیا جا رہا تھا کہ اُس کی تخلیق کردہ کسی بھی شے کو یا منظر کو حقیر جانو گے تو پشیمان ہو گے..

ہم پر متعدد وار ہو چکے تھے..

جھیل لُولُوسر کے لگائے ہوئے زخم بھی اگرچہ بہت کاری تھے لیکن دودی پت کی وادی رُنگ و بو نے بھی ہمیں گھائل کر دیا.. اور جب اس کی جھیل پر پہنچے تو اُس نے بھی اپنے الوہی حسن کے تیروں سے ہمیں چھلنی کر دیا.. ہم سنبھلے نہ تھے، ابھی ہمارے زخم بھرے نہ تھے کہ یہاں جھیل سرال نمودار ہو گئی اور یوں ہوئی کہ ہم بے موت مارے گئے.. اس ناگہانی موت نے البتہ ہم پر یہ کرم کیا کہ ہماری آنکھیں زندہ رہنے دیں تاکہ ہم جھیل سرال کو دیکھتے رہیں..

درّہ سرال سے جھیل سرال جیسے دکھائی دیتی ہے، کم از کم میرے لیے اس کوہ نوردی کا سب سے بڑا تحیّر تھا..

اس وادی میں گھرے نیلگوں سحر نے ہم پر ایسا جادو کیا کہ ہم آگے جانے سے انکاری ہو گئے.. گھوڑوں سے اُتر کر سفید پتھروں میں سے نمودار ہوتی گھاس پر لیٹ گئے اور یوں دراز ہو جانے سے وہ نیلا آنسو گھاس اور زرد پھولوں کی اوٹ میں مکمل طور پر نہ ہوا.. ہوا کے چلنے سے گھاس سرسراتی تو اُس کی چلمن میں سے جھیل سرال جھانکنے لگتی.. کبھی زرد پھولوں کے درمیان میں سے جھاتیاں مارتی..

گھوڑوں والے ہمارے بے دام غلام نہیں، دام والے غلام تھے۔ اس لیے وہ بھی رُک گئے لیکن اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ابھی ہم نے رختِ سفر باندھا تھا اور ابھی کھول دیا ہے۔ محض اس

لیے کہ پونے چودہ ہزار فٹ کی بلندی سے نشیب میں پھیلی وادی کے درمیان ایک جھیل نظر آ گئی ہے.. چونکہ وہ غلام تھے ہمارے حکم کے تابع تھے، اس لیے دم نہ مار سکتے تھے، وہ بھی ادھر اُدھر لیٹ گئے..

وادی کے دامن تک.. یہاں درے سے نیچے جو ڈھلوان اُترتی جاتی تھی اُس کا سارا بدن زرد تھا..

جیسے وہ ملک چین کی ایک شہزادی ہو جس کے بدن کی رنگت بھی زرد ہو اور اُس کا پیراہن بھی پیلا ہو.. وہ پیراہن اُتار بھی دے تو شائبہ نہ ہو کہ وہ برہنہ ہے کہ اُس کے نیچے جو بدن ہے وہ بھی زرد ہے.. یہ ایک ایسی پھولوں سے ڈھکی ڈھلوان تھی..

اور جہاں یہ ڈھلوان وادی میں اُتر کر اختتام کو پہنچ رہی تھی وہاں نشیب میں ایک ندی تھی.. ندی کے پار کچھ اور ہرے بھرے ٹیلے تھے اور اُن سے پرے سرال کا نیلگوں آنسو وادی کے سرسبز رخساروں پر آ کر ٹھہر گیا تھا..

''بشیر..'' میں نے کاغانی بدھ مہاراج کو طلب کر لیا جو اس منظر سے لاتعلق کہ وہ اسے کئی بار مجبوراً دیکھ چکا تھا.. ایک سفید پتھر سے ٹیک لگائے ڈھلتی دھوپ سینک رہا تھا اور دانتوں میں خلال کر رہا تھا.. اور اس کے ساتھ اپنی پی کیپ آنکھوں کے آگے جھکائے شاید اونگھ بھی رہا تھا ''بشیر.. ہم نیچے نہیں جائیں گے.. رات ادھر کریں گے.. میرا خیمہ یہاں نصب ہو گا اور اُس کا رُخ تم خوب جانتے ہو کہ کدھر ہو گا..''

اگر وہ اونگھ رہا تھا تو فوراً ہوشیار ہو گیا۔ خلال کرنا موقوف کیا اور کہنے لگا ''صاحب ادھر بہت ہائٹ ہے۔ پونے چودہ ہزار فٹ پر جب رات ہوتی ہے تو گھوڑے بھی مشکل سے سانس لیتے ہیں.. آپ کے دو ساتھی ہائٹ کا شکار ہو کر واپس جا چکے ہیں.. سلمان صاحب بھی ذرا ڈاؤن ہیں تو یہ خطرہ مول نہ لیں..''

''اچھا..'' میں نے صرف اتنا کہا۔

اُس نے میری مایوسی بھانپ لی.. ''تارڑ صاحب نیچے سرال کے کنارے پر کیمپ کرو گے تو ادھر کو بھول جاؤ گے.. ادھر رات بہت مشکل ہے.. ہم ایک دو گھنٹوں میں دن کی روشنی میں جھیل تک پہنچ جائیں گے.. چلیں؟''

''تم کہتے ہو تو چلیں۔''

درہ سرال کی چوٹی پر اگر ہم رات گذارتے تو وہ اتنی جان لیوا ہرگز نہ ہوتی جتنی اذیت ناک وہ زرد بدن اُترائی تھی جس پر ہم اُترے تھے اور وہ سہمے سہمے اُترتی نہ تھی گرتی تھی اور ساتھ میں ہمیں بھی گراتی تھی.. اور میرا گھوڑا پھر سے میری نظروں کے سامنے نہ تھا.. دکھائی نہ دیتا تھا.. بے شک سلیم کے ہاتھ میں اُس کی باگ تھی اور وہ آگے آگے چلتا تھا لیکن گھوڑا اُترائی پر ایسا گرا گرا گرتا تھا کہ میں اپنا وجود سنبھال نہ سکتا تھا..

میرے وزن کے ساتھ اور اس کے ہمراہ جو عمر رسیدگی تھی اُس کے ساتھ اگر میں صرف ایک بار گھوڑے سے لڑھک جاتا تھا تو پھر یقیناً وادیٔ سرال کی جانب نہیں وادیٔ فنا کی جانب ہی لڑھکتا تھا.. میں آسانی سے اپنی گردن کا منکا تڑوا سکتا تھا اور اس سے کہیں زیادہ آسائش کے ساتھ بازو یا ٹانگیں دولخت کروا سکتا تھا.. لیکن یہ تو کوہ نوردی کے کھیل کے متوقع اور ممکن نتائج تھے.. اصل میں میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں.. اپنے آپ کو قائم رکھنے کی کوشش میں میری کمر اکڑ چکی تھی اور بالآخر میں ضبط نہ کر سکا۔ ''سلیم.. مجھے اتار دو۔''

اُس نے اتار دیا..

یونہی اُتار نہیں دیا.. اُس نے مجھے سہارا دیا، میں اُس پر گندم کی ایک بوری کی طرح گرا.. اُسے گرایا.. پھر کہیں جا کر اترا..

''میں پیدل چلوں گا..''

''جی صاحب.. چلو۔''

''اب کبھی اس گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گا..''

''نہ بیٹھو صاحب۔''

''تم بے شک مجھے چھوڑ کر نیچے پہنچو.. میں خود پہنچ جاؤں گا۔''

''جی صاحب..'' اُس ناہنجار نے میرا حکم نہ مانا اور میرے ساتھ ہی رہا..

صاحب کی پتھر ہو چکی ٹانگوں میں کچھ جان آئی تو صاحب اپنے قدموں پر نیچے اُترنے لگا.. چند قدم ہی اُترا تو سانس پھولنے لگی.. یہاں تک بھی خیر تھی لیکن پھر گھٹنے جل ترنگ بجانے لگے.. آپس میں بھڑنے لگے.. تاتھئی تاتھئی کرنے لگے اور پھر میرا وزن سنبھالنے سے انکاری

ہونے کو تھی کہ میں نے فریاد کر دی۔ ''سلیم.. میں گھوڑے پر سوار ہوں گا۔''

''جی صاحب.. سوار ہو جاؤ۔''

''تم مجھے اٹھا کر اس پر سوار کرو گے تب سوار ہوں گا.. خود سے کیسے ہو سکتا ہوں۔'' اُس نیک رُوح نے پھر مجھے سہارا دیا اور گھوڑے پر لا دیا..

اور تھوڑی دیر بعد.. شاید دو تین منٹ کی اُترائی کے بعد ''سلیم میں گھوڑے سے اُترتا ہوں۔''

''کیوں صاحب؟''

''مجھ میں سکت نہیں کہ اپنے آپ کو سنبھال سکوں.. یار اتنی اُترائی ہے کہ مجھے تو اس کے کان بھی نظر نہیں آتے..''

''کان دیکھ کر کیا کرو گے صاحب؟''

چنانچہ وہ ایک مرتبہ پھر مجھے سہارا دے کر خود بھی اور مجھے بھی زمین بوس کر دیتا ہے..

اور ہاں.. یہ صرف میں تھا جو اس کشمکشِ مرگ و حیات میں مبتلا تھا.. میرے ساتھی نہایت اعلیٰ سکون میں گم نہایت آسانی سے نہ صرف اس زرد پھولوں والی ڈھلوان سے اُتر چکے تھے بلکہ نشیب میں جو ندی تھی، اُس کے پار جا رہے تھے..

اور تب سلیم نے تنگ آ کر وہی گلیشیئر کو عبور کرنے والا آزمودہ نسخہ پیش کیا ''صاحب اب آپ دل پر پتھر رکھ کر گھوڑے پر بیٹھے رہو.. میں آپ کو نیچے لے جاتا ہوں'' اور اُس نے گھوڑے کی باگیں تھام کر براہ راست نیچے اُترنے کی بجائے وہی زگ زیگ سفر شروع کر دیا..

دائیں جانب چلتے ہو تو چلتے جاؤ..

پھر پلٹ آؤ.. اور بائیں جانب چلتے جاؤ..

اس نسخہ میں قدرے آسانی محسوس ہوئی..

اور اس اُترائی کے زگ زیگ سفر کے دوران دائیں جانب، بہت دور.. دُوری کی دُھند میں سے جھانکتی پہاڑوں میں پوشیدہ ایک نہایت خواب ناک جھیل نظر آئی جو ہمارے نقشوں میں نہ تھی.... یونہی بلا خواہش بن بلائے بلند پہاڑوں کی دُھند میں سے نمودار ہوگئی... کسی نے بھی اس کا تذکرہ نہ کیا تھا. لیکن اس کی کشش اور نیلاہٹ کا کوئی جواب نہ تھا..

''یہ کونسی جھیل ہے بشیر؟''

''پتہ نہیں صاحب.. بس جھیل ہے۔''

میں اس زگ زیگ سفر سے بھی تنگ آ جاتا ہوں..

گھوڑے سے اُتر جاتا ہوں یا اُتارا جاتا ہوں تو ڈھلوان کے زرد پھولوں میں بے شک گھٹنوں تک ڈوب جاتا ہوں.. لیکن یہ ڈھلوان ایسی ہے کہ اس پر ڈھلکا تو جا سکتا ہے اُترا نہیں جا سکتا..

پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں.. اور قدم ہے کہ اُترائی پر اترتا ہے، بے شک زرد پھولوں میں اُترتا ہے لیکن میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا. لڑکھڑا کر گرنے لگتا ہوں..

بے شک یہاں سے وادی سرال کے درمیان میں.. اُس کے ہرے بھرے بدن کی ناف میں جھیل کا ہیرا پیوست ہے اور یہ منظر مجھے مدہوش کرتا ہے لیکن میں پھر دوہائی دیتا ہوں ''سلیم..''

اب جب کہ میرے ساتھی وادی کے دامن تک پہنچ چکے تھے اور میں ڈولتا گرتا پڑتا اس زرد سیج سے اُترتا جاتا تھا..

وہ جھیل جس کا کوئی نام نہیں بس جھیل ہے.. اب بھی دُھند بھرے پہاڑوں میں سے سندیسے بھیجتی ہے کہ مجھے جی بھر کے دیکھ لو.. جن کا نام ہوتا ہے، پتہ ہوتا ہے اُن تک تو دوبارہ پہنچنے کا امکان ہوتا ہے لیکن جو بے نام اور بے پتہ ہوں وہ تو یونہی اتفاقاً نظر آ جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاتے ہیں تو مجھے جی بھر کے دیکھ لو..

مَیں اگر اُس جھیل کو کوئی نام دیتا.. تو کیا دیتا..

کوئی خوابناک اور دُھند آلود نام تو ہرگز نہ دیتا.. اُسے ایک حرافہ جھیل کہتا کیونکہ ایک حرافہ کا کوئی نام نہیں ہوتا، کوئی پتہ نہیں ہوتا اور وہ یونہی اتفاق سے کسی فٹ پاتھ پر یا کسی کلب میں مل جاتی ہے.. بس چند لمحوں کی رفیق ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتی ہے..

حرافہ اس لیے بھی کہ اُس نے مجھے.. ہرجائی کر دیا تھا.. میں جو اچھا بھلا جھیل سرال سے بیاہا ہوا تھا اُس کے عشق میں مبتلا اُس کی جانب سفر کرتا تھا.. یکدم ہرجائی ہو گیا تھا، اُسے چھوڑ کر اس حرافہ کی جانب چلا جانا چاہتا تھا..

یہ طے ہے کہ اگر میں تنہا ہوتا..تو فوری طور پر اپنا کعبہ تبدیل کر لیتا..سرال سے بے رُخی کر کے اُس بے نام جھیل کے ساتھ رات گذارنے کے لیے چلا جاتا..

''بشیر..اس بے نام جھیل کی جانب کوئی جاتا ہے؟''

اُس نے جھیل کے کنوار پن کی تصدیق کی..یعنی عجیب حرافہ تھی کہ اب تک کنواری تھی''صاحب اِدھر کوئی نہیں آتا تو اُدھر کون جائے گا۔''

''اگر اُدھر جانا ہو تو کس راستے سے جایا جاسکتا ہے؟''

''جھیل دُودی پت کے سامنے جو گلیشیئر ہیں اُنہیں عبور کر کے..شاید اس جھیل تک پہنچا جاسکتا ہے لیکن میں کبھی نہیں گیا.شاید مقامی لوگوں کے سوا کوئی بھی نہیں گیا..''

''سلیم ہم اُدھر چلیں؟''

سلیم مجھ سے فل بیزار ہو چکا تھا''مسخری کرتا ہے صاحب..سب لوگ نیچے وادی تک پہنچ گیا ہے اور آپ اتنا بوڑھا اور موٹا ہے کہ ہم کو چکر پہ چکر لگواتا جاتا ہے..مجھے بھی اور گھوڑا کو بھی..تو اُدھر کیسے جاسکتا ہے..''میں نے ایک مسخرے کی مانند ایک پُر مزاح مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر سلیم کی تائید کی کہ میں مسخری کرتا تھا..

کہیں گھوڑے نے ایک پتھر کی اوٹ کو پار کیا تو وہ نامعلوم جھیل یکدم اوجھل ہو گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں..میں پھر باوفا ہو گیا، اُس نے ساتھ جو چھوڑ دیا تھا اور اپنی بیاہتا کا تائب ہو کر پھر سے اُسے تکنے لگا.جھیل سرال کو..اور آخر میں بھی اور میرا گھوڑا بھی اور باگ تھام کر آگے چلنے والا سلیم بھی وادی تک اُتر ہی گئے...اور درہ سرال ہم پر سایہ کرنے لگا کہ وہ بہت بلند تھا اور ہم بہت نشیب میں تھے اور اگر ہم اس جانب سے اس پر چڑھنے کے لیے آتے تو اس آسمان کو چھوتے درے کو دیکھ کر گھر لوٹ جاتے..

دامن میں وہ ندی بہتی تھی..ندی کے پار ایک ٹیلا تھا..میں اور میرا دلبر جانی گھوڑا جب ایک پھولوں بھرے قدم آدم بُوٹوں کے دامن میں پہنچے تو وہاں میرے ساتھی ایک مدت سے میری آمد کے منتظر تھے..

اُن کے گھوڑے کبھی پھول اور کبھی گھاس چرتے تھے اور کبھی ندی میں تھوتھنیاں بھگو کر سرد پانی سُر کتے تھے..

دائیں جانب ذرا اونچائی پر کچھ پتھریلے گھر تھے..ویران لگتے تھے اور اُن سے پرے ایک چار دیواری دکھائی دیتی تھی جو کہ وادئ سرال کا واحد چائے خانہ تھا اور ہمارے دو پورٹر چائے کے حصول کے لیے وہاں تک جا چکے تھے..

میں نے بھی اونگھنا مناسب جانا کہ منزل مادور نیست..یہیں کہیں آس پاس ہے تو ذرا آرام کر لیا جائے اور قدم آدم گھاس میں لیٹ کر اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں اور حیرت زدہ آنکھوں کو آرام دینے لگا..

''صاحب..''بشیر جو اپنی اونگھ مکمل کر چکا تھا میرے قریب آ بیٹھا.''یہ جو اوپر آپ کو کچھ پہاڑی گھر نظر آتے ہیں تو یہ اس علاقے کے ممبر پارلیمنٹ کے گھر ہیں..وادی سرال کے نمائندے ہیں..''

''کاغان کی کوئی الگ پارلیمنٹ ہے بشیر؟''میں اونگھ میں تھا..

''صاحب ہم کاغان میں نہیں کشمیر میں ہیں..''

''سوری یار..''

''تو یہ ممبر پارلیمنٹ کے گھر ہیں..''

''اُن سے ملیں؟''

''نہیں وہ اب یہاں نہیں رہتے..صرف ووٹ مانگنے کے لیے آتے ہیں..رہتے مظفر آباد میں ہیں۔اپنی نئی بیوی کے ساتھ ایک شاندار بنگلے میں..''تب بشیر نے مجھے ایک دلچسپ کتھا سنائی..

''صاحب ادھر سرال کا جو ممبر پارلیمنٹ ہے..ایم پی اے..تو بہت ہی پرہیزگار اور خدا ترس شخص ہے۔آپ تو خیر اتنے بوڑھے نہیں ہیں، وہ خاصا بوڑھا ہے تو اِدھر وادیوں میں رواج ہے کہ وہ عوامی نمائندے کی حیثیت سے لوگوں کے مسائل حل کرتا ہے، اُن کے کام کرتا ہے..سفارشیں کرتا ہے۔چنانچہ ایک روز ایک نہایت الہڑ دوشیزہ دوہائی دیتی ہوئی اُس کی کچہری میں آئی کہ بابا میری مدد کرو۔میرے ماں باپ مجھے ایک نکمے اور بیمار شخص کے ساتھ زبردستی بیاہنا چاہتے ہیں اور میں اُس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو آپ مدد کرو۔میں فریاد کرتی ہوں۔اس پر خدا ترس ایم پی اے نے اُس پر بہت ترس کھایا اور دریافت کیا کہ اگر تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کس کے ساتھ کرنا چاہتی ہو..دوشیزہ نے شرما کر اقرار کیا کہ بابا میں صرف اُس بیکار بندے سے

شادی نہیں کرنا چاہتی، میری اور کوئی پسند نہیں۔ اُس کے سوا کسی بھی شخص سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ تو ایم پی نے مزید ترس کھایا اور کہنے لگا تم میری ووٹر ہو، میں تمہارا خیال رکھوں گا اور یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دوں گا بلکہ تم اتنی حسین ہو کہ میں تمہاری شادی اپنے ہی خاندان میں کر دوں گا.. کیا منظور ہے؟.. دوشیزہ نے فوراً کہا، باباجی منظور ہے.. باباجی کے متعدد پوتے وغیرہ بھی سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے، اس لیے دوشیزہ شانت ہو گئی.. اور جب اگلے ہفتے دوشیزہ کے گھر بارات گئی تو دولہا میاں باباجی خود تھے.. دوشیزہ کیا کرتی، اُنہیں قبول کر لیا اور اب وہ دونوں ہنسی خوشی مظفر آباد میں رہتے ہیں اور اُن کے عمر رسیدہ بیٹے اور پہلی بیگم اس پتھریلے گھر میں رہتے ہیں..''

اس رومانوی قصے نے کم از کم مجھے تو بے حد تقویت دی کہ مایوس ہونے کی چنداں حاجت نہیں، بابا لوگ کا اب بھی چانس ہے..

میں ایک اور میری کچہری میں فریاد کرتی دوشیزہ کے ممکنات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے یکدم احساس ہوا کہ میں بلند دروں میں گھری ہوئی ایک وادی کے نشیب میں اونگھتا ہوں.. گھوڑے چرتے ہیں.. ساتھی بھی اونگھتے ہیں تو جھیل کہاں ہے..

''سرال جھیل کہاں ہے بشیر؟''

''اس ٹیلے کے پار.. دوسری جانب۔''

''ہے؟''

''ہاں ہے..''

سرال ہوٹل کی پتھریلی چار دیواری میں سے ہمارے دو پورٹر چائے کے برتن سنبھالتے اُترتے آتے تھے..

چائے کے بعد ہم نے اپنے آپ کو فُل بیدار کیا۔ گھوڑوں نے اپنی تھوتھنیاں گھاس اور پھولوں پر سے اُٹھائیں اور اُن پر سامان لاد دیا گیا.. پھر ہم بھی اپنے اپنے گھوڑوں گھوڑیوں اور خچروں پر لد گئے اور ندی کے پار ہوئے.. ایک پھولوں سے پاگل ہوتے ٹیلے پر.. نچڑتی سبز گھاس کے ٹیلے پر بلند ہوئے تو سامنے ایک جھیل تھی..

''جھیل سرال کے پانی.. اُمڈ کر میرے گھوڑے کے قدموں میں آ گئے..''

پر یہ سرال نہ تھی..

سرال اس جھیل سے پرے جو بلندی دھوپ میں روشن ہو رہی تھی اُس کے پار تھی..

یہ جھیل گویا ایک ٹریلر تھی..

ہم سنبھلتے نیچے ڈھلوان پر اُترتے گئے اور ٹریلر جھیل کے کناروں تک آ گئے..

اور یہ جھیل.. آنسو جھیل سے کہیں بڑھ کر شکل والی تھی۔ آس پاس نیلی چٹانیں تھیں جو اُس کے پانیوں میں جھانکتی تھیں.. جھیل کے اختتام پر جو ایک مختصر سا ٹیلہ تھا اُس پر ہم نے گھوڑوں کو ایڑھ لگائی اور دو چار لمحوں میں اوپر پہنچ گئے.. سر اُٹھایا تو سرال جھیل اُمڈ کر ہمارے گھوڑوں تک آ گئی..

ہم اُس کے پانیوں سے نچڑنے لگے..

بھیگ گئے..

ہم سے زیادہ وہ بے تاب تھی۔ وصل کی خواہش مند تھی کہ اُس کے چاہنے والے اتنے دور کے شہروں سے.. ان پہاڑوں میں دربدر ہوتے.. اُس کی چاہت میں بیمار ہوتے.. بلند درے اور برفانی بلندیاں عبور کر کے اُسے ملنے کی خاطر آ رہے تھے.. وہ ایک مدت سے تنہا تھی اور ہم ایک شب کے لیے اُس کے پانیوں پر وصل کی دستک دینے والے آ گئے تھے..

سرال بہت وسیع تھی..

درّے سے نظر آنے والا ایک نیلگوں آنسو نہ تھی ایک روپوش سمندر تھی..اتنی بڑی تھی..
اور تنہا تھی..

اور وہ محض ایک آبی جزیرہ نہ تھی..بلکہ اُس کی نیلاہٹ پر سفید راج ہنس تیرتے تھے..

آس پاس کے پہاڑوں سے اُترنے والے گلیشیئرز میں سے دھوپ کی گرمی سے پگھل کر جدا ہو جانے والے اور اس کے پانیوں میں گر جانے والے بڑے بڑے برف کے تودے تیرتے تھے..سطح آب کو بامعنی بناتے تھے اُس کے خالی پن کو اپنے حسن سے بھرتے تھے..

میں نے زندگی میں صرف ایک بار سینتالیس برس پیشتر کسی خیال میں یا کسی خواب میں رتی گلی کی ایک جھیل میں ایسے راج ہنس تیرتے دیکھے تھے لیکن بہت دور سے..ایک طویل فاصلے سے انہیں دیکھا تھا..دیکھا تھا یا یہ محض ایک واہمہ تھا..میری قوت متخیلہ کا کرشمہ تھا..

لیکن یہ راج ہنس تو میرے گھوڑے کے قدموں تلے جو پانی تھے، اُن میں تیرتے تھے..یہ حقیقت تھے..خواب وخیال نہ تھے..

برف کے ان تیرتے تودوں کو اگرچہ میں راج ہنسوں کی صورت میں دیکھ رہا تھا لیکن ان کی شکلیں اور بناوٹیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں..ان برفانی کشتیوں کی صورتیں الگ الگ تھیں.. یہاں تک پہنچ جانے والے ہر کوہ نورد کو ان کی صورتیں اپنے اپنے تجربوں اور تخیل کے مطابق نظر آ سکتی تھیں..

کسی کو وہ سرد بدن محبوبہ نظر آ سکتی تھی..

کوئی اور یہ خیال کر سکتا تھا کہ سکاچ وہسکی میں اگر اس برف کی گھلاوٹ ہو تو لطف آ جائے..

ایک ہندو اُن میں کرشن کی گورے بدن کی گوپیاں دیکھ سکتا تھا..
ایک یہودی کو وہ حضرت سلیمان کا عظیم معبد دکھائی دے سکتی تھیں..
اور کسی کے لیے وہ محض برف تھی جو یونہی بیکار تیرتی پھرتی تھی..
مجھے اُن میں جو کچھ نظر آیا وہ میں بیان کرتا ہوں..

کوئی ایک سنجیدہ سا تودہ تیرتا..مجسمہ ساز ہنری مُور کے سوچ میں ڈوبے ہوئے انسان کی مانند اپنے آپ میں غرق تھا..پھر بھی تیرتا تھا..

پانیوں میں تیرتے اور اُن کی نیلاہٹ میں اُبھرتے ایک وجود پر گمان ہوتا تھا کہ وہ سفید سنگ مرمر سے تراشا ہوا مائیکل اینجلو کا ''پائتا'' ہے..برف سے تراشا ہوا ایک عیسےٰ جو صلیب سے اُتارے جانے کے بعد بی بی مریم کی گود میں بے جان ہے اور وہ اپنے بیٹے کی موت پر ماتم کر رہی ہیں۔بی بی مریم بھی برف سفید..

ایک اور سفید برف کا ٹکڑا.جھیل سرال کے سینے پر آلتی پالتی مارے اطمینان اور شانتی سے..اپنے گیان دھیان میں گُم ہم سے بے خبر ہو بہو ایک ''فاسٹنگ بُدھا'' تھا..

کسی بھی بُدھ کے لیے..کہ بُدھ بہت سے تھے جن میں سے صرف ایک مہاتما ہوا..
جھیل سرال کی الوہی تنہائی اور خاموشی سے بڑھ کر کونسا مقام ہوگا جہاں وہ دنیا جہان سے الگ ہو سکے..

ایک ایسا تو وہ بھی سطح آب پر تیرتا تھا جس کی شکل ایک گُنبد کی سی تھی..اگر اُس کی سفیدی پر سبز رنگ پینٹ کر دیا جاتا تو اُس کے تلے میرے حضور خوابیدہ ہوتے..

میں اور میرا گھوڑا ٹیلے سے نیچے اُترنے لگے..
جھیل کے کناروں تک اُترنے لگے..

اور تب میں نے دیکھا کہ ان سب سے جُدا ایک اور برفانی تودہ ہے ہنری مُور کے مجسمے..مائیکل اینجلو کے ''پائتا''..''فاسٹنگ بدھا'' اور سفید گنبد جو مجھے سبز دکھائی دیتا تھا ان سے الگ ایک اور مختصر سا تودہ بھی ہے جو بے مقصد اور آوارہ تیرتا پھرتا ہے..جو نہیں جانتا کہ اُس کی منزل کیا ہے..اُس نے کس کنارے پر جا لگنا ہے..کہاں قیام کرنا ہے..

وہ محض اپنی بے مقصد آوارگی پر خوش تھا..

جانتا تھا کہ عمر کی دھوپ اُسے بالآخر پگھلا دے گی اور وہ اس وسیع جھیل کے پانیوں میں پانی ہو جائے گا اور باقی نہ رہے گا..

پھر بھی وہ خوش تھا کہ وہ زمانے کی سیر کر رہا تھا.جھیل سرال کے پانیوں پر سیر کر رہا تھا..

ایسا بے سمت اور بے مقصد برف کا تودہ سوائے میرے اور کون ہو سکتا تھا..تو میں وہاں پہنچا تو مجھ سے پہلے میں وہاں بھی موجود تھا..

''سرال کنارے گروچو مارکس سے ملاقات''

ابھی کچھ دُھوپ تھی..

سرال کے تقریباً اَن چھوئے کنوارے کناروں پر ہماری خیمہ بستی کے گنبد سر اُٹھانے لگے..

ہم مکمل طور پر تنہا نہ تھے..ایک کتا تھا جو مسلسل بھونکتا تھا..

ہمارے خیموں سے پرے بلندی پر جھیل کناروں سے اونچائی پر کچھ چرواہوں کے عارضی گھر تھے جہاں سے ایک نظر نہ آنے والا کتا لگاتار بھونک رہا تھا اور جھیل کے آسمانی سکون اور خاموشی کو غارت کر رہا تھا..

ہم اُسے کیا دوش دیتے..جانے کتنی مدت کے بعد اُسے اجنبیوں پر بھونکنے کا موقع نصیب ہوا تھا..

لیڈر کے احترام میں..بلکہ میری بزرگی کے احترام میں سب سے پہلے میرا خیمہ ایستادہ کیا گیا تھا..

میں اُس کی عافیت میں رینگتا ہوا داخل ہوا..اور آسانی سے داخل نہ ہوا کہ میری ٹانگیں گُھڑسواری کے کرتبوں کے باعث لکڑی ہو چکی تھیں اور وہ بھی شیشم کی لکڑی کی جس میں لچک نام کو نہیں ہوتی..

اور کیا یہ بیان کرنے کی حاجت ہے کہ میرے خیمے کا پردہ سرال پر کھلتا تھا..

چونکہ میں لکڑی کا ہو چکا تھا اور تھکن اُتارنے کے لیے آرام سے لیٹ جانا ممکن نہ تھا اس لیے میں بیٹھا رہا اور پردے کے پار جھیل کو اور اُس بے مقصد آوارہ تودے کو تکتا رہا..میرے

خیمے اور جھیل کے کناروں کے درمیان سرد گھاس کا ایک علاقہ تھا..

اور تب جھیل کے اور میری نظر کے درمیان اُس سرد گھاس کے ٹکڑے میں سے یکدم گروچو مارکس نمودار ہوا اور مجھے تکنے لگا..اپنے دونوں ہاتھ سینے پر جما کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا کہ اوئے تم کون ہو؟ میں اُس سے پوچھ سکتا تھا کہ بھائی میاں میں جو کوئی بھی ہوں..پہلے تم اپنا تعارف کرواؤ کہ تم کون ہو..لیکن میں چپ رہا..کہ وہ جو کوئی بھی تھا جھیل سرال کے کناروں پر مدتوں سے مقیم تھا..شاید یہیں پیدا ہوا تھا اور یہیں بالآخر مرنا تھا اور میں تو پل دو پل کا مہمان تھا..ایک تماشائی تھا جس نے اگلی سویر کوچ کر جانا تھا اس لیے وہ حق بجانب تھا یہ پوچھنے میں کہ..تم کون ہو؟..

وہ میری طرح عمر رسیدہ اور تھکا ہوا تھا..

اُس کی سنہری مونچھیں ڈھلکی ہوئی تھیں اور اُس کی بائیں آنکھ کا پپوٹا ڈھلک کر اُس پر گرا ہوا تھا..موشے دیان کے سیاہ پیچ کی طرح..وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہایت متانت اور وقار سے کھڑا تھا اور مجھے اپنی ایک کھلی آنکھ سے یوں دیکھے جا رہا تھا جیسے ایک بچہ چڑیا گھر میں پہلی بار ایک بندر کو دیکھتا ہے..

گروچو مارکس دراصل ایک بوڑھا مارموٹ تھا جو شاید جھیل سرال کے کناروں پر رہنے والا واحد مارموٹ تھا..اور اُسے عادت نہ تھی کہ عین اُس کے گھر کے سامنے کوئی اور گھر بنا لے جو میں نے بنا لیا تھا..اسی لیے وہ ایک آنکھ بند کیے مونچھیں متحرک کرتا میرا جائزہ لے رہا تھا کہ یہ جو بھی ہے اور شکل سے کچھ کچھ میرے ایسا ہی لگ رہا ہے تو یہ یہاں کیوں آیا ہے..اگر آ گیا ہے تو کیا یہیں رہنے کے لیے آیا ہے اور میری تنہائی اور میری جھیل کو غارت کرے گا یا کل سویرے چلا جائے گا..

میں بھی اُسے اُسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس دلچسپی سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا..یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس مارموٹ کی کوئی مارموٹی نہ ہو..میں نے سوچا..ہو گی کبھی جو اُسے داغ مفارقت دے چکی تھی اور اب وہ یہاں رنڈوا رہتا تھا..تنہا رہ گیا تھا..پھر اُس نے متعدد سیٹیاں بجا کر وہاں میری موجودگی کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

اُس کی سیٹی سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں جب وہ ایسی ہی مترنم سیٹی بجاتا ہو گا تو جھیل سرال کے آس پاس جتنی بھی مارموٹیاں اپنی بلوں میں انگڑائیاں لیتی ہوں گی وہ بے تاب ہو

کر باہر آ جاتی ہوں گی اور اُس پر نچھاور ہو جاتی ہوں گی..

شاید اُس کے اتنے بوڑھے ہو جانے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ مارموٹیوں کی تشفی کرتے کرتے اس حال کو پہنچ گیا تھا..

تھکن مجھے پتھر کرتی تھی لیکن پھر بھی مجھ میں کسی مارموٹ جتنا ہی تجسس تھا کہ اس گروچو مارکس کو ذرا قریب سے دیکھا جائے، اُس سے معذرت کر لی جائے کہ سوری سَر میں آپ کی تنہائی میں مُخل ہوا، بس شب بھر کی اجازت مرحمت فرما دیں، کل سویرے چلا جاؤں گا.. میں بہت آہستگی سے خیمے سے باہر آیا.. جھک کر ابھی پہلا قدم ہی اُس کی جانب اُٹھایا تھا تو موصوف اپنی مونچھوں اور ایک آنکھ پر لٹکتی جھالر سمیت غڑاپ سے اپنے بل میں غائب ہو گئے..

بل کے باہر اُس مٹی کا ڈھیر تھا جسے گروچو فرصت کے اوقات میں کریدتا رہتا تھا.. ایک چوڑا سوراخ اُس کے بل کی نشاندہی کرتا تھا.. میں نے جھک کر نہایت پیار سے پکارا ''گروچو''.. لیکن وہ مجھ پہ بھروسہ کرنے والا مارموٹ نہ تھا اور میں تو اُسے صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس کی ڈھلکی ہوئی مونچھوں سے متاثر ہو کر میں نے اُسے مشہور کامیڈین گروچو مارکس کا نام دیا تھا جو اسی نوعیت کی گھنی اور گرتی ہوئی مونچھوں کا مالک تھا..

جونہی میں خیمے میں واپس آ کر لیٹا تو وہ پھر سے نمودار ہو گیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر اُسی حالت میں ایستادہ ہو گیا..

جھیل سرال کے کناروں پر قیام کے دوران گروچو نے ہمہ وقت مجھ پر کڑی نظر رکھی کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے.. لوٹا پکڑ کر کہاں جا رہا ہے.. کس طرف جا رہا ہے.. مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی ڈائری میں میری تمام حرکتوں کا اندراج کرتا تھا..

سرال جھیل نے ہمیں اپنا قیدی بنا لیا تھا..

تین بلند ترین دروں کو اگر کوئی عبور کر کے آئے تو سرال تک آئے اور اگر جائے تو کسی ایک درے پر چڑھ کر ہی پار جائے تو جو آتا تھا وہ بلند دروں میں قید ہو جاتا تھا..

چنانچہ ہم بھی گھیرے میں آئے ہوئے تھے.. قید ہو چکے تھے اور اس قید پر خوش تھے اور ہمیں یہاں سے فرار ہو جانے کی کوئی خواہش نہ تھی..

اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ گروچو اپنی گردن گھما کر کسی اور جانب دیکھ رہا ہے تو میں نے ایک مرتبہ پھر اُس کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن بابا مارموٹ قطعی طور پر مجھ پر اعتبار نہ کرتا تھا فوراً ہوشیار ہو گیا اور ایک استہزائی سیٹی بجا کر روپوش ہو گیا..

ہمارے پورٹر اور گھوڑوں والے جانتے تھے کہ ہم سرال تک پہنچیں گے تو ''ٹری لائن'' سے بلند ہو جائیں گے جہاں نہ کوئی شجر نمودار ہوتا ہے اور نہ کوئی جھاڑی زندہ رہتی ہے۔ اس لیے بلندیوں کے یہ شناسا سفر کے دوران خشک ٹہنیاں اور لکڑیاں جمع کرتے آتے تھے..

اور ان سوکھی ٹہنیوں اور راستے میں جمع کیے گئے اُپلوں سے.. جب رات ہوئی پہلی دھوپ جواب دے گئی جیسے کار کی بیٹری یکدم ڈاؤن ہو جاتی ہے.. تو شام کو رات نے ٹھہرنے کا موقع ہی نہ دیا اور تاریکی ہو گئی.. تو پورٹروں نے ایک الاؤ روشن کر دیا..

"جھیل کی سٹیج پر "سوان لیک" بیلے پرفارم ہوتا ہے"

سرال مکمل طور پر اندھیاری ہو گئی.. سیاہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہم سب بھی رات کے گھیرے میں آ گئے اور پھر ہمارے چہرے الاؤ کی روشنی کی زد میں آ کر جھلملانے لگے.. اسی الاؤ کے گرد شدید ٹھنڈک کی برفیلی کرچیوں سے بچاؤ ہوتا تھا.. ہم نے رات کا کھانا آگ کی قربت میں بیٹھ کر کھایا.. میں اس دوران جب کبھی اپنے خیمے کی جانب نظر کرتا.. تو اُس سے کچھ فاصلے پر مجھے گروچو مارکس ایستادہ ڈیوٹی پر متعین نظر آ جاتا.. وہ الاؤ سے دور تھا اس لیے کبھی اُس کی مونچھیں نظر آ جاتیں اور کبھی اُس کی آنکھ پر ڈھلکی جھالر.. ہماری خواہش تو یہی تھی کہ ہم تادیر الاؤ کے گرد بیٹھے آج کے سفر کے دوران جو خطرناکیاں اور خوبصورتیاں درپیش ہوئیں اُن کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے لیکن یہ ممکن نہ تھا..

الاؤ کی ٹہنیاں جوں جوں بھڑک کر پھر سلگ سلگ کر راکھ ہوتی گئیں توں توں پونے چودہ ہزار فٹ کی بلندی ہماری رگوں میں اُتر کر انہیں منجمد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ ہم بے اختیار ٹھٹھرنے لگے..

ہم نے اپنے اپنے خیموں کی عافیت میں اور سلیپنگ بیگوں کی گرمی میں پناہ لینا ہی مناسب جانا..

الاؤ ٹھنڈا ہو گیا اور اُس میں ایک چنگاری بھی نہ بچی تو منتظر تاریکی اُتر آئی..

مجھے تھکن کے باعث نیند نہیں آ رہی تھی..

سلیپنگ بیگ کو اوڑھ کر میں خیمے کے کھلے پردے کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا..

الاؤ تاریک ہوا تو احساس ہوا کہ سرال کے عین اوپر ایک زرد چاند بھی جانے کب سے

الاؤ کی روشنی کو کوس رہا تھا کہ یہ گُل ہو تو میں بھی نمایاں ہوں، نیچے اُتروں..

وہ شتابی سے نہیں دھیرے دھیرے اُترا.. سرال کے پانیوں میں اُترنا چاہتا تھا لیکن جھجک گیا اور اُن کے اوپر ٹھہر گیا.. اُس کی ماہتابی میں.. سرد اور قدیم زیوروں ایسی سنہری زردی میں.. سرال کے پانیوں پر آہستگی سے کچھ سفید راج ہنس تیرتے دکھائی دے رہے تھے.. رقص کر رہے تھے.. وہ بہت ہولے ہولے اُس زرد چاندنی میں حرکت کرتے تھے..

بہت برس پہلے میں نے ماسکو کے مشہور زمانہ بالشوئی تھیٹر کی سٹیج پر "سوان لیک" یعنی "راج ہنسوں کی جھیل" نامی کلاسیکی آپرا دیکھا تھا جس کی موسیقی اگر مجھے یاد ہے تو موسیقار چائے کوسکی کی ترتیب شدہ تھی..

وہاں ایسی کومل سفید سفید رقاصائیں تھیں جن کے پیراہن بھی دودھ سفید تھے اور اُن کے پاؤں نرماہٹ سے بھرے ایسے تھے کہ وہ سٹیج پر ٹھہرتے نہ تھے.. گھیرے دار سفید لباسوں میں یہ بیلے رقاصائیں فضا میں تیرتی تھیں.. یقین نہ آتا تھا کہ یہ لڑکیاں ہیں جو ایک بلبلے کی آہستگی سے اٹھتی ہیں.. ایک آوارہ پَر کی مانند ہلکورے لیتی ہیں.. یقیناً راج ہنس ہیں.. اُن کے رقص نے اور پس منظر موسیقی نے پورے ہال کو یوں مسحور کیا کہ جب آپرا کا اختتام ہوا تو بہت دیر تک تماشائی چپ بیٹھے رہے..

تب میں جانتا تھا کہ میں زندگی میں پہلی اور آخری بار "سوان لیک" دیکھ رہا ہوں..

لیکن میں کیا جانتا تھا؟..

کچھ بھی نہیں..

زندگی میں کچھ بھی آخری بار نہیں ہوتا..

میرے خیمے سے پرے چاند کی زردی میں نہائی جھیل ایک سٹیج تھی جس پر ایک مرتبہ پھر "سوان لیک" پرفارم ہو رہا تھا..

رقاصائیں.. وہ برفیلے آوارہ تودے تھے جو جھیل سرال کی سطح پر ہولے ہولے حرکت کرتے.. رقص کرتے تھے.. پانیوں پر اتنی نزاکت سے پاؤں رکھتے تھے کہ ڈوبتے نہ تھے.. ڈولتے تھے اور تیرتے تھے..

بالشوئی تھیٹر میں اُس رات.. نظروں کو خیرہ کر دینے والے چمکتے دمکتے کلاسیکی ہال میں بیٹھے ہوئے تب میں قیاس بھی نہ کر سکتا تھا کہ آج سے تقریباً نصف صدی بعد چیچنیا کی "سیاہ بیوائیں"

آئیں گی، اپنے اُجڑے ہوئے بدنوں پر بارود سجائے اور اپنے آپ کو فنا کر دیں گی اپنے وطن کی خاطر..

اور تب میں یہ بھی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہوگا کہ نہ تو بالشوئی تھیٹر کے سنہری ڈلکتے بام و در ہوں گے اور نہ ہی یہ ہزاروں تماشائی ہوں گے صرف میں ہوں گا.. تنہا.. بلند درّوں کی قید میں اور میرے سامنے ''راج ہنسوں کی جھیل'' کا آپرا پھر سے پرفارم کیا جا رہا ہوگا.. نام کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کہ یہ ''راج ہنسوں کی جھیل سرال'' کا آپرا ہوگا..

سرال کی مہتاب گزیدہ شب میں یہ میرا واہمہ تھا کہ صرف میں ہوں.. تنہا ہوں جو جھیل کے پانیوں پر تیرتی برف کی رقاصاؤں کو دیکھ رہا ہوں.. کہ وہاں میرے علاوہ گروچو مارکس بھی تماشائی تھا لیکن وہ سٹیج کو نہیں صرف مجھے دیکھتا تھا کہ یہ کیسا جانور ہے جو ابھی تک سویا نہیں.. میری جھیل پر تیرتے برف کے تودوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا چلا جاتا ہے.. سوتا کیوں نہیں.. پھر وہ بھی مجھ سے لاتعلق ہو کر آپرا دیکھنے لگا..

گروچو ایک کائیاں مارموٹ تھا.. بہت سیانا تھا۔ وہ جھیل کی جانب مسلسل نہ دیکھتا تھا بلکہ یکدم گردن گھما کر مجھے بھی دیکھنے لگتا کہ کہیں یہ شخص میرے انہماک سے فائدہ اُٹھا کر اپنے خیمے سے نکل کر دبے پاؤں مجھے دبوچنے کے لیے تو نہیں آ رہا..

میں نے ہنری مور کے مجسمے.. فاسٹنگ بدھا.. پائتا اور سفید گنبد کے تودوں کے درمیان اُس آوارہ گرد، بے وجہ تیرتے.. ڈگمگاتے.. بے مقصد حیات کرتے تودے کو اپنا آپ جانا تھا لیکن اب میں اپنے آپ کو گروچو کی شخصیت کے زیادہ قریب پاتا تھا.. اُسی کی طرح بوڑھا ہوتا ہوا.. تنہائی پسند.. اور اُس سفید سحر میں گرفتار جو جھیل سرال کی نیلاہٹ پر ایک بجھی ہوئی چاندنی میں تیرتا تھا.. یقیناً گروچو کے بھی چھوٹے چھوٹے مارموٹ بچے ہوں گے جو بڑے ہو گئے اور اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ بابا کیوں اس جھیل کے کناروں کو ترک کر کے کسی وادیٔ رُوپل یا درّہ خنجراب کی جدید بستیوں میں نہیں جاتا.. اور گروچو کی بیگم بھی اُس سے ناخوش رہتی ہوگی..

تبھی تو وہ میرا دھیان رکھتا تھا کہ یہ مجھ جیسا ہے.. میں اس کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتا ہوں..

کیا پتہ کہ وہ ایک تارڑ تھا..

اور میں ایک مارموٹ..

اس کا فیصلہ اور کوئی نہیں کر سکتا.. کوئی بلند درّوں کو پار کر کے جھیل سرال تک پہنچے گا تو فیصلہ کرے گا..

جھیل سرال کی یہ شب عجیب شب تھی..

عجیب اس لیے کہ بلند درّوں میں گھری ہوئی جھیل سرال پر بچھتی چاندرات میں اگر اُس کے پانیوں پر سفید راج ہنس رقص کرتے ہوں.. برف کی بیلے رینائیں تیرتی ہوں تو ایسی ہی راتوں میں لوگ حواس کھو بیٹھتے ہیں اور ایک عمر رسیدہ مارموٹ کو اپنا آپ اور اپنے آپ کو ایک مارموٹ سمجھنے لگتے ہیں..

یہ ایسی ہی رات تھی..

اور رات بھر چاندنی نے مجھے بے آرام کیا..

بے شک وہ بجھی ہوئی تھی.. آخری زردی میں بجھی ہوئی تھی لیکن میرا خیمہ اُس کی زرد دُھند میں روشن رہا.. اتنا روشن کہ میں برہنہ محسوس کرتا تھا.. اتنی چاندنی تھی..

لیکن خاموشی نہ تھی..

سناٹا ٹوٹ جاتا تھا..

یکدم بکھر جاتا تھا..

نہ صرف چاندنی بے آرام کرتی تھی بلکہ سکوت بھی ایسا نہ تھا کہ میں اطمینان سے نیند میں غافل ہو جاتا کہ رات میں جھیل پر جھکے ہوئے گلیشیئر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکتے.. وہ ٹوٹتے تھے اور اُن سے جدا ہونے والے برفانی تودے دھڑام سے جھیل میں گر کر سناٹے میں شگاف ڈالتے تھے اور سکوت کو اپنی پانی میں گرنے والی مہیب آواز سے توڑتے تھے..

ان کے ٹوٹنے کی صدا سنائی نہ دیتی تھی لیکن جب وہ جھیل میں گرتے تھے تو ایک گہری گونج میرے خیمے کے اندر دندناتی ہوئی آتی میرے کانوں میں دیر تک لرزتی رہتی تھی.. یہ ایسی ہی رات تھی..

دن کی تیز دھوپ میں جھیل میں تیرتے برف کے راج ہنس پگھلتے رہتے تھے..

اُن کی جگہ لینے کے لیے یہ نئے راج ہنس تخلیق ہو رہے تھے..

جھیل کو کبھی بھی راج ہنسوں سے خالی نہیں رہنا چاہیے..

''خداحافظ سرال اور ڈارلنگ گروچو''

شب بھر یہ ڈوبتی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر تھکن نے مجھ پر غلبہ پالیا اور پھر میں عارضی موت کی اُس جھیل میں اُتر گیا جسے نیند کہتے ہیں..

جانے کب تک میں اس جھیل میں غرق رہا اور تب مجھے اس کی سطح پر سے میرے کانوں میں اُترتی ایک صدا آئی جو میرا نام پکارتی تھی.. میں نے مُندی ہوئی آنکھیں جن کے پپوٹے اُٹھتے نہ تھے کھولنے کی سعی کی تو سامنے گروچو مارکس تھا.. مسکراتا ہوا میرے خیمے کے پردے میں سے جھانک رہا تھا، اُس نے اپنی مونچھیں ترشوائی تھیں اور بالوں کو خوب تیل چُپڑ کر سنوار رکھا تھا..

''تارڑ صاحب'' گروچو تراشی ہوئی مونچھیں پھڑکاتا نہایت ہی پُر مسرت موڈ میں تھا ''آپ اپنے پراٹھے کے ساتھ کیا کھائیں گے.. فرائی انڈہ یا جیم؟''

کمال ہے.. گروچو مجھے ناشتے کے لیے مدعو کر رہا تھا.. وہی گروچو جو اپنے بِل کے دہانے پر کھڑا مجھے تکتا تھا اور میرے قدموں کی آہٹ سن کر غڑاپ سے غائب ہو جاتا تھا اب اتنا دلیر ہو گیا تھا میرے خیمے میں جھانک رہا تھا اور مجھے ناشتے کی دعوت دے رہا تھا.. اور یہ بھی کیسا حسین اتفاق ہے کہ گروچو پراٹھے بھی بناتا ہے اور اپنے بِل میں گیس کے چولہے کے بغیر انڈے بھی فرائی کرتا ہے.. ویسے یہ گروچو اگر اچھا باورچی ہوا تو میں فی الفور حافظ انور کو فارغ کر کے اسے مُہم کا باورچی مقرر کر دوں گا اور یہ کیسا ورلڈ ریکارڈ ہو گا کہ کاغانی اور کشمیری دور افتادہ اور پوشیدہ جھیلوں کی تارڑ مُہم پہلی ایسی مُہم ہو گی جس کا باورچی ایک مارموٹ ہو گا.. کمال ہے..

''تارڑ صاحب..'' اُس نے پھر قدرے توقف کے بعد کہا.. ''آپ خاموش کیوں ہیں.. فرائی انڈہ یا جیم؟''

اور اُس لمحے میں اپنے حواس میں آ گیا.. نیند کے غلبے سے نکل کر بیدار ہو گیا اور مجھے احساس ہوا کہ خیمے کے پردے میں سے جھانکنے والا سر گروچو کا نہ تھا.. بشیر کا تھا.. اور اس مغالطے میں جو ذرا جان بوجھ کر بھی تصور کیا گیا تھا میرا کچھ زیادہ دوش بھی نہ تھا.. کہ ان دونوں میں خاصی مماثلت پائی جاتی تھی.. خاص طور پر مونچھیں اور چہرے کی معصومیت.. اس صبح کے بعد آئندہ دنوں کے سفر کے دوران میں جب کبھی بشیر کی جانب نگاہ کرتا تو وہ مجھے گروچو نظر آنے لگتا اور میں بہت شرمندہ ہوتا..

''ہاں جی بشیر صاحب.. آج کا ایکشن پلین کیا ہے۔'' پراٹھے کے ہمراہ میں نے ظاہر ہے فرائی انڈہ ہی پسند کیا۔

''سَر آج ابھی ادھر سے نکلیں گے تو آگے جائیں گے.. وہ دیکھئے جھیل کے بلند کناروں پر جو ڈھلوان ہے اُس میں جو راستہ ہے.. دکھائی دے رہا ہے ناں؟''

میں نے بائیں جانب جھیل کناروں سے سیدھی آسمان کو اُٹھتی چٹانوں کو نہایت غور سے دیکھا تو وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیا.. لیکن میں نے کہہ دیا کہ ہاں جی صاف دکھائی دے رہا ہے..

''تو اُس پر چلتے ہوئے..''

''ہیں؟ آج ہم پیدل چلیں گے یعنی اپنی ٹانگوں پر..؟'' مجھے پہلے ہی شک تھا کہ اتنی بلند ڈھلوانوں کے کناروں پر گھوڑے تو چلنے سے رہے..

''نہیں سر.. گھوڑوں پر چلتے ہوئے جھیل کے پار جو گلیشیئر بلند ہو رہے ہیں، اُن تک پہنچیں گے.. اُنہیں کراس کر کے تھوڑا چڑھائی ہو گا اور ہم درہ نُوری ناڑ کی ٹاپ پر پہنچ جائیں گے..''

''ایک اور درّہ..''

''ابھی تو ایک ہی سرال ٹاپ کراس کیا ہے سر.. آج انشاء اللہ اسے بھی کراس کریں گے.. پار اُتر کر کچھ سفر وادی کے نیچے اُترنے کا ہے اور پھر کیمپ ہو گا..''

''کس جھیل کے کنارے؟''

''آج تو جھیل کے بغیر گذارا کرو..'' بشیر مسکرانے لگا اور پھر سے گروچو ہو گیا.. ''کل شاید ہم رتّی گلی جھیل پر کیمپ کریں۔''

رتّی گلی جھیل پر کیمپ کریں.. یہ فقرہ جھانجھروں کی طرح میری روح میں چھنکنے لگا.. کیا

سینتالیس برس سے سینت سینت کر رکھا گیا ایک خواب کل پورا ہو جائے گا..

ناممکن نہیں..شاید ممکن..میں ذرا سنبھلا تو پوچھا ’’جھیل کنارے نہیں تو آج شام کہاں کیمپ کریں گے؟‘‘

’’روڈ کے قریب خیمہ لگائیں گے سر!‘‘

’’کونسی روڈ کے قریب؟‘‘

’’میں بتاتا ہوں سر..‘‘ سلمان جو کان لگا کر ساری گفتگو سُن رہا تھا یکدم متحرک ہو گیا۔ ’’درّہ نوری ناڑ عبور کر کے نیچے وادی میں اُتریں گے تو شاردا آزاد کشمیر کو کاغان سے ملانے والی نئی کچی روڈ دکھائی دے گی سر..اُس پر سُنا ہے ویگنیں وغیرہ بھی چلتی ہیں۔ آپ اُن پر بیٹھ جاؤ سیدھے ناران پہنچ جاؤ اور پی ٹی ڈی سی موٹل میں جا نہاؤ..‘‘

’’تمہیں کیسے پتہ ہے؟‘‘

’’میں نے سب معلومات جمع کر لی ہیں سر جی..ویگن پر سوار ہو جاؤ تو جل کھڈ..وہاں سے بوڑاوائی اور باٹا کنڈی اور پھر ناران ناران..کیا بات ہے سر جی..‘‘

مجھے کچھ شک سا ہوا۔ ’’سلمان اس معلومات کا فائدہ..ہم تو کل رتّی گلی کا درّہ عبور کر کے جھیل تک جائیں گے..ناران تو ابھی بہت دور ہے۔‘‘

’’آپ جائیں گے سر جی..‘‘ سلمان شرمندہ سا ہوا۔ ’’میں تو آج روڈ پر پہنچتے ہی کسی ویگن میں سوار ہو کر سیدھا ناران جاؤں گا..سوری سر..میں بہت بیمار ہوں..میں تو دُودی پت سے ہی لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن خان سلیم نے حوصلہ دیا تو دل پر جبر کر کے چلا آیا..میرا حال اچھا نہیں..بہت بیمار ہوں..مجھ میں مزید سفر کرنے کی سکت نہیں..آج سرال ٹاپ پر چڑھتے ہوئے جب ٹٹو سے گرا ہوں تو وہیں سے واپس چلا جانا چاہتا تھا..میں نے واپس جانا ہے سر جی..‘‘

اور یہ ’’میں نے واپس جانا ہے سر جی‘‘ اُس نے ایک بچے ایسی بے چارگی اور معصومیت سے کہا۔

’’کچھ ہمت کرو..صرف دو روز اور سفر کرنا ہے۔‘‘

’’ہمت نہیں ہے سر جی..میں نے واپس جانا ہے۔‘‘

یہ پہلا ٹریک تھا جس کے دوران میرے ساتھی خزاں رسیدہ پتوں کی مانند جھڑتے جا

رہے تھے..آزمائش بھرے اور قربت مرگ والے کے ٹو..یاک سرائے یا سنولیک کے راستوں میں بھی کوئی ساتھی بیماری کے باعث نہ بچھڑا تھا اور ان ہری بھری پھولوں سے اٹی جھیلوں کے گھروں والی وادیوں میں وہ جھڑتے جا رہے تھے..کیا یہ خوبصورتی کا آسیب تھا جس کی نظر لگ گئی تھی..کیا تھا؟

ہماری خیمہ گاہ سے کچھ دور گھاس کی ہریاول کا ایک سبز جزیرہ تھا جو تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں چند گھوڑے سویر کی سنہری دھوپ میں خوش نما ہو رہے تھے..ہریاول پر پینٹ کیے ہوئے لگتے تھے۔ یوں نمایاں ہو رہے تھے..تھوتھنیاں سرال کی گھاس پر جھکائے ایک تصویر ہو رہے تھے..اور وہ ہمارے تھے..

پچھلی شب سرال جھیل کی سٹیج پر جو آپرا ’’سوان لیک‘‘ کھیلا گیا تھا اُس میں حصہ لینے والے راج ہنس وہاں نہ تھے جہاں وہ پچھلی شب پرفارم کر رہے تھے..مقام بدل چکے تھے..وہ تیرتے تیرتے کہیں اور چلے گئے تھے..اور پگھلتے پگھلتے مختصر ہو چکے تھے..ان میں سے وہ تو وہ جو آوارہ خرام اور بے مقصد تھا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا..شاید پگھل چکا تھا اور جھیل کے پانیوں میں گھل کر پانی ہو چکا تھا..فنا ہو چکا تھا جیسے میں نے بھی ہو جانا تھا..

کُوچ کا منظر..ہمیشہ ایک جدائی کے منظر کی مانند ہوتا ہے..

اس میں کسک ہوتی ہے، گھبراہٹ ہوتی ہے..دل ایک گلیشیئر کی مانند ٹوٹ رہا ہوتا ہے اور آواز نہیں آتی..آپ کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا..

خیمے جب سرال کناروں سے سمٹ رہے تھے تو مجھے بہت قلق ہوا۔ جدائی کا..یہاں ایک اور دن ایک اور شب گذارنے کی ہوس دل میں ہُمکتی تھی..

ہوش اختیار نہ کرو..اپنے آپ کو خوش بخت جانو کہ تمہیں بے شک ایک شب کے لیے ہی سہی سرال جھیل کا وصل نصیب ہوا..کتنے لوگ ہیں جنہیں ایسی محبوبہ کی رفاقت نصیب ہوتی ہے..کُوچ کرو..

سفید راج ہنسوں کی جھیل کے کناروں سے ہم نے اپنے خیمے سمیٹ لیے..

گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کُوچ کر گئے..

گرد چوما رموٹ پھر سے اکیلا رہ گیا..

وہ منہ اندھیرے بیدار ہو جانے والا ایک مارموٹ تھا اور صبح سے اپنے بل کے باہر ایستادہ ہمیں ناشتہ کرتے اور پھر خیمے اکھاڑتے حیرت اور اداسی سے دیکھتا تھا.. مونچھیں جھکائے اپنی اُس آنکھ کو بھی وا کرنے کی کوشش کرتا تھا جس کے آگے ایک جھالر ڈھلکتی تھی..

میں اُس کی جانب گیا نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر جاتا تو وہ ہراساں ہو کر روپوش نہ ہوتا بلکہ مجھ سے ہاتھ ملاتا اور ''سفر بخیر'' کہتا..

ہاں وہ اداس دکھائی دے رہا تھا..

خدا حافظ سرال اور ڈارلنگ گروچو!

''پہاڑوں کے جام میں سرال کی نیلی شراب''

میں واقعی آنکھیں بند کیے ہوئے گھوڑے پر بیٹھا تھا..

یہ اگلا قدم اُٹھاتے ہوئے پھسلے گا تو نہیں.. اگر پھسل گیا تو میں اس کے سمیت کتنی دیر تک خلاء میں گرتا ہوا بالآخر جھیل سرال کے پانیوں پر کریش کر جاؤں گا..

میں آنکھیں کھولتا تو ہم ایک ناممکن سی بلندی پر معلق اور وہ بھی یوں کہ ایک کھڑی چٹان کے کناروں پر اور یہ چٹان گرتی جا رہی ہے اور بہت نیچے سرال کے پانی دھوپ میں سلگتے ہیں.. بہت ہی نیچے.. اور ایسے کنارے پر کہ اگر میں دایاں ہاتھ سیدھا کر کے مٹھی میں بند ایک کنکر کو آزاد کرتا تو وہ بلا روک ٹوک گہرائی میں نظر آتے جھیل کے پانیوں تک گرتا جاتا..

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے گھوڑے اُس راستے پر کیسے چل رہے تھے.. اُن کے پاؤں پھسلتے کیوں نہیں تھے..

میرے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ میں دائیں جانب دیکھتا.. بس خلاء تھا جس کے بہت نیچے سرال جھیل کے پانی چٹانوں میں جزیرے بناتے تھے.. اور یہ پانی ایک عمیق گہرائی میں ایسے تھے کہ ذرا جھانکو تو بلانے لگتے تھے.. یہ واقعی ایک طائرانہ منظر تھا.. کسی پرندے تلے تو ایسا منظر معمول کی بات ہو گی لیکن ایک گھوڑے پر سنبھلتے اتنی اونچائی پر معلق ایک بندے کے لیے یہ عام نہیں.. موت کے بعد کا منظر ہو رہا تھا..

یقیناً جھیل سرال یہاں سے کمال کے دل کش منظروں میں پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن مجھ میں آنکھیں کھول کر اُسے جی بھر کے دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا کہ میں ایک حالتِ دہشت میں تھا..

بہت دیر بعد جب میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں تو ہم دھیرے دھیرے ڈھلوان سے نیچے آ رہے تھے اور جھیل قریب آ رہی تھی..اور جب ہم اُس کے آخری پانیوں سے ذرا آگے ہوئے تو میں نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے یہ اختتام کو پہنچی..

آگے چڑھائی تھی..

کچھ برفیں تھیں جو درے کے دامن سے اُترتی تھیں..

تھوڑی دیر بعد ہم سانس لینے کے لیے رُک گئے..

تب میں نے پہلی بار مڑ کر دیکھا..

گھڑسوار اور مجھ ایسے باکمال گھڑسوار کے لیے ایک قیامت ہوتی ہے کہ وہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھا مڑ کر نہیں دیکھ سکتا..چنانچہ سانس لینے کے لیے گھوڑوں سے اُترے تو میں نے پہلی بار مڑ کر دیکھا..

یہ سرال کا ایک اور مختلف منظر تھا..

پہاڑوں کے جام میں سرال کی نیلی شراب بھری ہوئی تھی..

ہم نے ایک شب اسے جی بھر کے پیا تھا اور مخمور ہوئے تھے..

اس مقام پر بھی خیمہ زن ہونے کو جی چاہنے لگا..بے شک یہ لبِ جام نہ تھا لیکن یہ چھلکتا یہیں سے دکھائی دیتا تھا..

یہاں سے جھیل کا وہ کنارہ جہاں ہم نے رات بسر کی تھی، بہت دُھندلا اور غیر واضح نظر آتا تھا..گروچو کیسے دکھائی دے سکتا تھا..

اس جام کے دوسرے کناروں پر میرا دوست گروچو رہ گیا تھا..

مجھے وہ بہت یاد آیا..

وہ مجھے قریب ہی نہ آنے دیتا تھا ورنہ میں اُسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر کم از کم یہاں تک تو ساتھ لے آتا..

مجھے گروچو اور سرال سے جدائی اور قلق کے اس صدمے سے باہر لانے والا مہروز تھا..

وہ ایک گلیشیئر کے کنارے ایک چٹان سے ٹیک لگائے کسی چرس زدہ ہپی کی مانند ٹوں ٹوں بانسری بجا رہا تھا..

اس نے ہمارے سات کے سات گھوڑوں کی آمد پر بھی کچھ دھیان نہ دیا اور ہم سے لاتعلق بانسری بجاتا رہا۔

وہ نہایت بےسُرا تھا..ساز کی آواز کی بجائے اُس کی پھونکیں زیادہ سنائی دیتی تھیں لیکن جھیل سرال سے پرے ایک بلند درے کے دامن کی برفانی تنہائی میں آپ یہ توقع تو نہیں کر سکتے کہ وہ خورشید انور کی 'مُٹن وِنجھلی دی مٹھڑی تان' ایسی سُریلی بانسری بجائے..وہ چناب کے کنارے نہیں سرال کے کنارے تھا..

وہ ظاہر ہے مکمل طور پر لاتعلق نہیں تھا..

اُس نے ہمیں جھیل سے اوپر آتے دیکھ لیا تھا اور ہماری توجہ حاصل کرنے کے لیے لاتعلقی کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر اپنے آپ میں مگن بانسری بجا رہا تھا..

اور یہاں سے جب ہم مڑ کر دیکھتے ہیں تو وہ پیچھے رہ گئی سرال کو دیکھتے ہیں تو کیسی دیکھتے ہیں..

ایسی دیکھتے ہیں کہ..

وہ ایک زہر پیالہ ہوتی تو بھی ہم اُسے پی جاتے.. یہاں سے اُس کی خوبصورتی مر جانے کے لائق تھی..اُس کے برفانی راج ہنس اگرچہ فاصلے کی وجہ سے مختصر ہو رہے تھے لیکن وہ جھیل کی نیلاہٹ پر سفید کشتیوں کی مانند رواں تھے..اُن کی الگ الگ شباہت کی اتنی دوری سے پہچان نہ ہوتی تھی کہ ان میں سے کونسا فاسٹنگ بُدھا ہے اور کونسا پائنا اور کونسا سفید گنبد اور وہ جو پانی میں گھل چکا تھا اُس کے آثار کہاں ہیں یہ تو شناخت نہ ہوتی تھی لیکن یہ ایک اور انسانی حیرت کے تمام پیالوں کو لبریز کر کے اُنہیں چھلکا دینے والا خوابناک منظر تھا..

مہروز بانسری بجاتا رہا..

اور جب میں گھاس پر لیٹ جاتا تو ایک بھورے پتھر کے آس پاس لہلہاتے سٹے دار شوخ گلابی پھولوں میں سے جھیل کے پانی جھانکنے لگتے..اور یوں لگتا جیسے انہوں نے پوری جھیل کو ڈھانپ رکھا ہو اور وہ اُس کی نیلاہٹ میں سے اُگ آئے ہوں..

"صاحب چلتے ہیں" بشیر نے ہمیں اس زہر پیالے کو پی جانے کی مہلت نہ دی "ابھی آگے کچھ چڑھائی ہے..درہ نوری ناڑ..سرال سے آسان تو ہے پر اتنا آسان نہیں ہے..چلیے صاحب.."

مہروز اس دوران اپنی لاتعلقی ترک کر کے ہمارا دوست بن گیا اور رضا کارانہ طور پر درّے تک کا راستہ دکھانے کے لیے ہمارے ساتھ ہولیا..

ہم..یعنی ہمارے گھوڑے اور اُن پر ہم..چلنے لگے..

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک گھوڑے پر بیٹھے ہوئے سب سے بڑی قیامت یہ ہے کہ آپ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے..یعنی میرے جیسے شاہسوار..پیدل چلتے ہوئے بے شک آپ کا سانس نہ چلتا ہو..پسینے میں بھیگی ٹانگیں لرزتی ہوں لیکن آپ اپنی مرضی سے کسی بھی لمحے مُڑ کر تو دیکھ سکتے ہیں..گھوڑے پر سوار نہ آپ مڑ کر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں نہ اپنی مرضی سے رُک سکتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والا منظر آپ کی پشت پر دستک دیتا رہتا ہے کہ ظالم ذرا مُڑ کر ایک آخری نظر تو ڈال لو..ایسے جھیل سرال سے جیسے جیسے ہم دور ہوتے گئے میرے شانوں پر اُس کی نیلی زلفیں پریشان ہوتی گئیں..راج ہنس اپنے سفید پروں کو پھڑ پھڑاتے میری پشت پر دستکیں دیتے رہے لیکن میں بے بس تھا پیچھے مڑ کر دیکھ نہیں سکتا تھا..

اور پھر چڑھائی کے دوران یکدم ایک ایسا موڑ آیا کہ وہ دستکیں بند ہو گئیں..اور اُس مقام پر اگر میں پیچھے مڑ کر دیکھتا تو جھیل اوجھل ہو چکی ہوتی..تو اُس مقام پر میں نے پیچھے دیکھے بنا جان لیا کہ سرال برفوں اور ڈھلوانوں کی اوٹ میں جا چکی ہے..میرے شانے اُس کی نیلی زلفوں سے خالی ہو چکے تھے اور نہ ہی میری پشت پر کوئی راج ہنس اپنے گھنے سفید پَر پھڑ پھڑاتا دستک دیتا تھا..

سرال ماضی کا ایک قصہ ہو گئی..وہ ماضی کی کتاب کا ایک اور ورق ہو گئی..وہ بھی اور گرو چو بھی!..

درہ نوری ناڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی..

سلمان کا ٹٹو جس پر سلمان بھی تھا سر ہلاتا گھوڑوں کی نسبت زیادہ آسائش اور اطمینان سے اوپر چڑھتا جا رہا تھا..سلمان ایک گھبرائے ہوئے کدّو کی مانند اُس پر حیران ہراساں بیٹھا اپنے آپ کو گرانے سے بچاتا تھا..وہ دوبارہ نہیں گرنا چاہتا تھا..وہ دور سے ڈان کے خوتے کے ذاتی ملازم سانچو پانزو کی طرح لگتا تھا جس کا ٹٹو اسی شباہت کا تھا..

میاں صاحب کی گھوری کبھی کبھار رُک کر اطمینان کر لیتی کہ اُس کا بچہ پیچھے پیچھے چلا آتا ہے کہ نہیں..اور یہ بچہ کبھی برف پر ننھی منی دولتیاں چلاتا اور کبھی ڈھلوان پر اُتر کر مستیاں کرنے لگتا

اور جونہی اپنی اماں جان کو رُکتے دیکھتا تو اُچھلتا ہوا واپس آتا اور اُن کی ٹانگوں پر تھوتھنی رگڑ کر اُنہیں نہال کر دیتا..

خان سلیم نے اگرچہ دعویٰ تو کیا تھا کہ وہ زبردست گھڑ سوار ہے لیکن اُس کا پول بھی کُھل چکا تھا..وہ ہمہ وقت گھوڑے کی منت سماجت کرتا رہتا..کبھی اُس کی پشت تھپکتا..کبھی باگیں کھینچتا کبھی ڈھیلی چھوڑتا اور آس پاس بالکل نہ دیکھتا اور گھوڑے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا گذارشیں کرتا کہ بھائی جان بڑی مہربانی..بے عزتی خراب نہ کرنا..گرانا نہیں..آہستہ چلو..اور پھر یکدم شور مچا دیتا..اوئے کیا کر رہے ہو..گرانا ہے..اوئے تو باز نہیں آتا..اوئے..میں تیری ماں کو..

میری اپنی پوزیشن بھی عجیب سی تھی کہ میری ایک ٹانگ تو بالکل سیدھی تھی رکاب میں..اور دوسری ٹانگ ایسے تھی کہ میرا گھٹنا کاٹھی کے برابر میں آتا تھا کیونکہ ایک بوسیدہ رسی سے تخلیق کی گئی دوسری رکاب ذرا اونچی تھی۔ چنانچہ میں ایک ایسا بگلا بھگت لگتا تھا جو ایک ٹانگ پر کھڑا..دوسری بدن کے ساتھ لگائے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے..میرا رہبرِ اسپ یعنی گھوڑے کو راہ دکھانے والا سلیم اگرچہ نہایت ہمدرد رُوح تھا لیکن آپ کو گھوڑے پر سوار کر کے باگ تھامتا تھا اور پھر کبھی مڑ کر نہ دیکھتا تھا کہ سوار کا حال اچھا ہے یا کہیں لڑھک چکا ہے..

میں نے اُسے ایک مرتبہ نہایت سنجیدگی سے سرزنش کی کہ میں تمہیں پکارتا رہتا ہوں کہ سلیم رُکو رُکو تو تم رُکتے کیوں نہیں تو نا ہنجار کہنے لگا کہ صاحب مجھے کیا پتہ آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو..میرا خیال تھا آپ گھوڑے سے باتیں کرتے ہو جیسے خان سلیم صاحب کرتا ہے..

چڑھائی مسلسل تھی..

کچھ ڈھلوانیں..پتھر جا بجا..سنگریزے ادھر اُدھر اور اُن میں پھول بہت..اور اُن میں سے ایک راستہ اوپر جا رہا تھا..

اور کہیں چٹانیں تھیں جن کے درمیان سے گذرنے کے لیے گھوڑے اپنا پیٹ پچکاتے تھے اور ہم ٹانگیں سمیٹتے تھے..

لیکن مجموعی طور پر درہ نوری ناڑ کی چڑھائی کچھ ایسی دشوار نہ تھی..

نوری ناڑ ٹاپ..

’’درّہ نوری ناڑ ٹاپ پر سے……
میں اور میرا گھوڑا لڑھکتے ہیں‘‘

نوری نار ٹاپ! یا نوری ناڑ... یا نوڑی ناڑ ٹاپ!
چوٹی پر کھڑے ہو کر نیچے نظر کرتے ہیں تو دور تک ایک اور سحر طراز منظر پھیلا ہوا.. نیلے
پہاڑ وادی کے کناروں پر سربلند.. اور نیچے کہیں برفوں کے تودے.. ندی نالے اور گلیشیئر جھیلیں اور
ان سے پرے بہت فاصلے پر کچھ پہاڑیاں اور پھولوں کی تمازت سے لال گلال ہو رہی تھیں..
اگر ہماری جگہ کوئی بھی نو آموز کوہ نورد اس منظر کو اپنے سامنے کھلتا دیکھتا تو دیوانہ سا ہو
جاتا..

ہماری پرابلم یہ تھی کہ ہم پچھلے بیس پچیس برسوں میں اتنی بار دیوانے ہو چکے تھے کہ اب مزید دیوانگی کی گنجائش نہ تھی.. اس کے باوجود ہم نے اُس منظر کو تادیر دیکھا کہ یہ اس لائق تو تھا کہ بے شک دیوانہ نہ کرے لیکن تادیر دیکھا تو جائے..

’’روڈ کہاں ہے؟‘‘ سلمان بے تاب تھا..

’’صاحب وہ تو ابھی بہت دیر کے بعد دکھائی دے گی۔‘‘ بشیر آنکھیں جھپکتا روڈ کو تلاش کرنے لگا ’’ابھی تو نیچے جائیں گے.. یہ گلیشیئر کا علاقہ اور کچھ ندی نالے پار کریں گے، تب روڈ دکھائی دے گا.. لیکن.. ذرا غور کرو شاید ادھر سے بھی کچھ دکھائی دے رہا ہے..‘‘

سلمان نے بہت ہی غور کیا کہ یہ روڈ اُس کی واپسی کی محبوبہ تھی..

مجھے بھی کچھ شائبہ سا ہوا کہ دور برفوں کے پار گہرائی میں سائے میں آتے ہوئے جو

پہاڑ ہیں اُن میں شاید ایک بل کھاتا فیتہ سا نظر آتا ہے..

مناسب آرام اور ایک بہت ہی غیر مناسب لنچ کے بعد اُترائی کا آغاز ہو گیا..

یہاں بھی وہی قدیمی دشواری درپیش تھی یعنی میرا گھوڑا ایسے عمودی زاویے پر اُترتا تھا کہ مجھے اُس کے کان بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور میں اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے پیچھے پیچھے ہوتا تھا اور میں کتنا ہو سکتا تھا.. تقریباً پشت کے بل لیٹا ہوا گھوڑے کی دُم کے نیچے جو اخراج کا منبہ تھا اُس کی بُو تو سونگھ رہا تھا.. اور کتنا پیچھے ہو سکتا تھا..

لیکن میں بولا نہیں.. سلیم سے نہیں کہا کہ رُکو رُکو.. خدا کے لیے رُکو.. کہ اُس نے یہی سمجھنا تھا کہ میں گھوڑے سے باتیں کر رہا ہوں..

شدید گرتی اُترائی کا اختتام ہوا تو ہم برفوں کی ایک مختصر دنیا میں سے گذرنے لگے..

یہ نہیں کہ میں ایک بہادر جنگجو کی مانند مسلسل اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا.. گھاٹیاں ٹاپتا، خطرات کو خاطر میں نہ لاتا ایک شان بے نیازی سے کوہ و دمن میں اُڑتا چلا جا رہا تھا.. گذرتا چلا جا رہا تھا بلکہ میں ایک چیونٹی اور وہ بھی ایک ناتواں چیونٹی کی رفتار سے چلا جاتا تھا اور سلیم کو بھی میں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ گھوڑے کو گھوڑا نہ سمجھے چیونٹی سمجھے اور اُسی رفتار سے رینگے..

اس رفتار کے باوجود ہر پانچ دس منٹ بعد میں ’’روکو روکو‘‘ کے فلک شگاف نعرے بلند کرتا تو سلیم میری سُنی کو اَن سُنی نہ کرتا سُن لیتا اور مجھے گھوڑے سے اُتار لیتا.. میں کچھ دیر اپنی ٹانگیں سیدھی کرتا.. سگریٹ کے دو چار کش لگاتا، اکڑی ہوئی گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر اُس کے کڑاکے نکالتا اور پھر سے.. سلیم کی مدد سے شاہ سوار ہو جاتا..

آس پاس منظر تو بہت دل فریب اور گُل افروز تھا لیکن اُس کی جانب توجہ کم کم جاتی تھی..

ایک ایسے ہی ’’رکو رکو‘‘ کے وقفے کے بعد میں نے حسب معمول گھوڑے پر دوبارہ سوار ہونے کے لیے سلیم سے گذارش کی کہ وہ اُسے کسی پتھر کے برابر میں لے جائے تا کہ میں اُس پتھر پر پاؤں رکھ کر اُس پر سوار ہو سکوں اور جب یوں سوار ہونے کے لیے میں نے سلیم کے شانے کا سہارا لیا اور گھوڑے پر ابھی آدھا سوار ہوا تھا کہ اُس بدبخت جانور کے جی میں جانے کیا آئی کہ اُس نے میرے بقیہ نصف کے سوار ہو جانے سے پیشتر ہی چلنا شروع کر دیا.. اب اس منظر کی تصویر

کچھ یوں بنتی تھی کہ میں آدھا تو گھوڑے پر سوار ہوں اور بقیہ آدھا سلیم کے کندھوں پر ہاتھ رکھے خلاء میں ہوں اور گھوڑا چلا جا رہا ہے۔ رفتار تیز کرتا جا رہا ہے..اور کہاں جا رہا ہے.. نیچے کھائی میں اُترتا جا رہا ہے اور میں دوہائی دے رہا ہوں کہ پکڑو پکڑو..جانے نہ پائے..ارے کوئی ہے.. روکو روکو۔

بے شک اس بھگدڑ کے دوران سلیم نے مجھے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن اُس نے گھوڑے کو تو نہیں پکڑ رکھا تھا اور وہ کمبخت اپنے تئیں کسی ڈربی ریس میں شریک کھائی میں گر کر اول آنے کی خواہش میں تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا..

میں اُس کی پشت سے یوں ڈھلکا ہوا تھا..دائیں جانب لٹکا ہوا تھا جیسے میرے ہاتھ میں ایک عدد نیزہ ہے اور میں ٹینٹ پیگنگ میں حصہ لینے والا ایسا گھڑسوار ہوں جو ہارس اینڈ کیٹل شو میں کرتب دکھا رہا ہے..

کیا یہ کرتب دکھاتے ہوئے میں خوفزدہ تھا..؟

آپ میری جگہ ہوتے تو کیا ہوتے..میری عمر کے..میرے بھالو بدن کے..کھائی کی جانب بگٹٹ بھاگتے ایک گھوڑے پر آدھے سوار..لٹکے ہوئے تو آپ کیا ہوتے..بس جو آپ ہوتے وہی میں تھا..

اس ہاؤ ہو کو سن کر..یعنی میری مسلسل دردبھری فریادیں سن کر اورنگزیب اوپر سے بھاگتا آیا اور گھوڑے کے دوسری جانب مجھے سہارا دینے کی سعی کرنے لگا..اب بائیں جانب سلیم مجھے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ گھوڑے کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے اور دائیں جانب اورنگزیب مجھے کھینچ رہا ہے اور اس کھینچا تانی کی تان ٹوٹنے کو تھی کہ کھائی کی قربت میں پہنچ کر گھوڑا شاید اپنے سامنے ایک گہرائی پا کر ٹھٹک گیا اور ٹھٹک سے فائدہ اُٹھا کر اُسے قابو کر لیا گیا اور مجھے دبوچ کر اُتار لیا گیا.. اُتار کر سانس لینے کا بھی موقع نہ ملا اور دونوں نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اٹھایا اور پھر سے گھوڑے پر بٹھایا..بیٹھا ہوں اور اوپر نگاہ کی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ''تماشائی'' اس کرتب سے لطف اندوز ہو کر تالیاں پیٹ رہے ہیں..سلمان اپنے ٹٹو سمیت ہنس رہا ہے..میاں صاحب اپنی عینک درست کرتے مسکرا رہے ہیں اور خان سلیم اپنی مونچھیں گروچو کی مانند پھڑکا رہے..میری جان پر بنی ہوئی تھی بلکہ جتنی بھی جان تھی وہ بے جان ہونے لگی تھی اور میرے

عزیز از جان ساتھی ہنس رہے تھے..چنانچہ سفر کا آغاز ہوا تو میں نے اُن سے بات چیت موقوف کر دی، ایسے کمینے دوستوں سے راہ ورسم رکھنے کا فائدہ..

ایک اور بلندی سامنے آئی..

سلیم باگ تھامے اُس پر چڑھنے لگا..اُس کے ساتھ گھوڑا بھی اور گھوڑے پر سوار میں بھی..

اور جب اوپر پہنچتے ہیں تو گہرے نشیب تک ایک اور دوپہر کی زرد دھوپ میں ڈھلی کیا ہی خوابناک بے انت پھولوں سے بھری ڈھکی رنگین ڈھلوان ہے..اور جہاں نشیب میں سورج کی روشنی نہیں پہنچ رہی..نیم سیاہی ہے وہاں ایک نالہ بہہ رہا ہے اور اُس کے عین اوپر وہ روڈ ہے جو سلمان کی جانِ آرزو ہے..میرے ساتھی تو اپنے گھوڑوں پر چنگیز خان کی قاہر افواج کی مانند بے خطر اور بے دھڑک اُترتے جاتے تھے اور میں خوف کے سناٹے میں آ گیا کہ اتنی عمودی گہرائی میں کیسے اُتروں گا..

پھر میں نے دیکھا کہ ڈھلوان کے درمیان کچھ جھونپڑے ہیں جن کے آس پاس زمین، گھاس اور پھولوں سے عاری ہے اور اُس زمین پر جب میرے ساتھیوں کے اور سامان کے گھوڑے اُترتے ہیں تو دھول اٹھتی ہے..

میں بہت پیچھے رہ گیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بہت اوپر رہ گیا تھا۔ پھر میرے ساتھی جھونپڑوں کے قریب سے دھول اُڑاتے نیچے نالے تک پہنچ گئے اور اُن کے گھوڑے اُسے عبور کرنے لگے..اُن کے آگے ایک بلند کنارا تھا اور وہاں وہ روڈ تھی اور ایک جھونپڑا تھا جسے ہوٹل بتایا گیا..

"تارڑ جھوٹ بہت بولتا ہے.. سَر"

نیچے تو جاتا تھا۔ سو گیا.. کبھی گھوڑے پر.. کبھی اُتر کر چند قدم اُترتا تو ہانپنے لگتا.. پھر سلیم کی منت سماجت کہ یار پھر بٹھادو.. اور یہاں بھی سلیم نے مجھ پر ترس کھا کر زگ زیگ فارمولے پر عمل کیا اور مجھے گھماتا.. آگے پیچھے کرتا.. نیچے لے ہی گیا.. پھر نالہ عبور کیا جس میں بہت کم پانی تھا.. پار ہو کر بلند کنارے پر چڑھے.. اوپر پہنچے تو پہاڑوں کے نیم تاریک سائے میں آ گئے.. آس پاس بلندیاں تھیں اور تنہائی میں ایک تنہا جیپ روڈ خاموش تھی اور اُس کی ویرانی کے کنارے ایک چھپر تھا جو کہ ہوٹل تھا جہاں میرے ساتھی کب کے پہنچ کر گُل چھرّے اُڑا رہے تھے.. کمینے کہیں کے!

چائے سوا ہوٹل کی واحد فخریہ پیشکش.. چنے تھے.. جو یا تو اُبالے جا سکتے تھے اور یا اُن میں نمک مرچ گھول کر اُن کا سالن بنایا جا سکتا تھا.. جس کا آرڈر دیا جا چکا تھا..

اور جب وہ چنے پلیٹوں میں سجے سامنے آئے.. اتنے دنوں بعد ٹین بند خوراک کے بعد تازہ اور اوریجنل خوراک سامنے آئی اور توے پر سے گرم گرم چپاتیاں اُتریں تو ہم سب وجد میں آ گئے..

البتہ سلمان وجد میں آنے سے گریز کر رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے پہاڑوں میں سے برآمد ہونے والی کچی سڑک کی ویرانی کو دیکھے چلا جا رہا تھا اور اُسے ہوس تھی کہ کاش وہاں سے کوئی ویگن اُتر آئے.. جو اُتر آئی..

سلمان جو آج جھیل سرال سے چلتے ہی نہایت رقت آمیز آہ و زاریاں کرتا چلا آیا تھا کہ ہائے سر جی میں قریب المرگ ہوں.. کبھی بیٹھ جاتا کبھی سر درد کی گولی پھانکتا کبھی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرتا ٹٹو پر سوار ہونے کے باوجود قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا دکھائی دیتا تھا وہی

سلمان اس ناران تک جانے والی ویگن کو دیکھتے ہی کنگرو کی مانند پھرتیلا اور اُچھلتا ہوا ہو گیا.. اُس نے ہمیں موقع ہی نہ دیا کہ ہم اُسے اپنے ساتھ آگے جانے کے لیے قائل کر سکتے.. وہ اپنا سامان اُٹھا کر فوری طور پر ایک بندر کی مانند زقندیں بھرتا ویگن کی چھت پر جا پہنچا.. سامان ترپال تلے باندھا پھر چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور ایک واجبی سی ہائے ہائے کر کے ہم سب سے ہاتھ ملا کر ویگن میں روپوش ہو گیا..

ویگن چلی گئی..

"بس ہمت ہار گیا ہے تارڑ صاحب" خان سلیم کہنے لگا "ورنہ اس کی پھرتیاں ملاحظہ کی تھیں.. چونکہ اُس نے اپنے آپ کو قائل کر لیا تھا کہ میں بیمار ہوں، آگے نہیں جا سکتا اس لیے چلا گیا۔"

چنوں کے سالن اور گرم چپاتیوں کے طعام کے بعد ہم گرم چائے سُڑکنے لگے..

ظاہر ہے ہم اپنے بھالو قسم کے ساتھی کے چلے جانے پر کچھ اداس تھے..

"بشیر.. اب کدھر جائیں گے؟"

"صاحب یہیں سے روڈ چھوڑ کر ذرا اوپر جائیں گے اور یہاں سے وہ نالہ دکھائی دے رہا ہے.. وہاں کیمپ کریں گے.. میں پورٹروں کو روانہ کرتا ہوں کہ وہ وہاں پہنچ کر خیمے لگائیں.."

ہم سلمان کے یوں رخصت ہو جانے پر رنجیدہ تو تھے لیکن ہم بھی اُس ناران کو جاتی ویگن کو دیکھ کر للچائے بہت تھے جس نے سات آٹھ گھنٹوں میں آج نصف شب کے قریب وہاں پہنچ جانا تھا جہاں موٹل کے آرام دہ کمروں میں صاف ستھرے بستر اور غسل خانے تھے اور گرم پانی کے شاور تھے.. لیکن ہم اپنے آپ پر جبر کر گئے.. ضبط کر گئے..

ہمارے گھوڑے ہمارے بوجھ سے آزاد اور سامان سے لدے سب سات کے سات جن میں ایک ٹٹو بھی تھا روڈ پار کر کے اوپر جا رہے تھے.. اور ہم اطمینان سے چائے نوش کر رہے تھے کہ آج کا سفر اختتام کو پہنچ چکا تھا..

اس دوران شاردا سے آنے والی اس روڈ پر ایک فوجی قافلہ نمودار ہوا اور ہمارے جھونپڑے یا ہوٹل کے عین سامنے آ کر رُکا.. ایک ٹرک میں سے ایک نہایت ڈیشنگ چھریرے بدن کا میجر کُود کر نیچے اُترا، میرے سامنے میز کے پار جو لکڑی کا بنچ تھا اُس پر آ بیٹھا اور اکلوتے ویٹر کو

اپنے اور ساتھی فوجیوں کے لیے چائے اور بسکٹوں کا آرڈر دیا۔ آرڈر دے کر اس نے فوجی بے اعتنائی سے اِدھر اُدھر نگاہ کی۔۔اور پھر میں جو میز کے پار بیٹھا تھا مجھ پر نگاہ کی اور پھر اُس کے چہرے کا ڈسپلن ذرا نرم پڑ گیا ’’آپ۔۔آپ تارڑ صاحب تو نہیں ہو سکتے؟‘‘

’’میں ہو سکتا ہوں۔۔‘‘

میجر نے شاید زیرِ لب چار حرفوں کا وہ انگریزی لفظ دہرایا جو ان دنوں زبان زدِ عام ہے اور جسے اردو میں کہا جائے یا لکھا جائے تو فحاشی کے الزام میں گرفتار ہوا جا سکتا ہے۔۔اور پھر مسکرا کر کہا ’’سر آپ۔۔آپ یہاں کیسے ہو سکتے ہیں؟‘‘

’’میں ہی تو ہو سکتا ہوں۔‘‘

میجر صاحب کا مشاہدہ واقعی نہایت تیز تھا۔ کہ میں اُس مقام پر وہ تارڑ نہ تھا جو ٹیلیویژن پر میک اپ شدہ دکھائی دیتا تھا یا ادبی محفلوں میں دانشوری بگھارتا تھا۔۔داڑھی بڑھی ہوئی۔۔ پریشان حال۔ سفید بال۔۔ پی کیپ آنکھوں پر جھکائے۔۔نہایت ہی ناقابلِ شناخت بوسیدہ اور گندا مندا سا تارڑ تھا اور اس کے باوجود انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔۔

’’تارڑ صاحب۔۔‘‘ وہ بہت جذباتی ہو گئے اور اپنے اُن افسروں کے قصے سنانے لگے جو سیاچین اور کشمیر کی کنٹرول لائن کے بنکروں میں بیٹھ کر میری کتابوں کو ساتھی رکھتے تھے اور پھر یکدم کچھ یاد آیا تو کہنے لگا ’’کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ آج صبح میس میں ناشتے کے دوران میرے ایک جونیئر آفیسر نے اعلان کیا کہ سر یہ جو تارڑ ہے ناں تو میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ ایسے مشکل مقامات پر نہیں گیا۔ بس ادھر ادھر سے معلومات اکٹھی کر کے گھر بیٹھ کر سفرنامے لکھ دیتا ہے اور لوگوں کو پاگل کرتا رہتا ہے۔۔‘‘

’’یہ تو کوئی نیا اعتراض نہیں۔‘‘

’’نہیں سر۔۔ میں تو یہ نہیں سمجھتا۔۔ میں نے تو یونہی آج صبح کے ناشتے کا حوالہ دے دیا۔۔‘‘ میجر صاحب کا لہجہ معذرت بھرا ہو گیا۔۔

’’نہیں نہیں۔۔آپ کے جونیئر افسر بالکل درست کہتے ہیں کیونکہ اُن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاک فوج بہت ذہین ہے اور ان کی معلومات بہت پرفیکٹ ہیں۔۔‘‘ میں ہنسنے لگا۔

میجر صاحب جو نہایت چاک و چوبند اور اچھی شکل کے تھے، اُنہوں نے مٹھی بھینچ کر

اُسے اپنے ہونٹوں پر رکھا ایک نابالغ قسم کا کھنگورا مارا اور چھپر سے پرے کھڑے فوجی ٹرک کی اگلی نشست پر براجمان ایک نوجوان کو پکارا۔ نوجوان جانے کس خیال میں تھا اپنے افسر کی آواز سنی تو جھرجھری سی لے کر یکدم یوں سیدھا ہوا جیسے بجلی کے تار سے چھو گیا ہو۔۔پھر اُسی اکڑی ہوئی حالت میں ٹرک سے اُترا مارچ کرتا ہوا اپنے سینئر آفیسر کے سامنے آیا اور پتھر ہو گیا۔۔

’’کیپٹن۔۔‘‘

’’سَر۔۔‘‘

’’آپ بیٹھئے اور چائے پیجئے۔۔‘‘

کیپٹن پتھر سے موم ہو کر بنچ پر بیٹھا اور بیٹھتے ہی پھر پتھر ہو گیا۔ ’’سَر۔۔‘‘

’’نوجوان۔۔‘‘ میجر صاحب نے گردن میں بل دے کر مسکراتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ ’’تم آج صبح ناشتے کے دوران اُس تارڑ فیلو کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟‘‘

نوجوان کے کچھ پلّے نہ پڑا کہ اس ویرانے میں یکدم میجر صاحب کو اس تارڑ فیلو کی کیا سُوجھی ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ فوج میں سُوجھ بُوجھ کی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے اُس نے حکم کی تعمیل کی ’’سَر میرا خیال ہے کہ وہ اُن تمام بلندیوں تک نہیں گیا جن کے بارے میں وہ کتابیں لکھتا ہے۔۔سَر۔۔‘‘

’’کیسی کتابیں لکھتا ہے؟‘‘

’’سر ہمارے سیکٹر میں تقریباً تمام آفیسرز کے مورچوں میں اُس کی کتابیں ہوتی ہیں۔۔ اچھی لکھتا ہے سر لیکن جھوٹ بہت بولتا ہے۔۔وہ سب کچھ سچ نہیں ہو سکتا جو وہ لکھتا ہے سر۔‘‘

میجر صاحب نے اپنے تئیں ایک شرارتی نظر مجھ پر ڈالی، پھر اُس نوجوان کو دیکھا جس نے ابھی تک اپنی نظر کسی پر نہ ڈالی تھی۔۔اکڑوں بیٹھا افق کے پار ٹکٹکی باندھے منجمد اور پتھر حالت میں تھا۔ ’’تم اپنے سامنے بیٹھے جنٹل مین کو دیکھو۔۔دیکھو کہ یہ کون ہے۔۔‘‘

نوجوان نے حکم کی تابعداری میں نگاہیں افق سے نیچی کر کے مجھے دیکھا۔۔بلکہ اتنا آگے ہو کر میرا معائنہ کیا کہ اُس کی ناک میری ناک کو چھونے سے بال بال بچی اور پھر وہ ایک حالت سکوت میں چلا گیا۔۔اُسی حالت میں سیدھا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔۔اپنا ہاتھ ماتھے تک لے گیا، مجھے سیلوٹ کرنے کے بارے میں سوچا، پھر نروس ہو کر وہی ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ ’’سلاماليكم سر جی۔۔‘‘

’’وعلیکم السلام..برخوردار‘‘ میں نے اُس کی حالت زار سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا..

’’سر آئی ڈِڈ ناٹ مین اِٹ..رئیلی سر..آئی ایم اے گریٹ فین آف یورس..پلیز فار گومی..‘‘

’’آپ پلیز بیٹھ جائیے..‘‘

’’میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے سر..‘‘

وہ بار بار کہنے سے اور بہت مشکل سے بیٹھا۔ ’’بھئی میرے ساتھ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے.. اور میں آپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا.. میں اقرار کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں منظروں کی رو میں بہتا ہوا حقیقت سے دور نکل جاتا ہوں اور تصور کی دنیا میں چلا جاتا ہوں..‘‘

’’سر..‘‘

’’مجھے امید ہے کہ آپ آج سے دو تین برس بعد جب میری موجودہ کوہ نوردی کی داستان پڑھیں گے تو کم از کم یہ گواہی تو دیں گے کہ میں جھیل سرال سے اُتر کر رتّی گلی کو جاتے ہوئے اس کچی روڈ کے کنارے پہاڑوں کی اس شام میں ایک چھپر ہوٹل میں واقعی موجود تھا..‘‘

’’سر..‘‘ اُس نے صرف اتنا کہا..

’’جل کھڈ روڈ پر کافر تتلیاں پکڑتا ہے اور مسلمان جنّت کماتا ہے!‘‘

جل کھڈ روڈ سے جدا..قدرے بلندی پر..ایک سرسبز خوشنمائی میں..ایک آہستہ رو برفانی ندی جو بلندیوں پر برفوں کا ایک پگھلاؤ تھا اُس کے کناروں پر ہمارے خیمے کب کے نصب ہو چکے تھے اور شام کے اُترنے سے اس منظر کی خوش نمائی دھیرے دھیرے اوجھل ہوتی تھی..

ہماری خیمہ بستی کے اوپر بلندی پر کچھ پتھریلی آماجگاہیں معلق تھیں جن کے شوخ پیراہن خانہ بدوش مکین کبھی باہر آ کر ہمیں تکتے تھے اور کبھی پتھروں کی اوٹ میں روپوش ہو جاتے تھے اور وہاں ایک بھیڑیا صفت کتا جو نظر نہ آتا تھا، غراتا تھا اور مسلسل بھونکتا تھا..

یہ ڈک کے بعد پہلی شب تھی جو ہمیں کسی جھیل کے کناروں پر خیمہ زن نہ پاتی تھی.. لُولُوسر..دُودی پت اور سرال ایسی کسی جھیل کے بغیر ایک شب تھی..لیکن یہ نہیں کہ یہ ہیجان کے بغیر تھی.. پہاڑوں کے اندر کی تنہائی میں کہیں بھی خیمہ زن ہونا ہیجان کے بغیر نہیں ہو سکتا..

حافظ انور نے حسبِ معمول ایک پتھر کی اوٹ میں چولہا جلا رکھا تھا..گیس لیمپ روشن کر دیا تھا اور کوفتوں کے دو ڈبے کھول کر اُنہیں تڑکا لگا رہا تھا..اور میں ابھی اپنے جوگرز کو پاؤں سے جُدا کر کے کمر سیدھی کرنے کی خاطر اپنے خیمے میں رینگ جانے کو تھا کہ ایک بہت خبردار شکل بنائے ایک کردار کوئی مخدوش سی سرکاری وردی پہنے جانے کہاں سے نازل ہو گیا.. پہلے اُس نے بشیر سے کچھ مذاکرات کیے اور جب وہ اُس کی تشفی نہ کر سکا تو وہ میرے پاس چلا آیا..

’’آپ کون لوگ ہیں؟‘‘

’’ہم پاکستانی لوگ ہیں..‘‘

’’یہاں کیوں آئے ہیں؟‘‘

’’پتہ نہیں کیوں آئے ہیں..‘‘

میرے جوابات سے اُس نے کچھ بے عزتی سی محسوس کی اور سینہ تان کر نہایت سرکاری لہجے میں گویا ہوا ’’آپ ان پہاڑوں میں جو نایاب ادویاتی پودے ہیں اُن کو تلاش کرنے آئے ہیں یا تتلیاں پکڑنے آئے ہیں؟‘‘

یہ عجیب سا مرکب تھا..ادویاتی پودے اور تتلیاں..’’آپ اپنا تعارف تو کروائیں کہ آپ کون ہیں..‘‘

’’میں..‘‘ اُسے شدید دکھ ہوا کہ یہ نادان میری وردی کو دیکھتا ہے اور پھر بھی دریافت کرتا ہے کہ میں کون ہوں۔’’میں فارسٹ گارڈ ہوں۔‘‘

’’لیکن یہاں دور دور تک کوئی فارسٹ نہیں ہے..کوئی ایک بھی درخت نہیں ہے۔‘‘

’’اس کے باوجود میں فارسٹ گارڈ ہوں..‘‘ وہ کچھ ناراض ہو گیا..

مین نے اُسے چائے کی ایک پیالی پیش کی اور وہ بسکٹ جو گیلے ہو چکے تھے اور جنہیں ہم پھینکنے کے بارے میں سوچ رہے تھے، وہ پیش کیے۔

اُس کی مہربانی کہ اُس نے ان ہر دو خوراکوں کو قبول کر لیا اور نہایت رغبت سے قبول کیا...اور اس قبولیت کے بعد وہ یکسر بدل گیا..مہربان اور شکر گزار ہو گیا..’’جناب آپ بالکل درست فرما رہے ہیں کہ یہاں آس پاس دور دور تک کوئی فارسٹ نہیں تو اس کے باوجود اگر یہاں ایک فارسٹ آفیسر صاحب ہیں تو یہاں ایک فارسٹ گارڈ بھی تو ہونا چاہیے اُن کی خدمت کے لیے..بڑے صاحب آج یا کل تشریف لانے والے ہیں..میں روزانہ تو یہ وردی نہیں پہنتا..جناب میں تو کھیتی باڑی کرتا ہوں..کچھ بھیڑیں ہیں اُن کی دیکھ بھال کرتا ہوں تو وردی پہن کر تو نہیں کر سکتا..بڑا صاحب آ رہا ہے، اس لیے آج وردی میں ہوں۔‘‘

’’اور یہ جو نباتاتی جڑی بوٹیاں اور تتلیاں وغیرہ ہیں جن کی آپ بات کرتے ہو، یہ کیا ہیں اور کہاں ہیں؟‘‘

’’جناب مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں بہت نایاب قسم کے پودے اور بوٹیاں ہیں تو میرا

ڈیوٹی ہے کہ ان کی حفاظت کروں۔‘‘

’’یار آپ ادھر آس پاس کسی نباتاتی پودے کی نشاندہی تو کرو کہ میں تو ہمیشہ سے ایسے پودے دیکھنے کا خواہش مند رہا ہوں..‘‘

’’ادھر نہیں وہ اوپر ہوتے ہیں..بہت قیمتی ہوتے ہیں..مجھے ان کی پہچان نہیں مگر میں اُن کی حفاظت کرتا ہوں..میرا ڈیوٹی ہے۔‘‘

چنانچہ یہ حضرت ایک ایسے جنگل کی حفاظت کر رہے تھے جس کا وجود نہ تھا اور ایسے نایاب پودوں کے گرد پہرہ دے رہے تھے جنہیں وہ پہچانتے نہ تھے..میں نے اُسے مزید چائے پلائی اور پھر پوچھا اور یاد رہے کہ رات اتر چکی تھی اور ہم کھلی فضا میں ٹھٹھر رہے تھے ’’اور ہاں..ان تتلیوں کا کیا قصہ ہے؟..‘‘

’’جناب وہ یہاں تو نہیں ہیں..جل کھڈ روڈ کے پار جو بڑا پہاڑ کا چوٹی ہے اُس پر تتلی اُڑتا ہے..اور اُدھر چوٹی پر کچھ گورا لوگ پڑا ہے اور میں اُن کی بھی حفاظت کرتا ہوں۔‘‘

’’تتلیوں کی بھی حفاظت کرتے ہیں؟‘‘

’’اُن کا تو کرتا ہوں پر گورا لوگ کا بہت ہی حفاظت کرتا ہوں۔‘‘

’’کس چیز سے حفاظت کرتے ہو..کوئی بندوق وغیرہ تو تمہارے پاس ہے نہیں۔‘‘

’’نہیں ہے صاحب..فارسٹ گارڈ کو ہتھیار نہیں ملتا میں خود بخود حفاظت کرتا ہوں گورا لوگ کی۔‘‘

’’اُن کو کیا خطرہ ہے؟‘‘

’’بہت خطرہ ہے صاحب..‘‘ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔’’آپ کو تو پتہ ہے کہ ان دنوں بہت جہاد ہو رہا ہے..ہم لوگ تو نہیں کرتا اُدھر بابوسر کے پار جو چلاس کا لوگ ہے، وہ کرتا ہے..وہ پہاڑ کے پار سے آ جاتا ہے اور گورا لوگ کو مارنے کی کوشش کرتا ہے.. جنّت کماتا ہے۔‘‘

’’کیسے جنّت کماتا ہے؟‘‘

’’وہ کہتا ہے کہ ایک گورا لوگ کو مارو تو ڈائریکٹ جنت میں جاؤ..‘‘

’’تو جان کے خطرے کے باوجود یہ گورا لوگ اوپر پہاڑ پر کیوں بیٹھا ہے؟‘‘

’’پاگل لوگ ہے سر..سارا دن تتلیاں پکڑتا ہے اور پھر ان کو دوربین کے نیچے رکھ کر

دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے خوردبین کے نیچے.."

"نہیں دوربین ہے، ہم نے خود دیکھا ہے.. اُس کے نیچے تتلی رکھتا ہے.. پھر کتاب میں کچھ لکھتا ہے.. اُس کا فوٹو بناتا ہے.. پاگل لوگ ہے جناب ایک ماہ سے تتلیاں پکڑتا ہے اور پروا نہیں کرتا کہ نیچے چلا اس سے کوئی جنت کمانے والا آ جائے گا. موت سے کیوں نہیں ڈرتا صاحب.."

"کافر لوگ ہے اُن کو پتہ نہیں کہ موت کیا ہے.. ہمیں پتہ ہے اس لیے ہم ڈرتا ہے۔"

فارسٹ گارڈ نے شاید حافظ انور کے کچن ٹینٹ میں سے اُٹھتی دھو میں مچاتی کوفتوں کی خوشبو سونگھ لی تھی اور اس آس میں باتیں کرتا چلا جاتا تھا کہ چائے کے بعد کوفتے بھی آ ہی جائیں گے.. لیکن مسئلہ صرف یہ تھا کہ کل چھ کوفتے تیار ہو رہے تھے اور ہم میں سے کوئی اپنے حصے کا ایک کوفتہ بھی قربان کرنے کو تیار نہ تھا اس لیے ہم نے فارسٹ گارڈ کو چند سویٹس عنایت کر کے رخصت کر دیا کہ میاں کہیں وہ نایاب پودے خرد برد نہ ہو جائیں اور کوئی تمہارا جنگل کاٹ کر نہ لے جائے تو تم جاؤ اُن کی حفاظت کرو..

ہم تین رہ گئے تھے..

چار چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار..

ہم چار نہ تھے.. چھ نکلے تھے گھر سے.. اور پھر بھی تین رہ گئے تھے..

جل کھڈ روڈ کے اوپر اُس خیمہ گاہ میں جو رات آئی.. عام سی رات تھی.. بھلا ایک جھیل پہلو میں نہ ہو تو وہ کیا رات ہوئی.. جس بجھے ہوئے چاند نے اب تک ہمارا ساتھ دیا تھا وہ بھی نظر نہ آیا.. شاید ہم نشیب میں تھے اس لیے.. سوائے اُس بھیڑیئے کی غراہٹ والے کتے کے مسلسل بھونکنے کے.. شب بھر کوئی اور چرچا نہ رہا..

وَف.. وَف.. بھوؤں بھوؤں.. بس یہی چرچا رہا..

"درّہ دواریاں کے دامن میں ایک شہرِ زرد"

ہمارے گھوڑے منہ مارتے تھے.. جو کچھ اُن کے منہ میں آتا تھا اسے چبا کر نگلتے تھے تو منہ یعنی اپنی تھوتھنی بنا لیتے تھے کہ گھاس کی بجائے وہ پھولوں میں منہ مارتے تھے..

اُنہیں گھاس مرغوب تھی اور یہاں سوائے زرد پھولوں کی ایک کائنات کے سوا اور کچھ نہ تھا..

درّہ دواریاں.. کے نشیب میں مہک آور زردی بچھی ہوئی تھی..

جیسے ستاروں کا شمار ممکن نہیں ایسے پہاڑوں میں گھرے اس چھوٹے سے میدان میں جتنے پھول کھلتے تھے اُن کا شمار ممکن نہ تھا..

یہ ایک زمینی آسمان تھا جس میں بے شمار زرد ستارے دمکتے تھے..

اور ہم ان ستاروں میں استراحت فرماتے تھے، ان میں ڈوبے جاتے تھے۔ زردی میں ایسے کہ یرقان کے مریض لگتے تھے..

آج فیصلے کا دن تھا..

بشیر نے بتایا تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ آج ہم درّہ دواریاں عبور کر کے رتی گلی کے علاقے میں داخل ہوں گے جہاں وہ جھیلیں تھیں.. آج فیصلہ ہونا تھا کہ وہ وہاں ہیں بھی یا نہیں.. تصور کے نہاں خانوں میں ایک مدت سے آویزاں محض خیالی تصویریں ہیں یا سچ مچ اُن کا وجود ہے..

پچھلی شب کی خیمہ گاہ سے نکلے تو خوش نظر ڈھلوانیں اوپر درّے تک اُٹھ رہی تھیں..

سلمان کے ٹٹو کی یہ خوشی کہ اب میں فارغ چلوں گا.. عارضی ثابت ہوئی کیونکہ اب اُس پر بشیر

براجمان ہو گیا تھا.. میں بھی کسی حد تک گھوڑے پر اطمینان سے بیٹھے رہنے کا عادی ہو گیا تھا.. خان سلیم کا گھوڑا بھی نہایت شریف النفس ہو چکا تھا اور میاں صاحب کی گھوڑی بڑے نخرے سے چلتی جاتی تھی.. ابھی ایک گھنٹے کی مسافت بھی طے نہ ہوئی تھی کہ ہم درے کے دامن میں پھیلے زرد زار میں آ نکلے.. اور یرقان کے مریض ہو گئے.. آگے اتنے پھول بچھے تھے کہ گھوڑے بھی سوچ میں پڑ گئے کہ ان پر قدم رکھیں یا ٹھہر جائیں..

ہم ٹھہر گئے..

میاں صاحب ہر کوہ نوردی کے دوران ایک دو مرتبہ بے اختیار منظر کو دیکھ کر ''سبحان اللہ'' کہہ اٹھتے ہیں.. اور یہاں بھی اُن کے ہونٹوں پر یہی ورد جاری ہوا اور ہم سب کی ترجمانی کی کیونکہ حیرت اور توصیف کے سوا اور کوئی اظہار ممکن نہ تھا.. اللہ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے.. اسی لیے وہ خوبصورتی تخلیق کرتا ہے تو جو لوگ اُس خوبصورتی تک پہنچنے کے شیدائی ہوتے ہیں، ظاہر ہے وہ انہیں بھی پسند کرتا ہے..

جس لمحے ہم پہاڑوں میں گھرے اس زرد شہر میں داخل ہوئے تو اُس لمحے اگر کوئی میری آنکھوں میں جھانکتا تو اُن میں بھی ایک زرد شہر آباد نظر آتا.. اس زرد دنیا میں مختصر قیام کے بعد جب ہم بادلِ نخواستہ وہاں سے رخصت ہوئے تو یکدم ایک ایسی عمودی چڑھائی سامنے آئی کہ گھوڑے جھجک گئے... اس چڑھائی پر چند بڑے بڑے پتھر اور کچھ جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان میں سے راستہ اوپر جاتا تھا.. یہ تقریباً ستر درجے کے زاویے پر تھی، صرف یہی نہیں بلکہ دو مقامات پر یہ نوّے درجے پر دکھائی دیتی تھی.. ایورسٹ کی چوٹی کے ذرا نیچے ایک عمودی چٹان ہے جس پر چڑھنے کے لیے پاؤں جمانے کی جگہ بھی نہیں ہے اور کئی کوہ پیما وہاں پہنچ کر ہمت ہار دیتے ہیں.. یہ عمودی چٹان ایورسٹ پر پہنچنے والے پہلے کوہ پیما ایڈمنڈ ہلیری کے نام پر ''ہلیری سٹیپ'' کہلاتی ہے.. ہمارے سامنے جو چڑھائی تھی اگرچہ ''ہلیری سٹیپ'' کے مقابلے میں بچوں کا کھیل تھی لیکن ہم بھی تو کوئی ہلیری نہ تھے، بچے تھے لیکن وہ بچے نہ تھے جو اس کے ساتھ کھیل سکتے..

''یہاں سے تو گھوڑا بھی گر سکتا ہے سلیم..''

''ابھی پہلے سامان کا گھوڑا چڑھے گا.... اگر وہ گرتا ہے تو پھر نہیں جائے گا..''

لیکن سامان کے گھوڑے گرتے پڑتے اوپر پہنچ گئے..

''آپ بس گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے بیٹھے رہو، میں لے جاؤں گا'' تو میں نے گھوڑے کی گردن پر جپھا مار لیا اور سلیم باگیں کھینچتا مجھے اور گھوڑے کو گھسیٹتا اوپر لے جانے لگا.. جہاں بالکل نوے درجے کے دو چار قدم تھے وہاں گھوڑے نے متعدد بار اُچھل کر اوپر جانے کی کوشش کی.. میں بھی اپنی کاٹھی سے بلند ہو کر خلاء میں معلق ہوا لیکن گھوڑے کی گردن سے چمٹے رہنے کی وجہ سے گرا نہیں.. بالآخر یہ مرحلہ طے ہو گیا..

اوپر پہنچنے پر یکدم بائیں جانب پہاڑوں کا ایک سلسلہ افق پر سفید ہوا.. یہ کیل کی برف پوش چوٹیاں تھیں.. ایک نامعلوم چوٹی کی برفیں زرد دھوپ میں الاؤ کی مانند زردی میں سلگ رہی تھیں.. جہاں ہم تھے وہاں سے کچھ نیچے چٹانوں میں گھری ہوئی ایک گلیشیئر جھیل دکھائی دے رہی تھی..

درّے کی چھت سامنے دکھائی دے رہی تھی اور اُس پر صرف آسمان تھا.. پتھروں کے انبار راستے کی رکاوٹ تھے لیکن ہمارے گھوڑے ان میں سے راستہ سونگھتے آسانی سے اوپر تک پہنچ گئے اور پھر ہم اُس کی چوٹی پر نمودار ہو گئے..

درّہ دواریاں کی بلندترین سطح پر پہنچ گئے..

''رتّی گلی کا منظر کھلا..اور خان گھوڑا قبر''

رتّی گلی کی وادی دھوپ میں پیلی ہو رہی تھی اور یہ دھوپ کی نہیں اعصاب کی لرزش کی پیلاہٹ تھی جو میرے چہرے پر پھیلتی تھی..

نشیب میں اُترتی وادی.سرسبز اور سرد ہوا کی مہک..کناروں پر پہاڑوں کے سروں پر برف کی سفید دستاریں.

میں اُس وادی میں اُترنے کو تھا جو نوجوانی کے کچے اور جذباتی دھندلکوں میں یوں اتری تھی کہ میرے دل کے آس پاس خواب منظروں کی ایک آرٹ گیلری سجائی تھی..مجھ اس میں اُتر کر جاننا تھا کہ کیا وہ سب تصویریں جو میرے بدن پر اتنے عرصے سے ثبت تھیں وہ کسی حقیقت کا پرتو ہیں یا میرے تصور کے برش نے اُن میں اپنے من پسند رنگ بھر دیے ہیں..

آج سے سینتالیس برس پیشتر میں اسی وادی میں اُترا تھا لیکن رتّی گلی چوٹی پار کر کے اور پھر اُن دور افتادہ پہاڑوں میں وادیٔ کشن گنگا کی جانب چلا گیا تھا..آج مجھے درّہ دواریاں کے راستے اس میں داخل ہونا تھا اور پھر مخالف سمت سے رتّی گلی چوٹی پار کر کے بوڑا وائی کی جانب سفر کرنا تھا..

یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اتنی دیر درّہ دواریاں کی چوٹی پر کھڑا رہوں..اپنے جذبات بیان کرتا رہوں اور اپنی جھیلوں کو نہ تلاش کروں..میری پہلی نگاہ نے ہی ایک بے چین پرندے کی مانند اُن کی جانب اڑان کی تھی..

میں نے جھیل دیکھ تو لی تھی لیکن ابھی میں اُس سے نظر چُراتا تھا..

خدشے تھے جو مجھے اُس سے نظر ملانے نہ دیتے تھے..

اُس کی سطح دھوپ میں دھوپ ہو رہی تھی، لشکتی تھی..جیسے پانی نہ ہو پارہ ہو..اور تب میں نے اُس سے نظر ملائی..

دائیں جانب وادی میں اُترتی ایک ڈھلوان کے دامن میں وہ جھیل تھی..پانیوں کا ایک معمولی جزیرہ تھا..نہ کناروں میں کوئی کشش نہ پس منظر میں کوئی حسن...بس ایک بڑا سارا تالاب سا تھا..آنسو جھیل اس سے کہیں خوبصورت تھی..میرا دل ڈوبنے لگا..

یہ تو شدید گڑبڑ ہو گئی تھی..یہ جھیل نہ تھی، ایک مایوسی تھی..

میں اپنے آپ کو کوسنے لگا..تارڑ صاحب آپ کیسے فریبی شخص ہو..اپنے ذہن کی اسمبلی لائن پر ایک خیالی جھیل مینوفیکچر کر لی..نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی عمر بھر اس کے فریب میں مبتلا رکھا..دواریاں ٹاپ سے نظر آنے والی اس روکھی پھیکی اور بے چہرہ جھیل کے نام پر اپنے آپ کو اور اپنے قارئین کو بلیک میل کرتے رہے..میں اُس لمحے ایسی شدید ذہنی اذیت اور مایوسی میں چلا گیا کہ اگر آس پاس کوئی کھائی ہوتی تو میں گھوڑے سمیت اس میں چھلانگ لگا دیتا..

بشیر بھانپ گیا کہ میں شاید خودکشی کا ارادہ کر رہا ہوں..''تارڑ صاحب یہ پہلی جھیل ہے..'' مجھے یاد تھا کہ رتّی گلی ٹاپ سے دو جھیلیں دکھائی دی تھیں..''دوسری تو ابھی اُن نیلی چٹانوں میں جو برف سے اٹی ہوئی ہیں اُن کے دامن میں پوشیدہ ہے..ہم تھوڑا نیچے اُتریں گے..وادی میں نہیں اُتریں گے دائیں جانب جو پہاڑیاں ہیں ان پر چلیں گے..تھوڑا چلیں گے تو دوسری جھیل نظر آنے لگے گی..''

چنانچہ میں نے جس امید کا دامن یکسر چھوڑ دیا تھا، اُسے پھر سے سختی سے تھام لیا..

مایوسی کو وقتی طور پر رخصت کر دیا..

لیکن کچھ پتہ نہ تھا کہ دوسری جھیل بھی اس بے چہرہ جھیل کی بڑی بہن ہو..اُس نے ہونا تو اسی وادی میں تھا..اسی پس منظر میں اور انہی ڈھلوانوں میں تو یہاں تو امکانِ حسن کم کم تھا..

مجھے یاد تھا کہ رتّی گلی ٹاپ سے دو جھیلیں دکھائی دی تھیں..ایک میں راج ہنس تیرتے تھے یعنی گمان ہے کہ تیرتے تھے اور دوسری جھیل جو اب میری نظروں کے سامنے تھی، یہ بھی تو ٹاپ سے بہت ہی سحر انگیز اور دُھند میں گم خوابناک نظر آتی تھی..اور اب کیا تھی؟ اب یہ تھی..یہ یقیناً جوانی کے خمار کی دُھند اور جھیلوں پر چھائی موسمی دُھند کا کرشمہ تھا کہ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی..

دوسری جھیل نے بھی سینتالیس برس بعد دن کی دھوپ میں یہی ہونا تھا.. ہم دواریاں ٹاپ سے جیسے پچھلے دو دروں سے نیچے نشیب میں اُتر جاتے تھے ایسے نہیں اُترے بلکہ دائیں ہاتھ پر جو پہاڑ اُس نامراد جھیل کے متوازی تھے اور اُن میں ایک بالشت بھر کی پگڈنڈی گھاس میں پوشیدہ تھی اُس پر رواں ہو گئے.. یعنی ہم اور ہمارے گھوڑے..

پہلے تو ہم اطمینان سے چلتے گئے کہ آس پاس سبزہ تھا.. ٹیلے تھے اور اُن کے درمیان میں ہم اطمینان سے سفر کرتے تھے لیکن یکدم دائیں ہاتھ پر یہ سب کچھ معدوم ہو گیا اور اُس کی جگہ وادی کے فرش تک گرتی ایک کھائی کی ہولناکی ہمیں سراسیمہ کرنے لگی.. یعنی دائیں جانب بس خلاء تھا.. صرف ایک بار نیچے دیکھا اور پھر دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ رہی.. پہاڑوں میں اکثر اس نوعیت کے وقوعے ہوتے رہتے ہیں کہ ابھی آپ ایک ہری بھری وادی میں چل رہے ہیں اور اگلے لمحے کسی گلیشیئر سے ایک کلومیٹر بلندی پر یکدم معلق ہو گئے ہیں..

ہم اور ہمارے گھوڑے وہ بیوقوف پرندے تھے جو میدانوں کی بجائے بے دھیانی میں کسی بلند ترین چٹان کی نوک پر اُتر آئے تھے جہاں اُترنے کی گنجائش ہی نہ تھی.. اگرچہ اُس گرتی ہوئی پہاڑی ڈھلوان پر ایک راستہ تو تھا جس پر کوئی نہ کوئی تو چلتا ہوگا اور یقیناً کچھ مافوق الفطرت عناصر ہی اُس پر قدم رنجہ فرماتے ہوں گے کہ اس کی چوڑائی بالشت بھر بھی نہ ہوگی اور وہ بھی کسی نوزائیدہ بچے کی بالشت..

میرا ڈر اور ڈرپوکی اپنی جگہ لیکن میں اپنے گھوڑے کی قابلیت کا قائل ہوا جاتا تھا اُسے سات سلام کرتا تھا کہ وہ کیسے اُس بالشت بھر راستے پر اپنے پاؤں رکھتا بھی ہے اور اٹھاتا بھی ہے.. یوں جانئے کہ گھوڑا خلاء میں معلق ایک قدرے چوڑے رسّے پر چلتا تھا..

اس آسمان سے گرتے پل صراط پر چلتے ہوئے خان سلیم کے گھوڑے نے جو میرے گھوڑے کا رہنما تھا اُس کے آگے چل رہا تھا ایک مقام پر یہ مناسب جانا کہ یہی تو وہ مناسب مقام ہے جہاں مجھے اپنے کرتب دکھانے ہیں۔ چنانچہ وہ جان بوجھ کر بے راہروی کا شکار ہوا اور صراط مستقیم ترک کر کے نہایت والہانہ انداز میں تھوتھنی ہلاتا اوپر جانے لگا.. کبھی لڑھکنے سے بچتا.. پھسلتا ڈولتا بلندی کی جانب مائل سفر ہو گیا.. خان سلیم نے حیرت انگیز طور پر ہمیشہ کی طرح شور نہ مچایا.. دوہائی نہ دی کہ جانے نہ پائے.. پکڑلو.. اوئے گھوڑے کیا کر رہا ہے.. تارڑ صاحب اسے

سمجھائیں.. اوئے گھوڑے تیری میں ماں کو... اس طرح کا شور نہ مچایا بلکہ مُہر بلب رہا.. کیونکہ اُس نے اپنے تمام تر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اس حقیقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ اب اس گھوڑے کے ہمراہ اُس نے بہر طور وادی میں گر جانا ہے.. اور اُس کا انجام یہی ہونا ہے کہ وادی رتّی گلی میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی قبر ہو گی جو ”خان گھوڑا قبر“ کہلائے گی جیسے ہری پور کے نزدیک ”کھوتا قبر“ ہے اور یہ بھی مرجع خلائق ہو گی.. مقامی لوگوں کے علاوہ اس بزرگ کے یاران لاہور، ملتان، اسلام آباد اور جانے کہاں کہاں سے آئیں گے اور عرس مبارک میں شریک ہو کر گریہ کرتے دھمالیں ڈالیں گے.. کہ عجب آزاد مرد تھا.. گھوڑے نے اُسے آزاد کر دیا..

جونہی خان سلیم کے گھوڑے نے ہمارے تئیں سفر آخرت اختیار کیا سب لوگ چپ ہو گئے اور اُسے دیکھنے لگے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے..

بہرحال شاید یہ خان سلیم کی مکمل خاموشی تھی یا مکمل صبر تھا جو گھوڑے کو پسند آ گیا اور وہ رضاکارانہ طور پر پھر سے راہ راست پر آ گیا..

اب میں اپنے آگے ٹھک ٹھک چلتے خان سلیم کے گھوڑے پر کڑی نظر رکھتا تھا.. جیسے میری نظر اُسے راہ راست سے بھٹکنے سے باز رکھے گی.. تب میں نے ایک ایسا عقل کو غتر بود کر دینے والا منظر دیکھا.. یعنی خان سلیم کے گھوڑے پر کڑی نظر رکھتے ہوئے دیکھا کہ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ میں اپنے حواس میں نہیں ہو سکتا.. صرف خوف ہے اور بلندی کا اثر ہے جو مجھے ایسے شعبدے دکھاتا ہے.. ایسے کرتب میری آنکھوں کے سامنے لاتا ہے..

میں نے دیکھا.. اور میں ابھی تک اس اچنبھے میں مبتلا تھا کہ اس بالشت بھر کی پگڈنڈی پر ہم سب کے گھوڑے اپنے چاروں سُم کیسے جماتے ہیں اور پھر کیونکر اُٹھا بھی لیتے ہیں اور چلتے جاتے ہیں کہ میں نے دیکھا.. کہ خان سلیم کا گھوڑا چلتے چلتے اپنی پچھلی دو ٹانگوں میں سے ایک کو پگڈنڈی سے اُٹھا کر تا دیر خلاء میں معلق رکھتا ہے اور اس دوران بقیہ تین ٹانگوں کے سہارے چلتا بھی جاتا ہے اور پھر ایک مختصر وقفے کے بعد جب اُسے اتنی جگہ میسر آ جاتی ہے جس پر وہ اپنی خلاء میں معلق لہراتی ہوئی ٹانگ جما سکے.. اُسے جما لیتا ہے اور نارمل حالت میں چوپایہ ہو جاتا ہے یعنی چاروں ٹانگوں پر رواں ہو جاتا ہے..

پہلے تو میں اسے محض اتفاق سمجھا.. لیکن یہ تو اُس کا معمول تھا..

دراصل مجھے کچھ پروا نہ تھی کہ خان سلیم کا گھوڑا بے شک دو ٹانگوں پر چلتا جائے.. کسی ککی ایرانی سرکس کے کرتب دکھاتا رہے بلکہ مجھے تو یہ تشویش سراسیمہ کر رہی تھی کہ اگر خان سلیم کا گھوڑا اس مختصر پگڈنڈی پر چلتا یہ حرکت کر رہا ہے تو یقیناً میرا گھوڑا بھی یہی شغل کر رہا ہوگا..

اور میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ مڑ کر دیکھتا کہ وہ کیا کر رہا ہے.. وہ یقیناً وہی کر رہا تھا جو خان سلیم کا گھوڑا کر رہا تھا. یعنی میں بھی ایک ایسے چوپائے پر سوار تھا جو تنگ دامنیٔ پگڈنڈی کے باعث سہ پایہ بھی ہو جاتا تھا..

''رتی گلی جھیل نظر آنے پر میں چیختا ہوں.. میں سچ کہتا تھا''

اس جان لیوا بھی اور مزاحیہ بھی. صورت حال میں وہ کچھ نظر آ گیا جس نے واقعی میری جان لے لی..

مجھے سینتالیس برس پیشتر والی رتی گلی جھیل اور اُس میں تیرتے راج ہنس نظر آ گئے..

رتی گلی کی وادی میں.. ہم جہاں تھے اُس کے پار.. بلند نیلی چٹانوں کی سنگلاخی کے دامن میں.. وادی کے نشیب سے اونچی نیلی چٹانوں کی آغوش میں.. سبزے سے نچڑتی ہوئی ڈھلوانوں.. ایسا سبزہ جو دِن کی دھوپ میں بھی سیاہ ہو رہا تھا.. برف کے انباروں کے دامن میں چھپی ہوئی. شرماہٹ سے روپوش ہونے کی کوشش میں ایک جھیل کے نیلے پانی اور وہ بھی سیاہی مائل ہو رہے تھے، نظر آنے لگے اور اُن نیلگوں اپنی نیلاہٹ میں گہرے ہونے کے باعث سیاہ ہوتے ہوئے پانیوں کی سطح پر برف کے تودے راج ہنس تیرتے تھے..

جوں جوں ہمارے گھوڑے آگے ہوتے جاتے تھے، وہ جھیل نمایاں ہوتی بڑی ہوتی ظاہر ہوتی چلی جاتی تھی..

یہ آج تک میری دیکھی ہوئی کسی بھی جھیل کی مانند نہ تو کسی وادی کی آغوش میں تھی.. نہ پہاڑوں کے دامن میں تھی.. بلکہ ایک خاص بلندی پر نیلی چٹانوں اور برفوں میں ایسے روپوش تھی کہ جب ظاہر ہوتی تو اپنے آپ کو مکمل طور پر ظاہر نہ کرتی تھی..

یہ خوابوں اور خیالوں سے بھی کہیں بڑھ کر سحر انگیز اور حسن طراز تھی کہ ہر خواب اور ہر

خیال کی کوئی حد ہوتی ہے..اس کی کوئی حد نہ تھی..آپ جاننا تو چاہیں گے کہ اُس لمحے جب وہ نظر آئی تو میرا کیا ردعمل تھا..میں نے کسی سے کچھ کہا..کسی کو کو شریک کیا تو کیا کہا..میں نے کسی سے بھی کچھ نہ کہا........بلکہ ایک سرپھرے دیوانے کی مانند جو کہ میں تھا، میں نے تقریباً چیخ کر گھوڑے کی پشت سے ذرا اُٹھ کر..جو میرے آگے چلتے تھے اور جو میرے پیچھے آتے تھے وہ میری اُس آواز کی زد سے باہر تھے تو میں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا..''آئی واز رائٹ...میں سچ کہتا تھا..میں سچ کہتا تھا..''

میں فریبی اور دھوکے باز نہیں تھا..جذبات کا بلیک میلر نہیں تھا..میں سچ کہتا تھا..اُن سب نے جو میرے آگے آگے جاتے تھے، پلٹ کر دیکھا تو ایک حواس باختہ عمر رسیدہ کوہ نورد کو چیختے اور بے تحاشا مسکراتے دیکھا..

میری سچائی ثابت ہو گئی تھی..

ایک کچے ٹین ایجر کی نظروں نے آج سے سینتالیس برس پہلے جو کچھ دیکھا تھا اپنی مخمور اور رومانی آنکھوں کے فریب میں جو دیکھا تھا وہ آج سچ ثابت ہو گیا تھا..جیسے ازمنۂ قدیم میں کسی ایک شخص کو عرفان حاصل ہوتا تھا کہ سچائی کیا ہے اور اذن ہوتا تھا کہ بستی والوں کو خبر کر دو کہ سچ کیا ہے اور وہ شخص حکم کی تعمیل میں خبر کرتا تھا اور بستی کے باسی نہیں مانتے تھے، اُس کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ وہ شخص بھی شک میں چلا جاتا تھا اور تب کوئی معجزہ جنم لیتا تھا جو ثابت کر دیتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے..

رتی گلی کی یہ جھیل بھی ایک معجزے کی مانند جنم لے رہی تھی..

یہ جھیل..جھیلوں کی جھیل تھی..

بہت فاصلے پر..وادی کے پار نیلی چٹانوں اور برف کے انباروں میں سے چھب دکھلاتی تھی اور ہمارے دل موہ لیتی تھی..ایسی ساحرہ تھی..

نہ تو میں اپنی جوانی کے خمار کی حمایت کر رہا ہوں..نہ جانبدار ہو رہا ہوں..

بے خطر بغیر کسی اختلاف کے ڈر سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک میں جتنی بھی جھیلوں کے کناروں پر خیمہ زن ہوا ہوں، یا دور سے اُن کو دیکھا ہے..اس موجودہ کوہ نوردی کے دوران..لُولُوسر..دُودی پت اور سرال اور ماضی کی جتنی بھی پہاڑوں کی آوارگیاں تھیں ان کے

دوران بے شک..کچورا..صد پارہ..سیف الملوک..راما..نانگا پربت..کرومبر..حنا..کینجھر وغیرہ کو دیکھا..لیکن وہ سب کی سب اس جھیل کے سامنے ہیچ تھیں..اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں کہ اُن کے دامن میں ایسے پانی تو نہ تھے..

شاید یہ فاصلوں کا کرشمہ تھا..

اسے جب میں نے پہلی بار دیکھا تو دور سے دیکھا..

اب دیکھ رہا تھا تو بھی درمیان میں فاصلے تھے..

اس کا حصول ناممکن نظر آ رہا تھا..

اور جو حاصل نہ ہو سکے وہی سب سے خوبصورت ہوتا ہے..

وصل کی ہوس ہی بدن کو حُسن عطا کرتی ہے..

وصل ہو جائے تو حسن ماند پڑ جاتا ہے..

یہ صرف میں نہ تھا جو اُس کی گرفت میں آ چکا تھا..میرے ہمراہی بھی اس جھیل کے ظاہر ہونے کے بعد گنگ ہو گئے تھے..بولتے نہ تھے..مسکراتے تھے اور میاں صاحب مجھے دیکھتے تھے اور بار بار ''سبحان اللہ'' کہتے تھے..

میاں صاحب کے علاوہ میؔر صاحب نے بھی تو کہا تھا کہ..

وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میؔر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ..

تو میرا جی بھی کیا کیا کچھ چاہتا تھا لیکن وصل نصیب میں نہ تھا..

وصل جکڑا ہوا تھا شیڈیول کی زنجیروں میں..میں تنہا ہوتا تو ان زنجیروں کی چنداں پروا نہ کرتا..بندہ جس محبوب سے وصل کے خواب سینتالیس برس دیکھے اور پھر ایک روز وہ سامنے آ جائے تو وہ آنکھ چرا کر نکل جائے تو وہ نامرد ہوا ناں مرد تو نہ ہوا..صرف ایک دن کی بات تھی..شیڈیول میں صرف ایک دن کے اضافے سے میں اُس تک پہنچ سکتا تھا لیکن یہ دن تصور جاناں کیے ہوئے فرصت کے رات دن نہ تھے..غم روزگار میں جکڑے ہوئے رات دن تھے..ہم میں سے ہر ایک نے ایک مخصوص دن غم روزگار کی خدمت میں حاضر ہو کر غلام ہونا تھا..کسی کی کوئی ہائی لیول میٹنگ تھی نیویارک میں..کسی نے ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا اور کسی نے کسی واہیات ٹیلی ویژن شو

کی ریکارڈنگ کے لیے بہرطور ایک طے شدہ تاریخ کو کراچی پہنچنا تھا..

اس عالم مایوسی نے میاں صاحب نے میری اور شاید اپنی بھی ڈھارس بندھائی ''چھوڑو جی تارڑ صاحب.. یہ بھی کیا کہ بندے کی ہر خواہش پوری ہو جائے اور اُس کے پاس خواہش کرنے کے لیے کچھ نہ بچے.. کوئی ایک خواہش تو ادھوری رہنی چاہیے..''

ہاں.. میں نے آپ کو ڈھارس دی... اس خواب کو ادھورا ہی رہنے دو.. کیا پتہ اس کے کناروں پر پہنچ گئے.. اپنا خیمہ لگایا تو وہاں وہ کچھ نہ ہو جو یہاں سے نظر آ رہا ہے.. اس فاصلے سے دکھائی دے رہا ہے.. تو اسے ادھورا ہی رہنے دو..

وصل ہوس کو ختم کر دے گا.. ہوس سنبھال کے رکھ لو، وصل رہنے دو..

بشیر کہہ رہا تھا.. ''صاحب میں گیا ہوں.. عجیب پراسرار جھیل ہے.. نہ اس کے پانی کہیں اوپر سے آ کر اس میں داخل ہوتے ہیں اور نہ کوئی ندی نالہ اس میں سے برآمد ہوتا ہے.. اس کے اندر چشمے ہیں جو پھوٹتے رہتے ہیں اور رات کے وقت ان کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی رہتی ہے.. گلیشیئر بھی رات کی تاریکی میں اس میں گرتے ہیں تو عجیب آوازیں آتی ہیں...''

ہمارے گھوڑے چلتے جاتے تھے اور ہماری گردنیں اکڑ چکی تھیں کہ ہم بائیں جانب وادی کے پار چٹانوں میں نمودار ہوتے نیلگوں اور برفانی سحر کو تکتے چلے جاتے تھے... جھیل نے کبھی بھی اپنے آپ کو ہم پر مکمل طور پر عیاں نہ کیا.. اُس کا کچھ حصہ نیلی چٹانوں کے عقب میں چلا جا رہا تھا اور دکھائی نہ دیتا تھا..

نہ ہم پورٹروں کی گفتگو سُن رہے تھے اور نہ ہم دیکھ رہے تھے کہ ہمارے گھوڑے کہاں قدم رکھتے ہیں.. کھائی کے کنارے پر تین پاؤں سے چلتے ہیں یا کسی میدان میں اطمینان سے رواں ہیں.. پورٹر اور گھوڑے اپنا وجود کھو چکے تھے اور ہم میں سے ہر ایک تنہا جھیل کو دیکھتا تھا.. میاں صاحب کے لیے میں اور سلیم نہ تھے.. بس وہ خود تھے ''سبحان اللہ'' کا ورد کرتے.. سلیم میاں صاحب اور مجھ سے غافل تھا اور میں.. میں تو اُس سے بھی غافل ہو رہا تھا جس نے اس جھیل کو تخلیق کیا تھا..

جھیل ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہی.. وادی کے پار ایسے چلتی رہی جیسے وہ بھی ایک مدت سے ہماری قربت کی آرزومند تھی.. ہم تک آنا چاہتی تھی.. وادی کے پار ہمیں حسرت سے جاتا دیکھتی تھی اور وہ بھی اپنی تہہ میں سے پھوٹنے والی چشموں.. سطح پر تیرتے راج ہنسوں اور نیلگوں

چٹانوں کے شیڈیول میں جکڑی ہوئی تھی، ہمارے پاس نہیں آ سکتی تھی..

تب بلند چٹانوں میں سے جھیل میں گرتی ایک آبشار بھی تو دکھائی دیتی تھی جس کے پانیوں تلے جب ایک راج ہنس آ نکلتا تھا تو اُن کے زور کی زد میں آ کر پھسلتا ہوا دور نکل جاتا تھا..

آج وہ آبشار دکھائی نہ دیتی تھی.. شاید خشک ہو چکی تھی..

وہ ہمارے برابر میں وادی کے پار اپنے جادوئی حسن کی شعاعیں پھینکتی ہمیں شکار کرنے کی کوشش کرتی رہی..

ہم اُس کے دام میں گرفتار ہو جانا چاہتے تو تھے لیکن ہمارے پاس وقت نہ تھا..

وہ جھیل آئیونین سمندر کے درمیان اُبھرے اُس سفید جزیرے کی مانند تھی جس میں سائرنز نامی جادوگرنیاں بسیرا کرتی تھیں.. اپنے مدھر نغموں سے جزیرے کے قریب سے گذرتی کشتیوں کے ملاحوں کو مسحور کر کے اُنہیں کشتیوں سے چھلانگیں لگا کر اپنے حسین بدنوں تک پہنچنے اور اُن سے ملاپ کرنے کے لیے مجبور کر دیتی تھیں.. اور پھر اُن ملاحوں کی لاشیں جزیرے میں بکھر جاتی تھیں کہ وہ جس سے ملاپ کرتی تھیں وہ تاب نہ لا کر مر جاتا تھا..

صرف اوڈیسیس تھا جس نے اُن کے گیت سنے اور پھر بھی زندہ رہا..

اُس نے اپنے آپ کو ایک مستول سے باندھ لیا اور اپنے ساتھیوں کے کانوں میں گرم موم اُنڈیل دی تا کہ وہ سائرنز کے نغمے سُن کر بے اختیار ہو کر سمندر میں نہ کود پڑیں اور اپنی جان کھو بیٹھیں.. اور جب سائرنز گیت گانے لگیں تو اوڈیسیس اپنے رستے تڑانے لگا کہ وہ اپنے انجام سے بے پروا اُن حسیناؤں کی آغوش میں چلا جانا چاہتا تھا.. اپنے ساتھیوں سے فریاد کرتا تھا کہ مجھے کھول دو لیکن ساتھیوں کے کانوں میں موم پگھلی ہوئی تھی اور وہ اُس کی فریاد سُن نہ سکتے تھے..

تو میں بھی ایک اوڈیسیس ہو چکا تھا.. رتّی گلی جھیل کی سائرن کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن شیڈیول کے رسّوں سے بندھا ہوا مجبور تھا... اُس کے مدھر نغمے.. نیلے پانیوں کے گیت۔ راج ہنسوں کے طلسم، اُس کی تہہ میں سے پھوٹنے والے چشموں کی بڑبڑاہٹ.. اُس کے پانیوں میں گرتے برفانی تودوں کی گونج اور اُس کی بلند نیلی چٹانوں والی آغوش کے بلاوے پہنچے آتے تھے.. اور میں اپنے گھوڑے پر سوار اُسے دیکھتا اُس کے وصل کو ترستا دھیان نہ کرتا تھا.. نامرد ہو چکا تھا.. ایک مرد کو کیا پروا کہ وصل کے بعد وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں.. میرے دونوں ساتھی بھی اُس کے

جادوئی حسن کی گہری نیلاہٹ کی یکتائی کے اسیر تو ہوئے تھے..اُس تک پہنچنے کے لیے تڑپے تو ضرور تھے لیکن اب اپنے دھیان میں گم رتّی گلی چوٹی کے دامن تک جاتے تھے..ظاہر ہے اُن کا عشق تو ابھی پل دو پل پہلے شروع ہوا تھا وہ بے دھیان ہو سکتے تھے لیکن میرا تو سینتالیس برس کا ناطہ تھا..اس کے حسن کے ریشمی دھاگوں میں ایک مدت سے اُلجھا ہوا تھا۔ میں تو ایک پل کے لیے بھی بے دھیان نہیں ہو سکتا تھا..میں اُسے ایک دیوانے کی مانند تکتا چلا جاتا تھا..

منہ کھولے جس دیوانے کو آس پاس کی کچھ خبر نہ تھی..اس کی رال بہتی تھی..اُس کا بس چلتا تو شیشے کے ایک ٹکڑے سے اپنی شہ رگ کاٹتا چلا جاتا اور اُسے کچھ خبر نہ ہوتی..درد نہ ہوتی..بس شیڈیول کے ہاتھ اُس کے ہاتھ روکتے تھے کہ اپنے آپ کو مت ہلاک کرو..

ویسے میں اگر دیوانہ تھا تو ایک ہوشیار دیوانہ تھا..اس جھیل کی عشق آتش میں ایک مدت سلگنے کے باوجود اب جب کہ وہ اختیار میں تھی اپنے شیڈیول کو مدنظر رکھتا تھا، اپنے ساتھیوں کو ترک کر کے اُس تک نہ جاتا تھا تو کیسا دیوانہ تھا..ایک ہوشیار تھا..

جھیل دھیرے دھیرے چٹانوں میں روپوش ہو رہی تھی..اور ہم اُس سے دور ہوتے جا رہے تھے..دائیں ہاتھ پر رتّی گلی ٹاپ کی جانب ہوتے جا رہے تھے..

''رتّی گلی گمشدہ''

رتّی گلی چوٹی کا دامن آ گیا اور ہم ستانے کی خاطر رُک گئے..

گھوڑوں سے اُتر گئے..

یہاں سے ہم رتّی گلی کی چوٹی دیکھ سکتے تھے..

وہ اُن زمانوں میں برفوں سے بھری ہوتی تھی..دُھند میں گم ہوتی تھی اور آج دھوپ میں نمایاں ایک بنجر چٹان نظر آ رہی تھی..

جہاں اُس جھیل میں گرنے والا آبشار گم ہوا وہاں رتّی گلی کی برفیں بھی گم ہو چکی تھیں..

میں نے اُن گئے وقتوں میں بوڑاوائی سے رتّی گلی چوٹی تک سفر اختیار کیا تھا اور اب بالکل مخالف سمت سے سفر کرتا اُس کے دامن میں پہنچ گیا تھا..اسے عبور کر کے مجھے بوڑاوائی تک جانا تھا..

چوٹی پر ہمیں ایک ہجوم سا دکھائی دیا..

شاید وہ کوہ نورد تھے..اور بے شمار تھے..

ہم اُن کا انتظار کرنے لگے کہ وہ نیچے آئیں تو ہم اُن سے سفر کا حال پوچھیں..

کچھ اُن کی سنیں کچھ اپنی سنائیں..

جب وہ چوٹی سے اُترے تو کوہ نوردوں کی مانند ایک خاص ترتیب سے نہ اُترے بلکہ پہاڑی بکریوں کی طرح اُچھلتے کودتے..پتھر ٹاپتے بکھرے ہوئے اُترنے لگے..

اُن میں کچھ شوخ و شنگ لباسوں میں ڈھکی خواتین بھی تھیں..

وہ ایک بارات تھی..چلبلی مسرت کی رنگینی میں ڈوبی رتّی گلی کی چوٹی سے اُترتی ایک

بارات تھی..دولہا وادی کاغان کے کسی گاؤں کا تھا جو رتی گلی کے پار آزاد کشمیر میں دواریاں کے آس پاس کسی کوہستانی بستی میں منتظر کسی دوشیزہ کو بیاہنے جا رہا تھا..

وہ ہمارے آس پاس سے گزر گئے..مردوں نے تو ہمیں نہایت دلچسپی سے دیکھا اگرچہ ہم کلام ہونے کی زحمت نہ کی اور وہ عورتیں جو بکریوں کی مانند گودتی چلی آ رہی تھیں..انہوں نے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے گھونگھٹ نکال لیے..ہم سے ذرا دور ہوئیں تو پھر سے بکریاں ہو گئیں.....بے پروا ہو گئیں..شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں..

آس پاس رتی گلی کی چوٹی کے دامن میں سبزہ تو تھا..پتھر تھے..کچھ ڈھلوانیں تھیں..اور جب میں بھی اس رخصت شدہ بارات کی مانند چوٹی سے اُترا تھا تو تاحد نظر گل لالہ کھلے تھے جن کے درمیان میں ایک سفید ندی بہتی تھی اور اس ندی کے پار مجھے رتی گلی جھیلیں دکھائی دی تھیں تو وہ گل لالہ کے تختے اور پارہ صفت تیز ندی کہاں تھی؟

میرے آس پاس تو نہ تھی..

اور مقام بھی یہی تھا جس میں میں اُترا تھا..

اُس آبشار کی مانند..جیسے رتی گلی کی چوٹی پر برفیں بھی نہ تھیں..ایسے گُل لالہ کے تختے بھی نہ تھے اور ندی..وہ بھی شاید خشک ہو چکی تھی..

جہاں..چوٹی کے دامن میں جہاں ہمارے گھوڑے ہمارے بوجھ سے آزاد چرتے تھے اور ہم اپنی تھکن اُتارتے تھے وہاں...

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا..

میں ستم ہائے شیڈیول کا رہین ستم تو رہا لیکن اُس کے خیال سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوا..اُس کی جانب تکتا رہا..اگرچہ اُس کا چہرہ چٹانوں کی اوٹ میں چھپتا جاتا تھا..وہ بہت پیچھے رہ گئی تھی..منہ موڑ کر بہت پیچھے رہ گئی تھی کہ اُس نے جان لیا تھا کہ یہ منافق قسم کے دیوانے ہیں..میرے فراق میں سینتالیس برس تک آہیں بھرتے رہے ہیں اور اب ایسے فریبی ہیں کہ بیگانے ہوئے جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد مجھ سے منہ موڑ کر رتی گلی کے پار اُتر جائیں گے..

رتی گلی ٹاپ تک کی چڑھائی اگرچہ خوب چڑھائی تھی لیکن پھر بھی مشکل نہ تھی..بلکہ سرال اور نوری ناڑ کی نسبت معمولی تھی..

چوٹی پر پہنچے تو وہ ایک نوجوان بیوہ کی مانند اجڑی ہوئی اور بنجر پڑی تھی..میں ایک مرتبہ پھر اُس سرخ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا..

میرے پاؤں تلے برف نہ تھی..خشک سنگریزے تھے اور نہ ہی میں دُھند میں روپوش تھا بلکہ اس بلندی پر جو دھوپ تھی، اُس میں عیاں اور برہنہ کھڑا تھا۔

یقیناً یہاں وہ چند سنگریزے ابھی تک موجود ہوں گے جن پر ایک ٹین ایجر کوہ پیما کے لنڈے بازار سے خرید ہوئے فوجی بُوٹ بوجھ ہوئے ہوں گے۔یقیناً..

پورے سینتالیس برس بعد پھر اُسی مقام پر..

ان برسوں میں پُلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا..بلکہ اب تو بہاؤ میں کمی آ رہی تھی..آثار تھے ہمیشہ کے لیے تھم جانے کے..زندگی کی ندی خشک ہونے کے دن قریب ہو رہے تھے..

پھر اُسی مقام پر..

اور میں نے تعین کیا کہ دوسری جانب سے چڑھتے ہوئے..ایک چرواہے کے جھونپڑے میں رات گزارنے کے بعد جو برفوں میں گھرا تھا، جب ہم چوٹی پر واقع ایک ہموار جگہ پر پہنچے تھے تو میں کہاں کھڑا تھا..گروپ فوٹو کہاں اُتروائی تھی..دائیں جانب اسی بلندی کا ایک حصہ جو سرخ چٹان کی صورت میں اس ہموار جگہ سے ذرا بلندی پر واقع تھا تب میں کس سپاٹ پر کھڑا اُسے تکتا تھا..اور میں وہیں کھڑا ہوا..اگرچہ تب میرے پاؤں تلے ازلی برفیں تھیں، دُھند اتنی گھنی اور شدید کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور سردی برداشت سے باہر رگ و پے میں اُترتی تھی پھر بھی خون کو سرد کرنے میں ناکام ہوتی تھی کہ خون جوان تھا..موٹے فوجی سویٹر پہنے مفلر لپیٹے..آرمی بوٹ میں..سیاہ چشمے چڑھائے، آئس ایکس برف میں جمائے جب ہم وہ بلیک اینڈ وہائٹ تصویر اُترواتے تھے تو وہ کوئی اور ہی رتی گلی تھی...یہ نہ تھی..

اب تو اُس پر دُھوپ ڈھلتی تھی..خشک اور ویران..

شاید زندگی کی دُھوپ ڈھلتی تھی اور یہ سینتالیس برس کی زندگی کی لاحاصلی کی ویرانی تھی..

شاید گلوبل وارمنگ نے رتّی گلی کو یوں گرم اور ویران کر دیا تھا..

یہیں میرے برابر میں جاوید اثر کھڑا تھا..

اور اُن دنوں جب میں رتّی گلی تک دوبارہ پہنچنے کے منصوبے بنا رہا ہوں..اُس کی سوچ اور خواہش میں غرق ہوں.. پُرانے دنوں کو یاد کر رہا ہوں تو اُنہی دنوں..اُس کی بہن سلمٰی بیگ کا فون آ جاتا ہے کہ مستنصر بھائی، جاوید بھائی امریکہ سے آئے ہوئے ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں، اُنہیں کینسر ہو گیا ہے اور وہ کہتے ہیں میں مرنے کے لیے پاکستان آ گیا ہوں..ڈاکٹروں کی مُہلت تو ختم ہو گئی لیکن عجیب معجزہ ہوا ہے کہ پاکستان آنے کے بعد اُن کی طبیعت سنبھل گئی ہے..وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں..مرنے سے پہلے..

کیا یہ ایک کھیل تماشا نہیں ہے کہ سینتالیس برس پیشتر میرے برابر میں کھڑا جاوید اثر اُنہی دنوں مرنے کے لیے پاکستان آتا ہے جن دنوں میں رتّی گلی کی جانب سفر کا ارادہ کرتا ہوں..

یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے جاوید سے ملنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن ہماری ملاقات کی کہیں منظوری نہ ہو سکی اور ہم نہ مل سکے..

میں نے سلمٰی سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح جاوید کو خبر کر دے کہ میں پھر رتّی گلی جا رہا ہوں اور وہاں تمہیں یاد کروں گا..

اور میں اُسے یاد کرتا تھا..لیکن نہیں جانتا تھا کہ وہ اُس لمحے کس حال میں ہے..ہے بھی یا نہیں!اور وہ نہیں تھا!

میرے ساتھی رتّی گلی ٹاپ پر پہنچ کر مجھ سے زیادہ خوش نہ تھے کہ میں نے اس کی دُھند بھری برف بلندیوں کے حسن کی جو داستانیں اُنہیں سنائی تھیں سب کی سب باطل ثابت ہو رہی تھیں..

میں خود بجھ گیا تھا..میرے پاس اگر ماضی کے لمحے نہ ہوتے تو میں اس کی بے رُوح ویرانی اور دھوپ میں ایک لمحہ نہ ٹھہرتا..

یہاں سے دوسری جانب اُتر جانا ہی بہتر تھا..

جہاں سے میں بلند ہو کر اوپر آیا تھا اب وہاں سے نشیب میں اُتر جانا تھا..اور پھر پہلی بار میں نے رتّی گلی کے پار جو وسیع وادی پھیلی ہوئی تھی اُس کی ہریاول، ندیوں اور اُسے گھیرے میں لیے ہوئے برف پوش پہاڑوں پر ایک نظر کی..

اور نظر کی اُس گلیشیئر پر جو دوسری جانب رتّی گلی کے دامن میں پھیلا..جس کی برفوں میں وہ جھونپڑا تھا جس میں ہم نے رات بسر کی تھی..بہت گہرائی میں پھیلا ایک گلیشیئر سفید کوبرے کی مانند خاموش ہمیں اپنے شکار کے رُوپ میں تکتا تھا..

اترائی..چوٹی سے..یکلخت تھی..

تمنا کا پہلا قدم خلاء میں اٹھتا تھا اور خلاء میں ہی گرتا تھا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جا سکتا تھا..اتنی زبردست اُترائی تھی..

ہم یہاں سے اُترنے کے لیے گھوڑوں کے قدموں پر ہرگز انحصار نہیں کر سکتے تھے..اگرچہ اُن کے سُم ہمارے پاؤں کی نسبت زیادہ متوازن تھے..لیکن ہم نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا کہ اگر گرنا ہے تو اپنے پاؤں پر سے گرنا ہے..گھوڑے کے ہمراہ گلیشیئر پر نہیں گرنا ہے..

ان بھولے جانوروں کو ترک کر دینے کی ایک اور وجہ بھی تھی..

پورے ٹریک کے دوران سلیم، اورنگزیب اور دیگر گھوڑا والے مسلسل دانت نکالتے خوش ہوتے یہ قصہ بیان کرتے چلے آئے تھے کہ کیسے وہ ایک مرتبہ چند گورا لوگ کو اسی راستے پر چلتے ہوئے رتّی گلی ٹاپ تک لائے تھے اور کیسے جب دوسری جانب اُترے تھے تو ایک گھوڑا قلابازی کھا کر نیچے گلیشیئر پر جا گرا تھا..اور کیسے اُس زخمی گھوڑے کی مرہم پٹی گورا لوگ نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی اور اُنہوں نے جانے سے پیشتر اس گھوڑے کی پوری قیمت بھی ادا کر دی تھی کہ اُس کے بچ جانے کی کوئی اُمید نہ تھی..اور کیسے وہ گھوڑا بچ گیا اور وہ ڈالر بھی بچ گئے..

ہم نے اس لیے بھی پیدل نیچے جانے میں بہتری جانی کہ ہماری جیب میں ایک گھوڑے کی قیمت ادا کرنے کے لیے معقول رقم موجود نہ تھی..

ویسے اُنہوں نے ہمیشہ گھوڑے کے گلیشیئر پر گر جانے کا قصہ بیان کیا، یہ کبھی نہیں بتایا کہ اُس پر جو سوار تھا اُس کا کیا ہوا..

اگر وہ بھی گر گیا تھا..یا مر گیا تھا تو اُس کی قیمت کس نے ادا کی..

یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا کہ ہم گھوڑوں سے اُتر کر پیدل اُترتے تھے کہ تمام تر احتیاط کے باوجود سنگریزوں پر پھسلتے تھے اور اپنے آپ کو بمشکل گلیشیئر پر لڑھکنے سے بچاتے تھے کہ ہماری قیمت کس نے ادا کرنی تھی..ہماری بیویوں نے تو نہیں..بمشکل گلیشیئر کا اختتام ہوا..

ہم وادی میں چلنے لگے..

یہ ایسی وادی نہ تھی کہ اسے نظرانداز کیا جاسکے..

درے سے اُترتا جو گلیشیئر تھا جس کے کناروں پر چلتے ہم وادی میں آئے تھے اُس کی برفوں سے جنم لینے والا نالہ نوری ناڑ شاندار تھا، ہمارے برابر میں بہتا تھا اور اس کے پار نہایت شاہانہ انداز والے برف بھرے پہاڑوں کا سلسلہ ہمارا ساتھ دیتا تھا..

میں جب کبھی سانس درست کرنے کی خاطر ٹھہرتا تو مڑ کر اُدھر نگاہ کرتا جہاں سے ہم اُترے تھے..

رتّی گلی درے کے برابر میں اُٹھتی ہوئی سرخ چٹان جو اس درے کی شناخت کا سبب بنی تھی.. رتّی.. یعنی سُرخ.. ٹھیٹھ پنجابی میں بھی سرخ کے لیے رتّا یا سوہا کا لفظ استعمال ہوتا ہے..

الف اللہ دِل رتّا میرا
مینوں ب دی خبر نہ کائی
(بُلھے شاہ)

اس رتّی گلی کی سرخ چٹان پر مدھم اور سرد دھوپ ابھی تک اُسے روشن کرتی تھی.. اور میرا دل رتّا کرتی تھی۔

دائیں ہاتھ پر تو نوری ناڑ نالہ اور برفانی پہاڑوں کے پُرشکوہ سلسلے تھے اور بائیں جانب ڈھلوانیں اُترتی تھیں جن میں آبادی کے آثار تھے..

کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں اور ڈھلوانوں پر سفید سفید بھیڑیں تھیں جو ہمیں ساکت لگتی تھیں۔

ہم ایک عرصہ کے بعد تنہائی میں نہیں آبادی میں چلتے تھے.. پتھریلی بستیوں کے نشیب میں جو گذرگاہ تھی وہاں چلتے جاتے تھے..

رات کرنے کے لیے میں بہت سارے خوش نظر مقامات پر ٹھہرا.. وہ مجھے تو خوشنما اور دیدہ زیب لگتے تھے لیکن بشیر ہمارے دُکھتے بدنوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے چلتا جاتا تھا کہ نہیں صاحب.. تھوڑا آگے جا کر کیمپ کریں گے، کل کا سفر کم ہو جائے گا ورنہ کل شام تک بوڑا وائی نہیں پہنچ پائیں گے..

بشیر بھی خود نہ چلتا تھا.. ہم پھر سے گھوڑوں پر سوار تھے اور وہ ٹٹو پر سوار تھا.. اور وہ ایک موٹا راہب تھا جو کسی مقدس سفر پر.. کسی قدیم راہب خانے کی زیارت کی خاطر اپنے ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا چلا جاتا تھا..

بالآخر خیمہ زن ہم ہوئے نالہ نوری ناڑ نالے کے عین کنارے.. جس کے دوسرے کنارے پر ایک وسیع گلیشیئر سرد سانس لیتا ایک سفید اژدھے کی مانند پڑا تھا.. ایک دل کو خوشی دینے والے ایسے مقام پر ہم خیمہ زن ہوئے..

لیکن ہمارے دلوں میں کچھ خوشی باقی نہ تھی..

اگر ذرہ بھر بھی ہوتی تو ہم اس مقام پر پہنچ کر اس کے گرد و پیش کی خوبصورتی سے بہک جاتے..

لیکن ہم حواس میں رہے کہ یہ واپسی کا سفر تھا..

جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا..

وصال ہو چکا تھا.. اس لیے بدن میں جو حدت سلگتی تھی وہ رتّی گلی جھیل اور اُس کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد ٹھنڈی ہو رہی تھی..

یہ ہماری دھوکا باز دیوانگی کی آخری شب تھی..

کل سویر ہمارے خیموں نے آخری بار سمٹ جانا تھا اور پھر شاید اگلے برس کھلنا تھا یا کسی کونے میں ہمیشہ کے لیے سمٹا ہی رہ جانا تھا..

کل جو آنے والی تھی، ہمارے حساب کتاب کے مطابق ناران کے موٹل میں آنے والی تھی.. پچھلے پہر تک ہمیں بوڑا وائی پہنچ جانا تھا اور وہاں سے ناران دور نہ تھا جہاں معمول کی زندگی ہماری منتظر تھی.. ایک پُرآسائش زندگی منتظر تھی.. گرم پانی کے شاور.. فوم کے گدے.. سائیڈ ٹیبل پر روشن لیمپ.. بستر پر دُھلی ہوئی سفید چادریں.. ٹائلٹ پیپر اور شیو کرنے کے لیے آئینے اور رات کا کھانا موٹل کے دیدہ زیب ڈائننگ ہال میں.. چھری کانٹوں کے مناسب استعمال سے اور چھینک آنے پر ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر معذرت کرتے ہوئے.. معمول کی معزز اور شریفانہ زندگی میں.. کل جو آنے والی تھی اُس میں!

اور آج.. رتّی گلی کی وادی میں نالہ نوری ناڑ کے کنارے ایک سرد سانس لیتے گلیشیئر

کے سانس سہتے ہوئے جو میرا خیمہ تھا اس نے کل سویرے سمٹ جانا تھا اور پھر میری سٹڈی کے ایک کونے میں ایک بے آسرا یتیم کی مانند لاچار دھول جمع کرتے پڑا رہنا تھا اگلے برس تک کے لیے..

اور اگلے برس کے آنے کی کوئی گارنٹی تو نہ تھی..

کسی بھی اشٹام پیپر پر یہ تو درج نہ تھا کہ اگلے برس تک یہ جو تارڑ ہے موجود رہے گا..اگر رہے گا تو اس میں سکت رہے گی..اور اگر سکت رہتی ہے تو حالات میں بھی سکت رہتی ہے یا نہیں..

میں اپنے خیمے کے باہر بیٹھا تھا..

اور جیسے ہر نماز کے لیے "مُنہ ول کعبے شریف" کی نیّت کی جاتی ہے ایسے میں بھی مُنہ ول رتّی گلی کیے بیٹھا تھا..

نالہ نوری ناڑ اور اُس کے دوسرے کناروں پر جھکے ہوئے گلیشیئر میں سے پھونکی جانے والی سرد سانسوں کو سہتا..ٹھٹھرتا..رتّی گلی چٹان پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا..

وہاں ابھی کچھ دھوپ باقی تھی..

ذرّہ بھر تھی..

لیکن تھی..

اُس ذرّہ بھر دھوپ نے..جو رتّی گلی کی سرخ چٹان پر ٹھہری ہوئی تھی اُس نے یکدم اپنا روشن دامن سمیٹ لیا..دامن سمیٹ کر رخصت ہوئی ہے تو اُسی پل نہ صرف شام اُتری بلکہ اُس شام کو جذب کرتی ہوئی ایک گھنی تاریکی کی گھنیری رات اُتری اور رتّی گلی سیاہی میں گم ہو گئی..

اوجھل ہو گئی..ہمیشہ کے لیے..کہ اس باقی ماندہ زندگی میں کوئی اشٹام پیپر نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا جس پر درج ہوتا کہ آج سے سینتالیس برس بعد تم پھر واپس آؤ گے..شاید کچھ پل ہوں..یا ایک دو برس ہوں لیکن سینتالیس برس نہیں ہوں گے تو یہ جو رتّی گلی جو تمہاری آنکھوں کے سامنے گم ہوئی ہے تو ہمیشہ کے لیے ہو گئی ہے..تم نے اسے کبھی دوبارہ نہیں دیکھا..

جو دیکھنا تھا وہ دیکھ چکے..

رتّی گلی تمام شُد..

گُمشُد!

"یہاں سے گھوڑا گرے گا.."

اگرچہ کہا تو یہی جاتا ہے کہ کل کس نے دیکھا ہے..

کل آئے نہ آئے کل کی کسے خبر ہے..

لیکن مجھے خبر ہے..

کیونکہ میں نے وہ کل دیکھا تھا..وہ کل آیا تھا..

محض اس لیے کہ رتّی گلی کی یاترا سے واپس آ کر ہی تو میں روئداد لکھ رہا ہوں..

تو کل یہ ہوا کہ..

آخری خیمہ گاہ سے آخری بار خیمے سمیٹنے کے بعد ہم آخری بار پہاڑوں میں چلے..بائیں ہاتھ پر نوری نالہ کے پار وہی شاندار برفیلے پہاڑ ساتھ دے رہے تھے جن کے بارے میں بشیر نے مجھے ورغلایا کہ صاحب کبھی ادھر دوبارہ آؤ ان پہاڑوں کے پار ایک زبردست وادی ہے وہاں چلیں گے تو میں نے بشیر زماں کو ڈانٹ دیا کہ کیوں مجھ بوڑھے کی عاقبت خراب کرتے ہو..مجھ میں اب سکت نہیں کہ میں مزید ورغلایا جاؤں..

دائیں جانب جو ڈھلوانیں اُٹھتی تھیں اُن پر گوجر گھر تواتر کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے..

بشیر بار بار یہ خوشخبری دوہرا رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہم فی الحال ایک متروک شدہ جیپ روڈ تک پہنچ جائیں گے اور پھر تو راستہ آسان ہو جائے گا، آگے میدان ہو جائے گا..

یہ جیپ روڈ مٹر کی پھلیوں کی عنایت تھی..

جن موسموں میں پاکستان بھر میں مٹر کا ایک دانہ نہیں ہوتا ان دنوں کاغان کی ان ڈھلوانوں پر مٹر کی پھلیاں ایسے حاملہ ہوتی ہیں کہ دانوں کے بوجھ سے بیلوں پر گرتی جاتی ہیں..یہ

بے موسم کے مٹر.. کراچی سے پشاور تک کی سبزی منڈیوں میں موتیوں کے بھاؤ فروخت ہوتے ہیں.. چنانچہ انہیں کاغان سے باہر کی دنیا تک پہنچانے کے لیے یہ جیپ روڈ تعمیر کی گئی جو فی الحال متروک تھی کہ مٹروں کا موسم نہیں آیا تھا.. بارشوں اور برفوں سے اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا.. پتھر سنگریزے بھرے پڑے تھے اور جگہ جگہ گری ہوئی خطرناک حالت میں تھی..

چنانچہ ہم اس مٹر روڈ تک پہنچے تو واضح نہ ہوا کہ یہ روڈ ہے یا مٹر کے بڑے بڑے دانے ہیں جو پتھروں کی صورت بکھرے ہوئے ہیں۔ بہرحال اس کا دم غنیمت تھا اور ہمارے گھوڑے اس پر رواں ہو گئے..

وادی کا اختتام نظر آ رہا تھا.. جہاں سے ہمیں دائیں جانب مڑنا تھا اور کچھ سفر کے بعد بوڑا وائی نظر آ جانا تھا..

پھر یکدم وہی کچھ ہوا جو درّہ دواریاں سے اُتر کر ہوا تھا کہ ابھی تو ایک نیم ہموار سطح پر چل رہے ہیں اور پھر ایک بار آنکھیں جھپکتے ہیں تو آسمان پر ہیں اور ایک تیز دھار پگڈنڈی پر معلق ہیں.. یہاں بھی یہی ہوا.. ابھی تو یہ روڈ ڈھلوانوں اور نالے کے درمیان میں ہموار سطح پر ہے اور ہمارے گھوڑے بے خوف چلتے جاتے ہیں اور دوسرے لمحے یہ ''روڈ'' ایک عمودی چٹان سے چمٹی ہوئی ہے اور بائیں جانب جو نالہ ساتھ ساتھ بہتا تھا، یکدم گہرائی میں چلا گیا ہے اور اُس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی اور ہم جیسے روڈ چٹان سے چمٹی ہوئی تھی، ہم گھوڑوں سے چمٹے سہمے سہمے چلتے گئے.. یہاں کوئی بھی گھوڑا اگر ذرہ بھر بے احتیاطی سے قدم رکھتا تو گویا ہماری موت کا مرتکب ہوتا..

ہم جو سکون سے تھے کہ گھر جا رہے ہیں... بہت بے مزہ ہوئے..

رتی گلی سے وصال کے بعد ذہنی طور پر کسی بھی معمولی سی دشواری یا خطرناکی کے لیے تیار نہ تھے..

کسی منزل تک پہنچنے کی وحشت ہو تو بلندیوں میں سفر کرتے ہوئے انسان جان کو داؤ پر لگا ہی دیتا ہے کہ پہنچنا تو ہے مگر گھر کو واپسی ہو رہی ہو تو انسان وہی جان سینت سینت کر رکھتا ہے اور ذرہ بھر خطرناکی کو بھی بے حد مائنڈ کرتا ہے اور اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے کہ جو مرنے کے مقامات تھے وہاں سے تو نکل آئے تو یہاں اجل کیسے آ سکتی ہے.. اجل نہیں جانتی کہ ہم تو بہ تائب ہو کر گھر جا رہے ہیں؟ اگرچہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ کوہ پیما کسی کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی کے راستے میں کم

ہلاک ہوتے ہیں اور چوٹی کو اپنے تئیں فتح کرنے کے بعد.. تصویریں کھنچوانے.. جھنڈے لہرانے اور اپنے بچوں کی فوٹو چومنے کے بعد جب نیچے اُترتے ہیں تو زیادہ ہلاک ہوتے ہیں.. چلیے یہاں تک تو سہم سہم کر سانس روک روک کر کبوتر کی مانند خطرے کی بلی دیکھ کر آنکھیں بند کرتے گذارا ہو گیا لیکن سامنے ایک مقام ایسا آیا کہ روڈ سراسر غائب تھی اور تین چار میٹر غائب تھی.. اور اس شگاف میں سنگریزے اور بھر بھری مٹی تھی اور یہ سنگریزے بھی اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتے تھے مٹر کے دانوں کی مانند ایک ایک کر کے گہرائی میں گرتے چلے جاتے تھے..

''رکو'' میں نے اُس مرد غافل کو پکارا جس کا نام سلیم تھا اور جو گھوڑے کی باگ تھامے ایک بجن بے پروا کی مانند چلا ہی جاتا تھا..

وہ خواب غفلت سے بیدار ہوا.. رُک گیا.. ''جی صاحب''

''یار ادھر سے کیسے گذریں گے؟''

''گذر جائیں گے صاحب..''

''کہیں گذر ہی نہ جائیں..''

''کیوں نہیں گذر جائیں صاحب..'' یہ کہہ کر وہ چل دیا.. اس سے پیشتر کہ میں دوہاء یدے کر اُسے روکتا وہ باگ تھامے چٹان کا سہارا لیتا اُس خلاء میں چل دیا اور اُس کے پیچھے پیچھے میرا.. بلکہ اُس کا.. گھوڑا بھی چل دیا.. اور اُس پر چونکہ میں سوار تھا تو میں کیسے نہ چل دیتا..

مجھے نہیں معلوم کہ ہم اُس خلاء میں سے کیسے گذر گئے.. گرے کیوں نہیں.. گرنا چاہیے تھا تو پھر کیوں نہیں گرے..

میں اس گھوڑے کی صلاحیتوں کا معترف ہو رہا تھا اور سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ جن تلوار سے تیز اور بال سے باریک مقامات پر سے یہ گذر جاتا ہے تو اسے پُل صراط عبور کرنے کے لیے ابھی سے بُک کروا لینا چاہیے.. ذرا آگے گئے تو بشیر رُک گیا ''یہاں سے نیچے گلیشیئر پر جائیں گے اُسے پار کر کے دوسری جانب جو راستہ دکھائی دیتا ہے وہاں جائیں گے..''

''کہاں جائیں گے..'' میں نے جھگڑالو عورتوں کی طرح ہاتھ لہرا لہرا کر اُسے طعنہ دیا کہ جہاں سے وہ کہہ رہا تھا کہ یہاں سے نیچے جائیں گے تو وہاں اتنی سیدھی تقریباً نوے درجے کی اترائی تھی کہ اُس پر جان تو جا سکتی تھی.. اس کے سوا اور کچھ نہیں جا سکتا تھا..

"صاحب ذرا مشکل ہے۔۔لیکن یہاں سے نیچے جائیں گے تو گلیشیئر کے پار جائیں گے۔ گلیشیئر میں سے ایک نالہ جونوری ناڑ ہے، نکل رہا ہے، اگر اسی روڈ پر آگے جائیں گے اور پھر نیچے جائیں گے تو اُسے پار کرنا ہوگا اور وہاں یہ بہت گہرا ہے اور بہت تیز ہے۔۔گھوڑے کمر تک ڈوب جائیں گے۔۔پانی اور زیادہ ہوا تو کیا کریں گے۔۔"

"یہ گھوڑے تیر نہیں سکتے؟"

"یہ تیرنے والے گھوڑے نہیں ہیں تارڑ صاحب۔۔"

"ہم تو تیرنے والے ہیں دریائے چناب کے کناروں کے باسی ہیں۔نہیں یہاں سے اُتر کر جان سے نہیں جائیں گے۔۔آگے جائیں گے۔" میں نے جیپ روڈ پر ہی چلتے جانے کا فیصلہ دے دیا۔۔

اور یہ فیصلہ مجھے بہت مہنگا پڑا۔۔

کہ ذرا آگے گئے۔۔چٹان سے چمٹی اس جیپ روڈ کے ذرا آگے گئے تو اس پورے گم شدہ جھیلوں اور رتی گلی ٹریک کے دوران سامنے آجانے والا سب سے ہولناک منظر سامنے آ گیا۔۔

جیپ روڈ پھر سے معدوم ہوگئی۔۔

آگے یہ سڑک ڈھے چکی تھی۔۔نیچے گر چکی تھی۔۔

آگے ایک اور خلاء تھا اور پانچ چھ میٹر کے اس خلاء کے آگے روڈ پھر سے نظر آتی تھی۔۔

صرف اوپر سے اُترتی چٹان کے گرتے ہوئے وجود پر تقریباً اسی درجے کے زاویے پر نہ مٹی تھی اور نہ سنگریزے۔۔بس چٹان تھی۔۔اور اسے پار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہاں ایک گھوڑا تو کیا ایک تتلی کے پاؤں دھرنے کی بھی گنجائش دکھائی نہ دیتی تھی۔۔

اگر ایک تتلی بھی اس گرے ہوئے راستے پر پاؤں رکھتی۔۔پر کیسے اور کہاں رکھتی کہ ہوا میں...کون ہے جو پاؤں رکھ کر گذر سکتا ہے۔۔

"نہیں" میں نے سلیم کو روکا۔۔اور وہ پہلے سے ہی رُک چکا تھا۔۔

"یہاں سے تو گھوڑا گرے گا۔۔"

وہ چپ رہا کہ پورے یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ نہیں گرے گا۔۔

"تو کیا کریں؟"

وہ بھی جھجک رہا تھا۔صرف اس لیے کہ اگر وہ پار ہو جاتا ہے اور باگ تھامے ہوئے ہے اور

گھوڑا گرتا ہے تو ظاہر ہے وہ بھی ساتھ ہی لڑھکتا ہے۔۔تو اسے اپنی اور گھوڑے کی پرواتھی اُس لمحے میں کسی حساب میں نہ آتا تھا۔۔

"سلیم مجھے اتار دو۔۔شاید میں پیدل پار ہو سکوں۔"

"آپ خود نہیں اُتر سکتے۔۔گھوڑے کے ایک طرف چٹان ہے اور دوسری طرف اتنی جگہ نہیں کہ میں آپ کو سہارا دے کر اُتار لوں۔۔"

اور واقعی میں ایسی شاندار پوزیشن میں تھا کہ بس میں ہی میں تھا۔۔دائیں جانب چٹان میری ٹانگوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ پر بس گہرائی تھی جو گرتی چلی جاتی تھی اور میں کسی قومی ہیرو کی مانند ایک بلند چبوترے پر معلق تھا۔۔

اسی کشش و پنج میں اور شدید خوف کے سناٹے میں کچھ لمحے گذرے...میرے اندر خطرے کی گھنٹی نہیں ایک گھڑیال بج رہا تھا جو مجھے خبردار کر رہا تھا کہ چٹان کی ڈھلوان پر گھوڑے کے قدم ترچھے پڑیں گے اور تم سنبھل نہ سکو گے۔۔خودکشی مت کرو۔۔شاید پچھلے تیس برسوں کے دوران میں جہاں جہاں سے بچ نکلا تھا اُس میں اچھے نصیب کے علاوہ خطرے کی یہ گھنٹی بھی تھی جو مجھے خبردار کر دیتی تھی اور میں فوری طور پر ڈرپوک ہو جاتا تھا۔۔

پھر اُن معلق لمحوں میں کوئی ایسا لمحہ آیا جب سلیم نے تنگ آ کر خود ہی ایک فیصلہ کیا اور باگ کھینچ کر کہنے لگا۔"چلتے ہیں صاحب۔۔اللہ مالک ہے۔۔" اور چلنے لگا۔۔

اُس خلاء میں داخل ہو گیا۔۔اور شاید کوہ نوردی کی زندگی میں پہلی بار میں نے آنکھیں بند کر لیں۔۔اور متعدد بار جو کر چکا تھا وہ کیا یعنی اپنے بچوں کے چہرے یاد کیے اور کلمہ پڑھنے لگا۔۔سلیم نے مجھے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ میں اُسے روک دیتا۔۔

مجھے اور کچھ یاد نہیں۔۔بس یہ یاد ہے کہ میں نہ گھوڑے پر تھا اور نہ زمین پر تھا۔۔میرا گھوڑا سکوت میں آ کر جانے کہاں پاؤں رکھتا تھا۔۔کہ اُس کے سُموں کی کوئی آواز نہ تھی۔۔اُس کے پیٹ کے ساتھ جکڑی ہوئی میری ٹانگوں نے واضح طور پر گھوڑے کے پٹھوں اور رگوں کو کھینچتے زور لگاتے محسوس کیا۔۔میں نے بھی آنکھیں اس زور سے بھینچی ہوئی تھیں جیسے وہ کُھلیں تو کسی اور جہان میں جا کھلیں گی۔۔مجھے ذرا سا بھی کچھ دکھائی دیا تو کوئی سیاہ پوش ہی دکھائی دے گا۔۔کہیں کسی مقام سے گذرتے ہوئے جان کا خطرہ ہو تو انسان چوکنا ہو جاتا ہے، چوکس ہو جاتا ہے کہ اگر کچھ ہوا تو اُس

کے ردعمل میں فوری طور پر میں نے کیا کرنا ہے..لیکن میں سراسر ایک مختلف حالت میں تھا..سناٹے میں آیا ہوا..وقت رُکا ہوا..کسی خیال کسی قیاس سے بالکل عاری..بس اگلے لمحے گرنے کا منتظر..اپنے آپ کو اُس لمحے کے حوالے کیے ہوئے..جو ابھی آیا کہ ابھی آیا..جیسے پھانسی کا پھندہ گلے کے گرد کسا جا چکا ہو اور پاؤں تلے سے کسی بھی لمحے تختہ کھسک جانا ہو..یہ دو چار لمحوں کا کھیل تھا لیکن اس دوران بہت زمانے بیت گئے..نہ بچوں کی شکلیں ذہن پر تصویر ہوئیں..نہ قلق ہوا کہ مر جاؤں گا اور نہ ہی اللہ کی یاد آئی کہ ذہن ایک کفن کی مانند کورا تھا.سکوت کے ان چند لمحوں کی ویرانی اور سناٹے میں جب میں آنکھیں بند کیے اُس شخص کی طرح جس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے اور وہ گولیوں کی باڑ کا منتظر رہتا ہے..جب میرے گھوڑے نے اُس خلاء کو جانے کیسے پار کر کے ہموار زمین پر قدم رکھا تو اُس قدم کی دھمک نے میری رُکی ہوئی دل کی دھڑکن کو رواں کر دیا اور ایک زمانے کے بعد پہلی دھک ہوئی..اور پھر سانس چلنے لگا..

میں نے آنکھیں کھول دیں..میں اُسی گھوڑے پر تھے اور موجود تھا..البتہ پسینے میں شرابور اور آنکھیں کھولتے ہی نمکین پانیوں نے اُنہیں پھر سے جھپکنے پر مجبور کر دیا.دھوپ تیز تھی اور روشنی تھی اور زندگی تھی..

جیسے میں نے کوہ نوردی کی حیات میں پہلی بار کسی مرگ مقام سے گذرتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں ایسے میں نے پہلی بار کسی بھی پہاڑی سفر کے بعد گھر پہنچ کر میمونہ سے کہا تھا کہ تم میری جان کا صدقہ ضرور کر دو کہ یہ جان جانے والی تھی..بہرحال میرے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا..لیکن جب میں پار ہو کر ابھی آنکھیں کھول کر اطمینان کر رہا ہوں اور یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو گیا ہے کہ میں محفوظ اور زندہ ہوں تو عقب سے خان سلیم کی ایک نہایت فریاد بھری ہوئی آواز آئی

''تارڑ صاحب یہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میں نے..میں نے کیا کیا ہے خان صاحب..'' پیچھے دیکھے بغیر میں نے کہا..

''مروانے لگے تھے مجھے اور پوچھتے ہو کہ کیا کیا..'' خان سلیم کی آواز میں..پہلی بار..مجھ سے مخاطب ہوتے غصہ تھا..''میں تو مزے مزے سے آپ کے پیچھے چلا آ رہا تھا..آپ رُکے تو میں رُک گیا، پھر آپ چلے تو میں نے بھی سوچے سمجھے بغیر اپنا گھوڑا آپ کے پیچھے لگا دیا...سر جی آپ اندھے تھے، دیکھا نہیں تھا کہاں جا رہے ہیں..یہ تو میں جانتا ہوں کہ کیسے میں وہاں سے گذرا ہوں یا میرا گھوڑا جانتا ہے بلکہ وہ بھی نہیں جانتا..پتہ نہیں کیسے گذرا ہوں۔''

''گذر آئے ہو ناں..''

''ابھی تو کچھ پتہ نہیں..''

''گذر آئے ہو خان صاحب..تو اب آگے چلتے ہیں..''

''نہیں..'' خان سلیم ابھی تک سراسیمگی کے غصے میں تھا..''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں..خبردار کیوں نہیں کیا..کوئی کسر نہیں چھوڑی آپ نے مجھے مروانے کی۔''

''یار میں خود خبردار ہوتا تو تمہیں خبردار کرتا..تم کیا سمجھتے ہو کہ جان بوجھ کر میں نے گھوڑے کو اس خلاء میں ڈالا تھا.تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اتنا احمق ہوں کہ خود بخود اپنی مرضی سے اس راستے پر گھوڑے کو ڈالا ہے..''

خان سلیم نے محسوس کیا کہ میں اتنا خطاوار نہیں اور میں بھی غصیلا ہونے لگا ہوں تو اُس نے نارمل آواز میں کہا ''اب کیا حکم ہے؟''

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا..رب کا شکر ادا کرو اور آگے چلو۔''

ویسے خان سلیم ایک عرصے تک مشترکہ دوستوں سے شکایت کرتا رہا کہ تارڑ صاحب جان بوجھ کر مجھے مروانے لگے تھے..

چٹانوں کی سنگت میں سفر کرتے ہمارے گھوڑے نیچے آنے لگے اور بالآخر نالہ نوری ناڑ کے پانیوں کے شور کی قربت میں پہنچ کر رُک گئے..

یعنی ایک اور دریا کا سامنا تھا..

ٹھاٹھیں مارتے..جھاگ اُڑاتے..پتھروں کو دھکیلتے برفانی پانیوں میں سے گذر کر پار جانا ممکن نہیں لگتا تھا..لیکن موت سے چہرہ بہ چہرہ روبرو ہونے والا ایک شخص..اور ابھی چند لمحے پیشتر ہونے والا شخص ہمیشہ نڈر اور بے پروا ہو جاتا ہے..ایسے شخص کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا..

ہم اور ہمارے گھوڑے نوری ناڑ کے چنگھاڑتے ہوئے پانیوں میں بلا جھجک داخل ہوئے..جو ہمیں دھکیلتے تھے..تہہ میں جو پتھر تھے اُن پر گھوڑوں کے سُم پھسلتے تھے اور پانی بلند ہوتے ہوئے میرے گھٹنوں تک آتے تھے اور ہم تقریباً ڈوبتے تھے اور تب یہ گھوڑے تیرتے تھے..اگرچہ بشیر نے کہا تھا کہ یہ تیرنے والے گھوڑے نہیں ہیں..

پار جا کر ہم دائیں جانب رُخ کر گئے کہ سامنے پہاڑ تھے اور نالہ بھی انہیں سامنے پا کر رُخ بدل رہا تھا..

آس پاس ہریال ہی ہریاول تھی.. مٹروں کے کھیت ہرے ہوتے تھے اور ہم اُن کے درمیان جو ایک پگڈنڈی تھی اُس پر سہے سہے چلتے جاتے تھے.. یہیں پر سہے سہے چلتے ہوئے ایک کھیت میں ایستادہ بانس پر چڑیوں کو ہراساں کرنے کے لیے ایک سفید شاپر بیگ ہوا میں پھڑ پھڑاتا تھا جسے دیکھ کر اُس کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر میرا گھوڑا یکدم بدک گیا.. ڈر گیا اور دائیں جانب کے کھیت میں مجھ سمیت اوندھا ہونے لگا.. بمشکل سیدھا ہوا اور پھر سے چلنے لگا..

اور پھر ہمیں زیارت نظر آنے لگی..

نالے کے چوڑے پاٹ کے کنارے.. ہریاول کی سلطنت میں رنگ برنگے پھریرے لہراتے تھے... کچھ قبریں تھیں اور شاخوں کے ساتھ بندھی رنگین دھجیاں تھیں.. ہریاول کے وسیع کینوس پر شوخ رنگوں کے دھبے تھے جو پھڑ پھڑاتے تھے..

میں اس زیارت کا مجرم تھا..

وہی زیارت جس کا چکمہ دے کر سینتالیس برس پیشتر خواجہ صاحب نے گوجر خانہ بدوشوں کو روحانی بلیک میل کر کے ایک دُنبہ روسٹ کروالیا تھا..

تو اس زیارت کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے جو بھی بابا جی وہاں دفن تھے، اُن سے اپنے اس قدیمی گناہ کی معافی مانگی..

کسی عقیدت مند نے اپنی مانگ پوری ہونے پر.. نالے کے پار جا کر ایک ٹنڈ منڈ سوکھے ہوئے درخت کی ایک ٹہنی پر سُرخ پھریرا لہرادیا تھا.. اور یہ منظر کمال کے سبز اور سرخ رنگ لیے ہوئے تھے..

یہاں سے ہم آگے گئے... بہت آگے گئے..

جہاں تک ہماری نظر جاتی تھی وہاں تک چلتے گئے تو یکدم ایک موڑ کے آگے دور تک منظر نکھر گیا اور اُس کے اختتام پر بوڑاوائی کا پُل نظر آنے لگا..

پھر وہ ہولے ہولے قریب آنے لگا.. ہم اُس کے قریب آنے لگے..

اور پھر ہم اُس پر چلتے تھے اور اُس کے چوبی تختوں کے شگافوں سے جو پانی بہتے نظر آتے تھے وہ بھی ہماری طرح رتّی گلی سے آرہے تھے.. نہ ان پانیوں نے کبھی واپس رتّی گلی جانا تھا اور نہ کبھی ہم نے.. یہ آخری ملاقات تھی...